خدائی سرگوشیاں

مجیب الحق حقّی

سائنس کا دائرۂ کار ہمارے حواس اور دماغ تک محدود ہے جو ظاہری اور مادّی عناصر سے منسلک ہیں اور سائنس کو اس سے غرض نہیں کہ کائنات کو چلانے والے بنیادی فطری قوانین کا منبع کیا ہے۔ یہی وہ غیر عقلی بنیاد ہے جس پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں خدائی سرگوشیاں انسان کی چشمِ حیراں کو رہنمائی فراہم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

وہ خدائی سرگوشیاں کیا ہیں؟ آئیں جانتے ہیں اس کتاب اندر جھانک کر

خدائی سرگوشیاں



Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

مجیب الحق حقی

ISBN:
978-969-531-019-9

مصنف۔
مجیب الحق حقّی

اسٹاکسٹ:
فضلی سنز، اردو بازار، کراچی 32212991 021
ویلکم بک پورٹ۔ اردو بازار، کراچی 32639581 021
سعید بک بینک اسلام آباد 2651657 051
مسٹر بکس، اسلام آباد 2870919 051
کتاب سرائے، لاہور 37239884 042
ادریس بک بینک، راولپنڈی 5568898 051
یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور 2212534 091

ناشر۔
حقّی برادرز
۲۲، اردو بازار۔ ایم اے جناح روڈ کراچی
رابطہ: 0321-8227300 ,021-32632249
واٹس ایپ: 0300-2368329 0300-2291531

اِنتساب

میرے جدِّ اعلیٰ

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ

اور

مرحوم پھوپھا (ابا)

سیّد انصار الحق حقی

وہ رہنما جن کی صحبت سرمایۂ افتخار ہے

حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ

حضرت مولانا ابرارالحق ھقیؒ

حضرت حکیم محمّد اخترؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

مجیب الحق حقّی صاحب کے ساتھ بذریعہ سوشل میڈیا تعارف ہوا۔آپ کے دلآویز سائنسی نقطہ ہائے نظر نے مجھے تادمِ حیات اپنا گرویدہ بنالیا۔حقّی صاحب کے اعتدال برمبنی سائنسی نگارشات تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔سائنسی نظریہ حیات کی تلاش میں "خدائی سرگوشیاں" ان کی ایک گراں قدر کوشش ہے۔سائنسی نظریہ حیات سے مراد ایک ایسے فلسفۂ حیات کی کھوج لگانا جو بہ یک وقت انسانی حیات کے تقاضوں کو بھی پورا کرے اور انسان کو طبیعیاتی و مابعد الطبیعیاتی طور پر بھی مطمئن کر سکے۔اس سلسلے میں حقّی صاحب یکتائے روزگار شاید نہیں ہیں بلکہ اس کام کا بیڑہ کئی ایک لوگوں نے اٹھایا ہے۔اس تناظر میں کوئی تو اپنے فلسفیانہ و مابعد الطبیعیاتی سوالات کا شکار ہوا تو مذہب کو نامکمل اور ناقابل عمل قرار دے کر مذہب بیزاری کا علم بلند کیا اور سائنس اور مذہب کے درمیان ایک حدِ فاصل کھینچ لایا۔کوئی اپنی تحقیق و جستجو میں اتنا غلو کا شکار ہوا کہ مذہب کو سائنس پر فوقیت دے کر سائنس کو مذہب کا دشمن بنا ڈالا۔اس سلسلے میں آئن سٹائن نے بھی جستجو کی کہ کسی طور مذہب اور سائنس کا آپس میں کوئی رشتہ ناطہ جوڑ لے لیکن وہ صرف یہ کہنے پر آ رکے کہ سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے اور مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے۔موصوف یہ ثابت نہ کر سکے کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنا کیسے ناممکن ہے۔آئن سٹائن کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسی صدی کے آسے پاسے پیدا ہوئے تھے کہ سائنس اور مذہب کے درمیان لگی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ ایک ایسے دین سے باخبر تھے جو مکمل طور پر سائنس اور مظاہر قدرت کو سہولت کاری پہنچاتا ہو۔"خدائی سرگوشیاں" تو شاید آئن سٹائن یا موریس بوکائلے کے پائے کی تحقیق نہ ہو لیکن ان تحقیقات سے کسی طور کم بھی نہیں ہے۔موریس بوکائلے بھی اپنی تحقیق میں کسی حد تک عدم توازن کے شکار ہو گئے ہیں۔انہوں نے قرآن کا حق تو ادا کیا کہ وہ کیسے سائنسی نظریہ حیات کی آبیاری کرتا ہے لیکن جب حدیث اور سنت کی باری آئی تو صاحب تحقیق کے پاس دلائل کی تشنگی اسلام کے ایک بہت ہی اہم ماخذ قانون کو سائنسی نظریہ حیات کے تقاضوں پر پورا نہ اتر وا سکی۔زیر نظر کتاب شاید اسلامی قانون کے اس اہم ماخذ کو زیر بحث نہ لا سکی لیکن موریس بوکائلے کی طرح اس اہم ترین اصول قانون کی قانونی وتشریعی اہمیت میں کمی کا سبب بھی نہ بن سکی۔ممکن ہے صاحب تحقیق اپنی دوسری ایڈیشن میں اس طرف توجہ دیں گے۔اس کتاب کی مزید خوبیاں کچھ یوں ہیں کہ اس کے دلائل و براہین انتہائی سلیس اور عام فہم ہیں۔ایک عام لکھا پڑھا شخص بھی ان کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔دلائل میں پیشہ ورانہ لفاظی آپ کو نظر نہیں آئے

گی۔ مصنف نے سائنسی نظریہ حیات کو قرآنی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس اور قرآن میں کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ قرآن مکمل طور پر مظاہر فطرت کو سہل و آسان بناتا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ سائنس جتنی ترقی کریگی اتنا ہی اس پر قرآن کی حقانیت کھلتی رہی گی۔ مجھے امید ہے کہ مصنف اس کتاب میں اس بات کا بھی اضافہ کریں گے کہ نہ صرف قرآن بلکہ اسلام کے تمام ماٰخذ قانون مثلاً سنت، اجماع، مصالح مرسلہ اور مسلمانوں کا اجتماعی عمل بھی سائنسی نقطہ نظر سے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو کہ سائنسی نظریہ حیات کے مختلف مظاہر ہیں۔ مصنف نے ایک بہت ہی اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پانی کے علاوہ بھی حیات کے مبداء ہو سکتے ہیں جیسے آگ اور نور۔ اس بات کی تحقیق میں شاید سائنس کو مزید ارتقا کی ضرورت درپیش ہوتا کہ ھٰشمی صاحب کی اس بات کو سچ ثابت کیا جا سکے۔

شیخ سعدیؒ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

برگ درختانِ سبز در نظر ہشیار
ہر ورقِ دفتر یست معرفت کردیگار

"اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہمارے ساتھ سرگوشیاں
کر رہا ہے کہ اس کا خالق ضرور کوئی حکیم و دانا ہے۔"

زیرِ نظر کتاب پڑھنے کے بعد قاری کی نظر میں وسعت اور معرفتِ کردیگار پیدا کرنے کی امید واثق ہے۔

وما توفیقی الا باللہ
سمیع الدین
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات

(پاک ترک اسکول اسلام آباد کے قابل استاد ہمایوں مجاہد تارڑ صاحب کا
کتاب 'خدائی سرگوشیاں' پر ایک تبصرہ)

کبھی خیال آتا ہے، کتابِ مقدس میں ایسی اور اس سے ملتی جلتی آیات کیوں نہ اتریں؟
"ہم تمھیں 20 سویں صدی عیسوی میں ڈی این اے کی دریافت کی خبر دیتے ہیں۔"
یا یوں کہ۔۔۔ "طاقتور ٹیلی سکوپس کے ذریعے خلا کی وسعتیں ماپنے، اس میں تیرتے سیارگان کا لگا بندھا، منظم و مربوط نظام مشاہدہ کرنے کی اہلیت، آبدوزوں میں بیٹھ بیٹھ سمندر کے باطن میں اتر کر باریک ترین آبی حیات کے حیرت زا مشاہدے تمھیں ہمارے ہونے کی خبر دیں گے۔ تب تم میں سے صاحبانِ شعور پکار اٹھیں گے کہ بے شک اللہ وحدہ لاشریک ہی زندگی، اس کے تمام تر لوازمات و موجودات کا خالق ہے۔ وہی لائقِ پرستش ہے۔ جب یہ سب اپنی آنکھوں دیکھ لو تو ہم پر ایمان لانے میں تاخیر نہ کرنا۔۔۔"
ماضی، حال اور مستقبل کو ایک اکائی کے بطور دیکھنے والا خالق، سورج ایسے عظیم الجثہ وجود کو چراغ کہنے والا مالک الملک، علیم بذاتِ الصدور ایسا حیرت انگیز دعویٰ رکھنے والا علام الغیوب کیا کچھ ایکسپوز نہ کر ڈالتا جسے سن کر، دیکھ اور پرکھ چکنے کے بعد اب دنیا میں ہر شخص کلمہ گو ہوتا؟ صاحبانِ ایمان ایسی شہادتیں اٹھائے بات بات پر پریس کانفرنسیں منعقد کیا کرتے: "لو جی، سٹیو جابز کے ہاتھوں آئی فون کی ایجاد پر غلغلہ مچانے والے جان لیں کہ قرآن میں یہ بات چودہ سو برس قبل سورہ نجم میں لکھ دی گئی تھی۔ بس اب سیدھی طرح ایمان لاؤ۔ تمہارے پاس کوئی راہِ فرار نہیں!"

نہیں۔ اس نے ایسا نہ کیا۔ کہ تب ایمان جبر ہو جاتا۔ عقل ایسا شاندار search engine سافٹ ویئر عطا کرنے والے نے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ چاہو تو مجھے مانو، چاہو تو میرا انکار کرو۔ ہاں، آس پاس میں بکھری کتابِ کائنات میں میری نشانیاں ہیں، انفس و آفاق میں ہم تمھیں اپنے موجود ہونے کے ان گنت ثبوت دکھائیں گے، انسانی شکل میں اپنے خاص نمائندے یعنی پیغمبر بھی بھیجیں گے۔۔۔ ان تمام clues کی مدد سے اگر تم پہیلی بوجھ لو، تو تمھیں کروڑہا سال کی نہ ختم ہونے والی حیات بمعہ رنگا رنگ لوازمات، راحت و آرام بطور انعام عطا کریں گے۔ خالقِ عقل نے عاقل انسان کو زندگی کی پہیلی بوجھنے کو اشارے دیے۔ یہ اشارے علم، فہم، سوال در سوال کی یلغار کر سکنے کی قوتِ عاقلہ ایسے آلات کو عمدگی سے برتنے کی صورت سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور بالآخر یہ اشارات بات سمجھ میں آجانے کی صورت سرِ تسلیم خم کر دینے کے متقاضی ہیں۔ انہی اشاروں کو سر مجیب الحق حقی نے "خدائی سرگوشیاں" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور ایسی متعدد، زیادہ تر معنی خیز سرگوشیاں ایک مقام پر اکٹھی کر دی ہیں۔

سر مجیب کی دنیائے مذہبیت ادبیت و شائستگی لیے بے اختیار دل میں گھر کر جاتی ہے۔ مشفق والد ایسے شفیق لب و لہجے

میں رچی عمیق دانشمندی فراستِ مومن کا مضبوط تاثر لیے ہے۔ نہ کہ مولویانہ بے صبری اور زور آوری۔
الرٹ کردینے کی حامل یہ سرگوشیاں سن کر بندہ سوچتا ہے کہ چوٹ کھا کر بھی، ارادوں کے ٹوٹنے سے بھی، پورے کا پورا قافلہ لُٹا کر بھی خدا پر ایمان کی چنگاری نہ بھڑکے، بندہ باغی مان کر نہ دے کہ "جو اختیارِ بشر پہ پہرے بٹھا رہا ہے وہی خدا ہے" تو کوئی ایسی ڈیوائس ایجاد نہیں ہوئی جو حضرتِ انسان پر ایقان و ایمان کا شرارہ یا سپارک پھینک سکے۔ بس یہ گلزارِ ہست و بود ہی، افق در افق پھیلی یہ بے حد کتابِ زندگی ہی اسکا پیغام ہے، اس کے ہونے کے منہ زور اشارے لیئے۔ خارج میں بھی اور خود ہمارے اپنے دروں میں بھی لبالب بھری پڑی ہیں اس کی نشانیاں جو کسی خالق و مصوّر کے موجود ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔۔ دماغ پاشی کرنے کو عقل کا یہ سافٹ ویئر عنایت فرما کر جو خود نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔۔۔ یہ اشتیاق و تجسس لیے، کہ بھلا مرا اشاہکار مجھے پانے کی جستجو فرمائے گا، یا اسی ڈیوائس کی ساری طاقت بس مجھے ناموجود ثابت کرنے میں کھپا ڈالے گا۔
سوچتا ہوں، ایمان کتنی بڑی، کیسی حیرت انگیز دولت ہے۔ ملی تو ایک عامی کو مل گئی، نہ ملی تو شرقاً غرباً اپنے فلسفے پھیلا دینے والوں، اپنی دانش گاہیں رینکنگ کے آسمان پر پہنچا دینے والوں کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ رومی نے کیا خوب کہا تھا: "کائنات میں کچھ الفاظ بے آواز بھی ہیں۔ سنو!"
واقعی کوئی بات احاطۂ سخن سے باہر، اس سے ماورا ہوا کرتی ہے۔ حضرتِ اقبال کی زبانی سنیے:

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات　　ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

سر مجیب الحق حقی کی کتاب "خدائی سرگوشیاں" کے مطالعہ کا آغاز کرتے سمے میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ جس شخص نے اس جاں گسل موضوع پر پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کے لیکچرز اور تحاریر سے استفادہ نہیں کر رکھا، نیز ابویحیٰ کی دہریت کے فسوں کو پاش پاش کرتی مدلّل بحث و گفتگو کا ذائقہ نہیں چکھا، ڈاکٹر مرتضیٰ ملک مرحوم کی شاہکار کتاب "وجودِ باری تعالیٰ اور توحید" کو حرزِ جاں نہیں بنایا، اس کی تحریر اس دقت طلب موضوع کی پرتیں بھلا کیونکر کھول سکے گی؟ یوں، زیادہ وزن دار ہونے سے قاصر ہو گی۔ تاہم، یہ نکتہ مرے نارسا ذہن سے قطعی محو ہو گیا تھا کہ جس خدا نے اِن مذکورہ شخصیات کو علم و دلیل اور پیرایۂ اظہار کی دولت سے کمال فراخی سے نوازا، وہی خدا کسی تیسرے، چوتھے اور پانچویں شخص کو بھی ایسی توفیق خیرات کر سکتا، کسی نئے انداز میں اپنی ہستی بارے لب کشائی کا یارا عطا کر سکتا ہے۔ وہ مالک الملک کسی بھی مخلص شخص کو نئی ادا، جداگانہ طرزِ اظہار ارزاں کر دینے پر پوری طرح قادر ہے۔ یقین جانیں، سر مجیب الحق حقی کے الفاظ، آپ کے استدلال اور پیرایۂ اظہار کی ایک اپنی سی لذت ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب الگ سے ایک پوری تجلی ہے۔ یہ تجلی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ان کی کی طرف شفقت کا خاص مظہر ہے۔
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے کے مصداق یہ ایک بڑا، بہت خاص اور قابلِ رشک نصیب ہے۔ ایسے نصیب پر مبارکباد!

ہمایوں مجاہد تارڑ
لیکچرر ان انگلش، کیمبرج سیکشن، پاک ترک اسکول، اسلام آباد

دیباچہ

Understanding The Divine Whispers کے اردو ترجمے کی منشاء کے تحت شروع ہونے والا عمل مختلف جہتیں اختیار کرتا ایک ایسی کتاب کی شکل اختیار کر گیا کہ اسے ترجمے کے بجائے معنوی تاثر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کچھ ترامیم اور اضافے کے ساتھ اس کتاب کی تکمیل میرے لیئے نہایت خوشی کی بات ہے۔ اس کتاب کا موضوع صرف توحید ہے۔ بیس مئی ۲۰۱۰ کو مغرب کے دریدہ دہن اور تنگ نظر افراد نے آزادیٔ اظہارِ رائے کی بنیاد پر ڈرا محمد ڈے منایا تھا۔ اس کے ردّ عمل میں مجھے غیر مسلموں سے بحث کے دوران اپنے عقیدے کی تشریح سائنسی بنیادوں پر کرنی پڑی۔ میں نے اس سے قبل کبھی کچھ نہیں لکھا تھا نہ ہی کوئی فلسفہ پڑھا۔ لیکن اس سمت اٹھنے والا قدم پھر بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ Understanding the Divone Whispers اور پھر "خدائی سرگوشیاں" کی بازگشت بنا۔ یہ اللہ کریم کی مجھ گنہگار پر عنایت ہے، شاید کسی بزرگ کی دعا کام آ گئی۔ میں نے ہمیشہ اپنے فیض انگیز بزرگوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے تذکرے اور سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین سُنی، انہوں نے فرقہ پرستی کی نہ کبھی تلقین کی اور نا ہی کوئی منفی تاثر دیا۔ ہمارا خاندان معتدل مزاج بریلوی و دیوبندی افراد پر مشتمل ہے اور آپس کے میل جول اور مذہبی تقریبات میں شرکت میں کسی تناؤ کا عنصر کبھی نظر بھی نہیں آیا۔ ہمارے گھر میں محفل میلاد اور غلافِ کعبہ و موئے مبارک کی زیارت آج بھی یاد ہے۔ لہٰذا یہ احسان فراموشی ہوگی کہ میں ان محترم شخصیات کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے میرے خیالات پر مثبت اثرات ڈالے۔ میرے مرحوم پھوپھا محترم انصار الحق حقّی، جنہوں نے میری والدہ کے انتقال کے بعد چھ ماہ کی عمر سے پھوپھی کے ہمراہ میری پرورش کی، جنہیں میں نے ہمیشہ ابا کہا ان سے ملنساری اور درگزر سیکھا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے محترم ڈاکٹر عبدالحیؒ کے پاس لیجاتے تھے جو پیار سے میرے کان اینٹھتے تھے کہ میری مشین درست کر دیں، ڈاکٹر صاحب سے آخر تک یہ قلبی تعلق رہا۔ میرے مرحوم چچا امتیاز الحق حقّی فارغ التحصیل علیگڑھ یونیورسٹی نوجوانی کے رہنما اور ماسٹر سمیع اللہ صاحب مرحوم جو ہمیشہ مشفق رہے۔ پھر میرے انتہائی محترم اور بزرگ چچا میرے پیر مولانا شاہ ابرار الحقؒ خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نظرِ کرم اور انکے خلیفہ محترم جناب حکیم محمد اختر صاحبؒ کی بے پایاں شفقت بے اثر تو نہ رہیں لیکن میرے

نفس کی خودسری ہی غلطیاں سرزد کراتی رہتی ہے۔اس کتاب پر تنقیدی نظر میرے پی آئی اے کے ساتھی جناب شفیق احمد صاحب نے کی جو عرصہ ۴۰ سال سے تبلیغ سے وابستہ ہیں اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں انکا بہت شکریہ۔ میرے بھانجے سلمان عثمانی نے بھی مدد کی اور قیمتی مشورے دیئے، انکا بھی شکریہ۔ رفاہ یونیورسٹی کے جناب سمیع الدین صاحب کی گرانقدر ہمت افزائی قابل ذکر ہے۔کتاب کا پیش لفظ اُن کا ہی تحریر کردہ ہے۔سوشل میڈیا پر کتاب کے اقتباسات اور اس سے متعلق مضامین پر پاک ترک اسکول کے جناب ہمایوں مجاہد تارڑ صاحب کے دل پذیر تبصرے اور کتاب کے مسودے کے جائزے کے بعد سوشل میڈیا پر تبصرہ ہمت افزائی کا باعث بنے۔ ان تمام احباب کا بھی ممنون اور مشکور ہوں جن کے نام یہاں نہیں لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح میری ہمت افزائی کی۔تحریر کے دوران یکسوئی کی فراہمی پر اپنی اہلیہ کا ممنون ہوں۔

قرآن پاک کی آیات کے آسان لفظی ترجمے مختلف مستند قرآنی تراجم سے مناسب تحقیق کے بعد لیئے گئے ہیں۔قارئین سے التماس ہے کہ اس کتاب میں مزید بہتری کے لیئے ضروری مشورے میرے ای میل پر ارسال فرمائیں۔شکریہ، والسلام

مجیب الحق حقی

۴،فروری ۲۰۱۸

mhaqqie@hotmail.com

تعارف

موجودہ سائنسی دور میں جدید علوم کے پھیلاؤ کی وجہ سے نوجوانوں میں عقائد کے حوالے سے غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کا فہم نامکمل ہونے کی وجہ سے سیکولرازم اور آزاد خیالی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ موجودہ دور کے نوجوان جو کہ جدید نظریاتِ حیات سے متاثر نظر آتے ہیں وہ صرف آزاد خیالی کی مصنوعی روشنی کی چکا چوند سے متاثر ہیں جبکہ درحقیقت وہ ان جدید غیر عقلی و غیر منطقی نظریات کا دفاع کرنے میں بہت کمزور ہیں اور نظریہ حیات کے حوالے سے سائنسی بنیادوں پر اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب نہیں دے سکتے۔ اُدھر جدیدیت کی اندھی تقلید نے مغرب میں اخلاقی بنیادیں بلادی ہیں، مادہ پرستی کا عفریت خاندانی نظام اور خونی رشتوں کو تہہ وبالا کیئے دے رہا ہے، بزرگ گھروں سے نکال کر اولڈ ہوم پہنچا دیئے گئے، ہم جنسوں کی شادیاں قانونی ہو چکی ہیں اور آزادی کے نام پہ ایسے ایسے کھیل تماشے ہو رہے ہیں کہ عقل انگشتِ بدنداں ہے۔ وسائل پر غلبے کے لیئے انسانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ یہ سب افراتفری دراصل جدید لامذہب نظریات کے فروغ کا شاخسانہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے نظریات اور اُنکے ماخذ کا علم حاصل کر کے اِن کی خامیوں کو اجاگر کیا جائے اور موجودہ دور کے سائنسی نظریات کی خامیوں کو بھی جو الحاد کے معاون بنے ہوئے ہیں واضح کیا جائے۔ مزید یہ کہ مذہب کی علمی و سائنسی بنیادوں پر تشریح عام فہم دلائل سے اس طرح کی جائے کہ کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک حقیقی مذہبی نظریئے کو ہی زیادہ سائنسی ثابت کیا جائے تاکہ نوجوانوں کی حقیقت تک رسائی ہو اور ان کو معلوم ہو جائے کہ درحقیقت ادھورے جدید نظریات کے مقابلے میں اسلام مجموعی طور پر زیادہ عقلی اور منطقی ہے۔ اسی لیئے یہ ضروری جانا گیا کہ جدیدِ علوم کا سہارا لیتے ہوئے زندگی و کائنات کے حقائق کو جاننے کے لیے عقلی اور علمی بنیاد پر ایک کاوش کی جائے تاکہ "حقیقی سچائی" تک ایماندارانہ مطالعہ سے پہنچا جا سکے۔ ہماری تحقیق کی بنیاد صرف یہ ہے کہ کائنات اور اس میں موجود مظاہر کی موجودگی کی تشریح زیادہ عقلی اور منطقی طور پر کون کرتا ہے، مذہب یا جدید علوم جنہیں عموماً سائنس کہا جاتا ہے۔ ہماری جستجو کا مرکزِ ثقل یہی نکتہ ہوگا کہ ان دونوں میں کس کے دلائل عقل اور منطق کے حساب سے زیادہ حقیقی ہیں۔ یہاں جدید سائنسی نظریات کی خامیوں کو دلائل سے عیاں کرنے کی کاوش کی گئی ہے تاکہ ملحدانہ نظریات کے مضر

اثرات کو منطقی قوّت سے رد کیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ کوئی بھی مادیّت اور الحاد پر مبنی جدید نظریہ انسانیت کی رہنمائی نہیں کرسکتا کیونکہ نظریہ خواہ کتنا ہی جدید ہو اس کو مکمل طور پر ثابت شدہ حقائق پر مبنی ہونا چاہئے۔ کیونکہ نوجوانوں میں تشکیک کے اثرات تیزی سے اثر کرتے ہیں تو اس کے تدارک کے لیئے کچھ حساس موضوعات جیسے خدا کی تخلیق، وجود خدا، تقدیر، قدرتِ خدا، علوم کا منبع اور وجودیت کی تشریح سائنسی پیشرفت کی روشنی میں کرنے کی سعی کی گئی ہے تا کہ قارئین کے سامنے توحید اور اسلام کے حوالے سے نہ صرف واضع تصویر آئے بلکہ الحاد کو رد کرنے والے دلائل سے بھی آشنائی ہو۔ یہاں صرف توحید کی حقانیت اجاگر کرنے کے لیئے علمی اور عقلی بنیادوں پر کسی منطقی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ صرف "حقیقی سچائی" کو جاننے اور اجاگر کرنے کی ایک ادنٰی سی کوشش ہے۔

فہرست

باب ۱

انسان اور بنیادی سوالات

کائنات اور اس میں انسان کے حقیقی مقام کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی اور کائنات کے عیاں اور پنہاں حقائق کو شفاف طور پہ جانا جائے۔ انسان طبعاً کائنات کے اسرار کی کھوج کا متلاشی ہے اور اُبھرتے سوالات کا شافی جواب چاہتا ہے مگر کچھ بنیادی سوالات اسے ہمیشہ بے چین کیئے رہتے ہیں۔

۱) میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں؟

۲) میرا مقصدِ حیات کیا ہے؟

۳) کائنات کیسے بنی؟

۴) زندگی کیا ہے؟

۴) خُدا کیا ہے؟

یہ ہر سوچتے ذہن کو بے چین کرنے والے سوالات ہیں جن کے جوابات ہی کسی نظریۂ حیات کی تدوین کرتے ہیں۔ کیا یہ سوالات کبھی آپ کے ذہن میں اُٹھے اور کیا آپ نے ان پر کبھی غور کیا؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً آپ ایک متجسس ذہن لیئے ہوئے ہیں جو ہر انسان کا شرف ہے اور اگر ایسا نہیں سوچا تو اپنے اندر سوئے ہوئے تجسس کو بیدار کریں کیونکہ حقیقت آشنائی زندگی کو آبدار بناتی ہے۔

بے پناہ سائنسی ترقی بھی انسانوں کو ان سوالوں کے غلطیوں سے پاک سو فیصد تسلی بخش علمی و منطقی جواب فراہم کرنے سے فی الوقت قاصر ہے، وجہ اس کی نئی معلومات کا اُمنڈتا سیلاب اور بدلتے نظریات ہیں۔

اگر ہم اطراف پر نظر ڈالیں تو چاروں طرف انسان کا بنایا ماحول اور انسانی تخلیقات بکھری ملتی ہیں لیکن اسی ماحول میں اور اس سے باہر نکل کر لاتعداد ایسے مظاہر بھی ہوتے ہیں جو انسان نے نہیں

بنائے۔ سادہ سی منطق تو یہی کہتی ہے جو کچھ موجود ہے اور انسان نے نہیں بنایا تو وہ بھی کسی نے بنایا ہوگا اور اگر نہیں تو وہ کسی نہ کسی طرح بنا ہوگا۔ اب جدید اور قدیم نظریات میں اصل اختلاف یہی ہے کہ قدامت پرست انسان اپنے عقیدے کی بنیاد پر کہتا ہے کہ سب خدا نے بنایا جبکہ آج کا عاقل و عالم انسان اسکی وضاحت خدا کے بغیر کرنے پر مُصر ہے یعنی جدیدیت خدا کو خالق نہیں مانتی جبکہ مذہب ہمیشہ سے متعیّن جوابات کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن سوالات یہ ہیں:

کیا خدا کے بغیر کائنات کے مظاہر کی تشریح کی جا سکتی ہے؟

کیا انسان مکمل کائناتی علم رکھتا ہے؟

کیا انسان کے علاوہ کوئی اور بھی حاملِ علم ہے؟

پیچیدہ سائنسی علوم کہاں سے ظاہر ہوتے ہیں؟

کیا کائنات کی سرحدوں کے باہر کا سُراغ ہم کو مل سکتا ہے؟

کیا ہم اس کائنات کے کمرے یا کیپسول Capsule سے باہر جا سکتے ہیں؟

آگے ایسے ہی بہت سے سوالات کے جوابات تلاش کیئے جائیں گے۔

تاریخی حقائق و نظریات

مختصراً جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرے میں مذہبی نظریات مختلف شکلوں میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں جیسے کہ خدا پرستی، آتش پرستی اور بت پرستی وغیرہ۔ گویا مذہب ایک اثر انگیز قوّت کے طور پر موجود رہا ہے اور مختلف معاشروں میں رائج مختلف مذہبی نظریات ہی ان کے قوانین و رسم و رواج کے ماخذ رہے۔ تحریکِ احیائے علوم اس سلسلے میں ایک اہم موڑ ہے جو یورپ میں شروع ہوئی جہاں پر معاشرے میں چرچ کا غلبہ تھا۔ جدید سائنسی نظریات جو طبعی طور پر ثابت شدہ مگر کچھ مذہبی نظریات سے متصادم تھے انکی وجہ سے یورپ میں ایک نظریاتی محاذ آرائی نے جنم لیا جس میں ایک طرف مذہبی اور دوسری طرف جدید نظریات کے حامی تھے۔ ثابت شدہ طبعی نظریات سے ٹکراؤ مذہبی عناصر کیلیئے ممکن نہ تھا لیکن مذہبی نظریات صدیوں سے انسانی ذہن میں سرائیت کیئے ہوئے تھے مگر گزرتے وقت کے ساتھ اُنکی گرفت کمزور پڑتی گئی۔ معاشرے میں اس تناؤ کا نتیجہ رفتہ رفتہ معتدل راہ کی شکل میں نکلنا شروع ہوا جس میں مذہب اور مذہبی نظریات کے دائرۂ عمل کو محدود کیا جانے لگا۔ اس سے نئے سائنسی و معاشرتی نظریات جو لادینیت کے پرچار پر

مبنی تھے معاشرے میں غالب ہوئے نتیجتاً معاشرے میں مذہب یا عیسائیت کی پیروی اور آسمانی کتاب انجیل کی برتری رفتہ رفتہ محدود ہوتی گئی اور انسانی فِکر پرمبنی عملی نظریات نے فروغ پانا شروع کیا۔ مذہبی اداروں نے اپنے نظریات کی بقاء کی خاطر مزید پسپائی اختیار کی اور اپنے آپ کو صرف عبادات اور عقائد تک محدود کرلیا یہاں تک کہ معاشرے میں مذہب کوایک ذاتی معاملہ قرار دیا گیا۔اس کے نتیجے میں سیکولرازم، دہریت، آزاد خیالی، جمہوریت،تحریروتقریر کی آزادی، تحریک نسواں اور انسانی حقوق کے نظریات نے اپنی جڑیں مضبوط کرنی شروع کیں اور اس حدتک طاقت پکڑلی کہ موجودہ دور میں بین الاقوامی قوانین کا اجرا اور اطلاق انہی نظریات کے طابع ہوگیا ہے۔ جدید دریافتوں کے بموجب جدید فکرکو سائنس کا نام دیا گیا۔سائنسی معلومات کے اضافے نے گو کہ مغرب میں بعض مذہبی حلقوں کو پسپا تو کیا لیکن اس سب کے باوجود سائنس خود بھی انسان کے مذکورہ بنیادی سوالات کے جوابات کے بارے میں مخمصوں کا شکار رہی اور اگر ہم گہرائی میں جا کر کائنات اور انسان کے حوالے سے جدید نظریات پر غور کریں تو یہ بھی ادھورے ہی ہیں اور کائنات اور زندگی کے بارے میں بنیادی سوالات کا کوئی واضح جواب دینے سے قاصر ہیں۔

سائنس اور مذہب کی محاذ آرائی

یہ جدید مفکرین کا احساسِ برتری، منصفانہ سوچ کا فقدان اور دوسروں کے معقول منطقی نظریات کو خوشدلی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت کی کمی ہے جسکی وجہ سے سائنس اور مذہب محاذ آرائی سے باہرنہیں آپا رہے۔ دنیا میں موجود ہر چیز ایک حقیقت ہی ہے، اگر جدید دریافتیں حقیقت ہیں تو مذہب بھی ایسی حقیقت ہے جوکہ ہزاروں سال سے انسانی ذہن پر حکمرانی کررہی ہے جس کوکسی بھی بنیاد پر ردنہیں کیا جاسکتا۔ گوکہ قدیم مذاہب اپنی قدامت پرستی اور مبہم نظریات کی وجہ سے جدید سائنسی علوم کی تشریح خالص مذہبی نقطہ نظر سے کرنے سے قاصر ہیں پھر بھی سوال یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پرورش پانے والے صدیوں پرانے ایسے خیالات اور عقائد سے کیوں قطع تعلق کرے جو بہت مضبوط اور گہری جڑیں رکھتے ہیں اور جن کی موجودگی ہی ایک حقیقت ہے۔

معاشرتی نظریات

انسان معاشرتی زندگی کی روانی اور ترقی کے لیئے نئے اصول اخذ کرتا رہتا ہے جنہیں معاشرتی نظریات کہا جاتا ہے۔معاشرتی نظریہ ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے جوعموماً کسی فلسفے کی بنیاد پر ہوتا ہے جو

مربوط اعمال کا مجموعہ ہوتا ہے کہ جسے عوام اور حکومت ایک معمول سمجھ کر اپناتے ہیں یعنی ایک ایسا نظریہ جو عوام النّاس کے معاشی اور معاشرتی معاملات سے متعلق ہو۔ اسی وجہ سے نظریات ہی سیاست کا مرکزی اور محوری نقطہ ہوتے ہیں۔ عموماً معاشروں میں ذاتی اور عوامی معاملات میں فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے اس لیئے مرکزی نظریئے کو خصوصی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی سیاسی اور معاشی پیش رفت نظریئے کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ وہ نظریات جو مضبوط منطقی اور غیر مبہم عقلی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں وہ ہی معاشروں میں مثبت اقدار کو فروغ دیتے ہیں۔ غیر مبہم نظریات بلآخر ایک افراتفری اور معاشرتی اور معاشی بے راہ روی پر منتج ہوتے ہیں۔ جدید معاصر نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو لبرل ازم، سوشلزم، سیکرلرازم و جمہوریت وغیرہ کا زیادہ شہرہ ہے۔ آج کل کم و بیش انہی نظریات کا زیادہ تر معاشروں میں غلبہ اور چرچا ہے۔ ہم ان نظریات کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں کہ انکی فلسفیانہ بنیادیں کیا ہیں۔

لبرل ازم

یہ نظریہ شخصی آزادی کا علمبردار ہے۔ یہ ہر شخص کے حقوق کا محافظ ہے سیاست میں اس کا محور انفرادی انسان ہے۔ لیکن مذہبی نظریات کو یہ دقیانوسی اور فرسودہ سمجھتے ہیں اور ان میں تبدیلی کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ خدا کو ایک فعّال ہستی نہیں مانتا ہے۔

سوشلزم

یہ ایک معاشی اور معاشرتی نظام ہے جس میں معاشرہ تمام ذرائع پیدائش پر قابض ہوتا ہے اور تمام ذرائع مفادِ عامہ کی فلاح کے لیئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ سیاست میں عام طور پر اسکے حامیوں کی منزل عوامی فلاح ہوتی ہے۔ یہ خدا کا منکر ہے اور مذہب کا مخالف۔

سیکولرازم

یہ ایک غیر جانبدار اور لا مذہب حکومت کا داعی ہے۔ یہ مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ قرار دیتا ہے اور انفرادی طور پر ہر شخص کے مذہبی حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ اسکی بنیاد بھی مادّی ہے اور خالص علمی پیرایوں میں اپنے نظریات اخذ کرتا ہے۔

جمہوریت

اس میں اقتدارِ اعلیٰ انسانوں کی اکثریت کے پاس ہوتا ہے۔ وہ اکثریت کی بنیاد پر کوئی بھی قانون

سازی کر سکتے ہیں۔

اوپر مذکورہ نظریات خدا اور مذہب کو اجتماعی زندگی سے خارج کر کے انسانوں کی بہبود کے لیئے کوشاں تو ہیں لیکن کیا انسان ان پر عمل کر کے اجتماعی فلاح پا گیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تمام نظریات بنیادی طور پر کسی مربوط اور جامع فلسفۂ حیات کو پیش کرنے میں ناکام ہیں اور اپنی نظریاتی اساس جدید سائنس کی دریافتوں سے مستعار لیتے ہیں جب کہ خود سائنس بھی دریافتوں کے ایسے سفر پر گامزن ہے جس کی منزل کا فی الحال کچھ پتہ نہیں۔ کسی برتر نظم کو جوابدہی سے عاری یہ نظام صرف انسان کے اقتدار اعلیٰ کے داعی ہیں۔ عیش و خوشحالی کا حصول اور مقتدر ہونے کی فطری جبلّت کے ساتھ جب انسان خود ہی عقل کلُ بنتا ہے تو قانون سازی میں انسان کی فلاح مدّنظر رکھی تو جاتی ہے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ یہ آزادی اور طلبِ عیش انسان کے گرد موجود مضبوط خاندانی اور اخلاقی حصار کو تہہ و بالا کرنے لگتا ہے۔ گو کہ یہ تمام نظام انسان کی فلاح کے پیغامبر ہیں لیکن حالیہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انسان بنیادی عقائد کے حوالے سے ہر پابندی سے آزاد ہوا تو پھر خاندانی اور معاشرتی نظام میں تباہی اور خلفشار بڑھا۔ جب سے لامذہب نظریات نے اقتدار پر قبضہ جمایا ہے انسانیت نے تاریخ کے سب سے گہرے زخم کھائے ہیں۔ دنیا میں پچھلے سو سال میں جتنی قتل و غارت گری ہوئی اور اب بھی ہو رہی ہے اس کے ذمّہ دار انہی نظریات کے پرچارک ملیں گے جو دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنے کی دوڑ میں بے قابو ہو چکے ہیں۔ امن کے نام پر مہلک ترین ہتھیاروں کا استعمال اب معمول ہے جس میں لاتعداد بے گناہ انسان مر جاتے ہیں۔ گویا مذہب ایک ایسا اہم عنصر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قدیم تر مذاہب کے نمائندہ حلقے اور جدید سائنس انفرادی طور پر اس دور کے اُبھرتے ہوئے علمی، نظریاتی اور فکری چیلنج کی روشنی میں خدا کائنات اور زندگی کے تعلق کی گتھی کو سُلجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسری طرف قدامت پرستوں اور جدیدیت کے پروانوں میں ایک سرد نظریاتی جنگ بھی جاری ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانوں میں اختلاف رائے ہے جو عام انسانوں کی حقیقی اور مجموعی فلاح میں رکاوٹ ہے۔ انسانوں میں اس نظریاتی ٹکراؤ کا حل اُسی صورت میں نکل سکتا ہے کہ جب مذہب اور سائنس کے علم بردار مل کر خالص علمی بنیادوں پر کھلے دل سے زندگی کے بنیادی سوالات کے صحیح جوابات تلاش کریں کہ جس کی روشنی میں انسانیت

فلاح کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ مگر سوال یہی ہے کہ ایسی مشترک ٹھوس علمی بنیاد کیا ہو سکتی ہے اور یہ کہ اُس کی تلاش کیسے کی جائے جس کی بنا پر دونوں طرف کے نظریات کی چھان بین ہو سکے اور مستند جوابات حاصل کیئے جائیں۔ اس سلسلے میں کسی پیش رفت سے قبل یہ بات لازم ہے کہ ہمیں ایک ایسے مذہب کو تلاش کرنا ہوگا جو کائناتی پیرائے میں زیادہ مضبوط عقلی اور منطقی بنیاد رکھتا ہو۔ لیکن اس پیش قدمی سے پہلے مذہب اور جدید علوم کے دائرہ کار اور اثرات کی مختصر جانکاری بھی ضروری ہے۔

باب ۲

ایمان اور سائنس

کائنات اور زندگی کے حوالے سے سائنس اور مذہب دو مختلف زاویۂ نظر رکھتے ہیں۔ مذہب کا فلسفہ خالق، تخلیق اور بندگی سے شروع ہوتا ہے جبکہ سائنس کا انحصار خالصتاً مشاہدے اور عقل پر ہے، اس طرح ان کے دائرہ کار کی ماہیّت میں بہت فرق ہے۔

مذہب

مذہب کی بنیاد انسان کے یقین پر ہے جسے دوسرے معنوں میں ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ مذہب نے ایک لامحدود قوت خدا سے متعارف کرایا جو کائنات اور انسان کی خالق ہے۔ انسانی عقائد، اخلاقیات اور سماجیات کے پہلو جن کا تعلق انسان کے اعمال سے ہے وہاں کی رہنمائی صرف مذہب کا ہی خاصہ ہے اس طرح مذہب صرف غیر مرئی آثار کا مظہر ہو کر انسانی زندگی کی گتھیوں کو روحانی طور پر سلجھانے میں کوشاں ہے۔ دراصل مذہب کی حیثیت ایک پُل Bridge کی ہے جو انسان کا روحانیت سے ایک تعلق فراہم کرتا ہے اس تعلق کو فراہم کر کے مذہب انسانی زندگی کے طبعی اور روحانی گوشوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے۔ مذہب کے اسی کردار کو قبول کر کے ہی انسان زندگی کے حقائق سمجھ پایا ہے۔

سائنس

سائنس انسان کی علمی کاوش ہے جس میں کسی بھی موجود مظہر کی ماہیّت کی وضاحت مشاہدات اور تجربات سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ سائنس مکمل تجربات کے بعد کسی نظریہ کی طبعیٔ بنیادوں پر تصدیق کر کے ہی اس کو تسلیم کرتی ہے۔ سائنس کا اپنا ایک طریقۂ کار ہے جس کا کام حقیقت کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنا ہوتا ہے تا کہ انسان حقائق کو جان لے۔ سائنسدان کا کام فطری مظاہر سے پیوستہ حقائق کو تلاش کرنا، انکی علمی بنیاد پر وضاحت پیش کرنا اور اُن سے انسان کے لیئے فوائد حاصل کرنا ہے۔ دراصل سائنسی عمل شک یا بے یقینی سے شروع ہو کر تجربات کے بعد یقین پر ختم ہوتا ہے۔ گویا کسی بھی فطری مظہر کی علمی وضاحت سائنس کہلاتی ہے۔

سائنس کی بنیاد

مشہور سائنسدان آئنسٹائن نے کہا کہ سائنس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ طبعی قوانین کا نتیجہ ہے، یعنی سائنس دنیا کے اس عظیم الشان نظام کو ایک حقیقت مانتے ہوئے ہی آگے بڑھتی ہے لیکن وہ اس حقیقت کی بنیاد کی تلاش ضروری نہیں سمجھتی یعنی اس کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ:

یہ طبعی قوانین کس طرح وجود میں آئے یا کیوں وجود میں آئے؟

تمام مظاہر آخر کیوں ان قوانین کے طابع ہیں؟

ان قوانین سے پہلے کیا تھا؟

اس طرح حقیقتاً سائنس کی بنیاد ایک لا ینحل معمے پر ہے۔ سائنس ایک مفروضے یعنی کائنات کی اچانک تخلیق سے شروع ہو کر ترقی کی بے مثال کارکردگی پر پہنچتی ہے۔ وہ ہر طبعی راز کی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے لیے نئے مفروضے بناتی اور مسلسل ٹیسٹ کے ذریعے ان کی تصدیق کرتی ہے۔ سائنس کائنات کی عیاں اور چھپی ہوئی پہیلیاں سمجھنے کی مسلسل کوشش کر رہی ہے جو ہر مظہر کی اصلیت جاننے کے لیئے جاری ہے۔ یہ بھی مدّ نظر رہے کہ ہر وہ چیز جو ہمارے حواس خمسہ کی پہنچ سے باہر رہی ہے جب بھی سائنس نے اپنے تجربات اور آلۂ تجربات سے اس کا کھوج لگا لیا تو طبعی بن گئی جیسا کہ ایکس رے X-Ray اور مختلف نہ محسوس ہونے والی لہریں waves۔ مگر دوسری طرف سائنسدانوں کا یہ کھرا طبعی طرز عمل انسانیت کی روحانی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔ سائنس کے دائرہ کار کے بارے میں دورِ جدید کے سب سے بڑے سائنسداں کے خیالات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پہلے مختصراً ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

"اسٹیون ولیم ہاکنگ برطانوی ماہرِ طبعیات وفلکیات اور مصنف ہیں۔ انکی پیدائش ۸ جنوری ۱۹۴۲ کی ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ڈائرکٹر ریسرچ علمِ کائنات ہیں۔ انکے اہم کام General Relativity میں وحدانی ثقل Gravitational Sigularity اور بلیک ہول سے تابکاری اخراج کا نظریہ ہے۔ ہاکنگ نے سب سے پہلے کائناتی علوم کی تشریح نظریۂ اضافیت اور کوانٹم میکینکس کے حوالے سے کی۔ یہ بہت سی کائناتوں کی موجودگی کے حامی ہیں۔"

اسٹیون ہاکنگ اپنی کتاب Grand Design میں صفحہ ۵۸ پر وضاحت کرتے ہیں کہ جدید سائنس کی نظر میں حقیقت کا تصور کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"بادی النظر میں پوری دنیا ایک حسابی ماڈل یا قواعد کا مجموعہ ہے جو کسی نمونے یا ماڈل کے اجزاء کو مشاہدے کیلئے ملاتا ہے۔ یہ ایک فریم ورک بناتا ہے جو جدید سائنس کا دائرہ کار ہے۔۔۔۔اس طرح ہماری تھیوریز یا نظریات وہ کاوشیں ہیں جو کسی چیز کی خصوصیات وغیرہ کو بیان کرتی ہیں۔شاہد اور مشہود دونوں ہی اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں جسکا ایک طبعی وجود ہے۔اوران دونوں میں کسی تفریق کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

آگے یہ رقم طراز ہیں (صفحہ۶۲)

"ہم نہ صرف سائنس بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی ایسے حقیقی نمونوں کو تخلیق کرتے ہیں جن کا تعلق شعور اور لاشعور سے ہوتا ہے تاکہ معاملات کو سمجھ سکیں۔ہم اپنے آپ کو ان تصورات اور احساسات سے علیحدہ نہیں کر سکتے جو ہمارا حسی نظام بہم پہنچاتا ہے اور جس طرح کہ ہم سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے تصورات پر مبنی نظریات براہِ راست متعین نہیں ہوتے بلکہ نتائج اخذ کرتے ہوئے ایک واسطے کے ذریعے ہوتے ہیں جو ہمارا دماغ ہے۔"

مزید کہتے ہیں کہ ..."ہم جو بھی نظریہ اپنائیں گے وہ ماڈل پر منحصر حقیقت (Model-Dependant Realism) ہوگی۔سائنسدانوں کے مطابق طبعی قوانین ناقابل تبدیل ہیں ان سے انحراف ہی معجزہ ہے جو کہ ناممکن ہے۔سائنسدان صرف سائنسی تشریح Scientific Determinism پر یقین رکھتے ہیں جو صرف طبعی پہنچ تک محدود ہے۔"

"یہ لیپلیس ہی تھا جس نے سائنسی تشریح کی سب سے پہلے وضاحت کی کہ قوانین کا مکمل سیٹ کائنات کے ماضی اور مستقبل کی تشریح کرتا ہے۔اسطرح معجزے اور خدا دونوں خارج ہوجاتے ہیں۔یہی وضاحت جدید سائنسدان کا اس سوال کا جواب ہے کہ کیا معجزے ہوسکتے ہیں؟ درحقیقت یہی جدید سائنس کی بنیاد ہے۔"

اسٹیون ہاکنگ،گرینڈ ڈیزائن،صفحہ۴۳۔

مندرجہ بالا حوالے یہ ثابت کرتے ہیں کہ سائنس اور سائنسی تحقیقات کا دائرہ کار صرف ہمارے حواس اور دماغ کی استعداد تک ہے جو ظاہری اور مادّی عناصر سے منسلک ہے۔یعنی سائنس صرف طبعیات سے متعلق علوم کا مجموعہ ہے۔یہ بھی عیاں ہوا کہ جدید سائنس طبعی وفطری قوانین کو کائنات کے نظم کی بنیاد ماننے کے باوجود اس سے غرض نہیں رکھتی کہ ان بنیادی فطری قوانین کے مجموعے کا منبع origin کیا ہے! یہی وہ غیر عقلی بنیاد ہے جس پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی ہے۔

جدید مذہب

ہزاروں برس پر پھیلی مذہبی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم الوہی ہدایات وقتاً فوقتاً نازل ہوتی تو رہیں مگر مذہبی روایات اور عقائد بھی گزرتے وقت کے ساتھ اپنے اندر حالات کے جبر سے غیر

ضروری نظریاتی کثافتیں قبول کرتے رہے جس کی وجہ سے وحی کی ہدایات خالص نہ رہیں اور مذہب کے حوالے سے ابہام پیدا ہوئے اسی وجہ سے اکثر مذاہب زمانے کی ترقّی کے ساتھ اُبھرنے والے نظریات کو سمونے یا اُن کو علمی طور پر رد کرنیکی صلاحیّت سے محروم رہے۔ ان کی مقدّس کتابوں میں وہ علمی طاقت مفقود ہے جو موجودہ سائنسی دور کی بے پناہ علمی یورش کو نہ صرف برداشت کرسکیں بلکہ سائنس کو برابر کا جواب بھی دے سکیں۔ ان کے پاس سائنسی دلائل کا منطقی جواب اور جدید علمی گرہوں کو کھولنے کی تدابیر معدوم ہیں لیکن اگر خالقِ کائنات حقیقتاً موجود ہے تو منطقی طور پہ نہ صرف آسمانی ہدایات کسی طور پہ بھی ادھوری نہیں ہوسکتیں بلکہ موجودہ مذاہب میں خالق کا حقیقی نمائندہ مذہب کا موجود ہونا بھی لازمی ہے، ایسا مذہب جس میں جدیدِ نظریات کو نہ صرف سمونے کی صلاحیّت موجود ہو بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر غیر منطقی جدید نظریات کے کسی بھی طوفان کو قوّت کے ساتھ دھکیل دینے کی خاصیت بھی ہو۔

ہمیں ایسے ہی مذہب کی تلاش کرنی ہے مگر یہ تلاش اسی وقت مثبت نتائج دے گی جب تمام عقلی دلائل عمومی منطق کی روشنی میں بغیر کسی تعصب کے سائنسی بنیادوں پر استوار ہوں۔ ایسا ہی مذہبی نظریہ ہمیں سائنس کے مقابل ایک عقلی پلیٹ فارم دے سکتا ہے جو حقائقِ کائنات کی تلاش کی سائنسی جدوجہد میں معاون ہوگا۔ اگر ہم ایسا مذہبی نظریہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو جدید دور کی سائنسی دریافتوں کو نہ صرف سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ انسانیت کے تمام بنیادی سوالات کا تسلّی بخش جواب بھی دیتا ہے تو بلاشبہ ہم اس مذہب کو ایک جدید اور سائنسی نظریۂ حیات قرار دے سکیں گے۔

بنیادی مسئلہ، خدا

جدید سائنسداں اور اسکالرز طبعی شواہد کے بغیر خدا کو ماننے پر رضامند نہیں جبکہ مذہب کا موقف ہے کہ خدا طبعی وجودیت سے بالاتر ہے۔ مذہبی اور سائنسی فکر میں ہمیشہ بنیادی مسئلہ خدا کا وجود رہا ہے اسی لیئے ہم سب سے پہلے اس طرف توجہ مبذول کرتے ہیں کیونکہ تصوّرِ خدا کی تشریح اور سائنسی وضاحت ہمیں تحقیق کے اگلے مراحل میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس سلسلے میں سائنسدانوں کے الحادی خیالات اور ان کے اثرات کے حوالے سے تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے جس میں سائنسی علوم کے حقیقی دائرۂ کار کا منطقی اور عقلی جائزہ لیا جائے گا۔

باب ۳

سائنس، سائنسداں اور خدا

سائنسی دائرۂ کار

کیا جدید سائنس واقعی منکرِ خدا ہو سکتی ہے؟

سائنسدانوں اور اسکالرز کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو دعویٰ تجربے سے ثابت نہ ہو وہ سائنسی طور پر غلط False ہے۔ آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں تو رکھیں لیکن اسکے سچ ہونے پر اصرار نہ کریں کیونکہ سائنس کے نظریات اور تجربات اس کی تائید نہیں کرتے۔

آیئے اس سائنسی نقطۂ نظر کو عام منطق سے دیکھتے ہیں کہ آیا یہ خود کتنا سائنسی، منطقی اور عقلی ہے۔

ہم کسی مخصوص شخص کو کیسے پہچانتے ہیں؟

انسان کے دو رخ ہیں ایک طبعی اور دوسرا تصوّراتی، جسمانی رخ کو طبعی طور پر ہم اپنے حواس سے محسوس کر لیتے ہیں جبکہ شخصیت person بمعہ نام یعنی مسٹر ایکس ایک غیر مرئی abstract ہے جس کو ہمارا شعور جو خود غیر مرئی ہے ایک تصوّر کی شکل میں قبول کرتا ہے اسطرح ہمارے حواس اور شعور مل کر مخصوص شخص کو پہچانتے ہیں۔

کیا سائنس کوئی ایسا طریقہ دریافت کر پائی ہے کہ کسی انسان کی شخصیت متعین کر سکے؟

جواب یہی ہے کہ نہیں!

جدید ترین سائنسی تجربات بھی کسی انسان کی شخصیت کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ شخصیت کی کھوج میں کسی بھی سائنسی ٹیسٹ یا سائنسی تلاش میں ایک انسان کو محض خلیاتی انبار یا جنیاتی مجموعہ یا a bunch of molecules or group of DNA ہی بتایا جائیگا۔ انسان کے حوالے سے کوئی بھی میڈیکل ٹیسٹ مطلوبہ معلومات تو دیتا ہے لیکن یہ بتانے سے قاصر ہوتا ہے کہ یہ کس شخص سے متعلق ہے۔ یہاں پر یہ انسان ہی ہوتا ہے جو ایسی کسی رپورٹ پر نام لکھ کر متعلقہ شخص سے منسوب کرتا ہے۔ یعنی مسٹر اسٹیون ہاکنگ Stephen Hawking جو بانگِ دہل ایک بڑے دہریہ

سائنسداں ہیں انکے اس دعویٰ کی تصدیق کوئی بھی سائنسی تجربہ نہیں کرسکتا کہ وہ اسٹیون ہاکنگ ہیں! ایک اور بڑے خدا کے منکر جناب رچرڈ ڈاکنز Richard Dawkins چاہے کتنی کوشش کر ڈالیں انکی ممدوح سائنس انکو بحثیت مسٹر ڈاکنز پہچاننے سے ہمیشہ عاری ہی رہے گی۔ اگر انکے دعووں کی تصدیق کرنے سے سائنس قاصر ہے تو کیا انکا وجود نہیں ہے؟ سائنسی ٹیسٹ میں یہ دونوں بحثیت ایک شخصیت معدوم ہیں لیکن حقیقتاً موجود ہیں جسکی تصدیق انسان کا شعور کرتا ہے۔ گویا سائنس یا اسکالرعلم کی روشنی میں خود یہ اصول متعین کرتے ہیں کہ سائنس کسی شخصیت کی تصدیق نہیں کرسکتی۔ یہیں پر آ کر سائنس کی حدود کا حقیقی تعین ہوتا ہے جس کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

تخلیق کے مدارج

تخلیق کے تین مدارج ہوتے ہیں، ارادہ، تخلیق اور تخلیق کا ظہور۔ کسی بھی انسانی ایجاد یا تخلیق کا مطالعہ کریں یہ تین مرحلے لازماً موجود ہونگے۔ تخیل یا ارادہ طبعی تخلیقی مراحل یعنی عمل سے گزر کر ہی ایک مکمل شئے کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ یہ رخ بھی دیکھیں کہ کسی کار کو دیکھ کر ہم اسکے تخلیقی مراحل نہیں جان سکتے بلکہ اسکے لیئے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہوگی کہ اسکے پرزے پرزے کو جدا کرکے اور انکی اندرونی ماہیت کو جان کر ہی ہم اسکی مینوفیکچرنگ ٹیکنیک کو سمجھ سکیں گے۔ یہی کاوش سائنس کہلاتی ہے لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ اس تمام پیداواری مراحل کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی ہم اس کار کے تخلیق کار manufacturer کی شخصیت کو نہیں جان پائیں گے بلکہ اس کے لیئے ایک دوسرا طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا۔

خالق، تخلیق اور انسانی شعور

ہر انسانی عمل سے منسلک اس کا حاصل یا ردّعمل ہوتا ہے۔ عمل غیر مرئی اور ناقابل پیمائش ہے اسکی کوئی شکل نہیں ہوتی لیکن اسکا حاصل قابل گرفتِ حواس ہے۔ حواس صرف اطلاعات دیتے ہیں اور انسانی شعور عقل کے تناظر میں فیصلہ کرتا ہے جیسا کہ کوئی انسان ایک دعویٰ کرتا ہے کہ میں میرا نام الف ہے تو اسکے اطراف موجود انسان اسکا دعویٰ اس لیئے قبول کرتے ہیں کہ انسانی شعور طبعی حواس کی مدد سے اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ دیگر انسانوں کا یہ دعویٰ قبول کرنا ہی اس شخص کے بحثیت الف موجود ہونیکی دلیل بنتا ہے۔ اسطرح یہ واضح ہوا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار جیسے کسی کار

کے تیار کنندہ یا کسی فن پارے کی تخلیق کرنے والے مصوّر کی کسی بھی جدید سائنسی ٹیسٹ سے تصدیق نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اور صرف انسانی شعور ہی اس تصدیق کی قدرت رکھتا ہے۔ سائنس انسان کی صرف ایک طبعی نظام physical system کی حیثیت سے ہی تصدیق کر سکتی ہے۔ اب بتائیے کہ جو علوم سامنے موجود انسان کی شخصیت کو نہ پہچان سکیں نہ تصدیق endorse کر سکیں یا ایک تخلیق کے محرّک Initiator کی نشاندہی تک نہ کر سکیں تو انکا محدود ہونا تو ثابت ہو گیا۔ مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ انسانی شعور ہی ہے جو حاصل کردہ علوم کی بنیاد پر دوسرے انسان کی شخصیت اور اس سے وابستہ کسی عمل کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ سائنسی علوم! اس دلیل کی روشنی میں جدید سائنسی تجربات کو خدا کی ذات کو رد کرنے کے لیئے استعمال کرنا کتنا عقلی ہے خود فیصلہ کر لیجئے۔ گویا سائنس کا دائرہ کار کسی بھی چیز یا تخلیق کو پا کر اسکی تخلیقی ماہیت، اسکے پیداواری یا ارتقائی مراحل اور منبع origin کو جاننا ہے یعنی تخلیق کے مذکورہ بالا تین میں سے آخر کے دو مراحل، جو عمل اور اسکا طبعی اظہار ہیں۔ اس سے قبل کا مرحلہ یعنی تخلیق کار Inventor/creator کی نشاندہی میں صرف انسانی عقل اور موجود معلومات کام آتی ہیں کہ کون ایسی صلاحیت، علم، قوّت اور وسائل رکھتا ہے کہ یہ کام کر سکے۔ بالکل اسی طرح انسان حاصل علوم سے اپنی خرد اور دانش سے ہی خالق کائنات یعنی خدا یا اللہ تعالیٰ کے وجود کی تصدیق کر سکتا ہے۔ ایک بات واضح رہے کہ انسان خدا کو خود ہی تلاش نہیں کرتا بلکہ یہ خدا ہے جو کہ انسانوں کا خالق ہونے کا اعلان کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں تمہارا خالق ہوں پھر انسان اپنی عقل و خرد اور علوم کی گواہی سے ہی اسکی تصدیق کرتا ہے۔ خدا کا دعویٰ اسکی طرف سے کسی انسانی واسطے یا تحریر text کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا ہے، ایسی تحریر جس کے مصنّف ہونے کا کوئی بھی انسان دعویٰ نہیں کرتا۔ کیا سائنس کسی کتاب کے مصنّف کا نام بتا سکتی ہے؟

مطلق طبعی نظریہ

ثابت ہوا کہ سائنسی علوم صرف ایک محدود دائرے میں ہی انسان کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور سائنس کے حوالے سے خدا کی تلاش یا اس بارے میں لب کشائی نہ سائنس اور نہ ہی سائنسدانوں کا کام ہے۔ کسی سائنس دان کا دعویٰ کہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتا اس کا ذاتی خیال ہوتا ہے جس کا بہ حیثیت مجموعی سائنس کی دریافتوں اور سائنسی ٹیسٹ کے نتائج سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا اگر کوئی ایسا تاثر دیتا ہے تو وہ حقائق کے برعکس ہے۔ سائنس محض اوزار کا صندوق toolkit ہے یعنی سائنسی معلومات

محض وسائل اور ذریعہ ہیں جو ٹھوس معلومات مہیا کرتے ہیں اور بس۔ سائنسی علوم تمام انسانیت کی میراث ہیں اور کسی بھی انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے یا دلیل حاصل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی بھی ماہر علم یا ماہر طبعیات کو۔ کیونکہ سائنسدانوں نے اپنے آپ کو اس کائناتی ماحول میں صرف طبعی مظاہر تک ہی محدود کرلیا ہے لہٰذا سائنس ایک محدود مُطلق طبعی نظریہ کی نمائندہ ہے جو اخلاقیات اور سماجی مسائل سے لاتعلق ہے۔ عام انسان سائنسی دریافتوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے کیونکہ سائنس وہی بتاتی ہے جو کہ حواس خمسہ اور علوم کی گرفت میں آتا ہے اور انسان اس کو سمجھ بھی لیتا ہے کیونکہ دیکھنا ہی یقین دلاتا ہے۔ کیونکہ سائنس کی دریافتیں طبعی سچائی ہوتی ہیں اور انسانوں کو براہِ راست فائدہ پہنچاتی ہیں اسلیئے عام انسان سائنس کو اہمیت دیتا ہے باوجود اس کے کہ انتہائی پیچیدہ علمی اور سائنسی تحقیقات بذاتِ خود عام اِنسان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ مذہب اور سائنس کی محدودیت کی مزید وضاحت اس طرح ہوسکتی ہے کہ کوئی مذہب یہ نہیں بتا سکتا کہ خدا کو کس نے بنایا اور نہ ہی کوئی سائنسداں بتا سکا ہے کہ فطرت یا نیچر کا منبع Origin کیا ہے اور یہ کیسے اور کیوں وجود میں آئی۔

خدا اور سائنسدان

خدا کا انکار کسی بھی شخص کا ذاتی فیصلہ ہی ہوتا ہے مگر جب کوئی عالم یا ماہر طبعیات اپنی علمی حیثیت میں اسکا اظہار کرتا ہے تو ایک تاثر یہ بنتا ہے کہ اس کا علم بھی اس کی تائید کرتا ہوگا۔ جدید دور میں اکثر سائنسدان خدا کے وجود کے حوالے سے تذبذب کا شکار ہیں جس کی وجہ سے یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ سائنس خدا کی منکر ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سائنس کا دائرہ کار میٹا فزکس نہیں ہے لیکن پھر بھی جدید اسکالر خدا کو بھی طبعی پیرایوں میں تلاش کرتے ہیں اور طبعی آثار نہ پاکر خدا کا انکار کرتے ہیں۔ بظاہر جدید سائنسدانوں کا موقف کمزور بنیادوں پر مبنی نظر آتا ہے کیونکہ ایک طرف وہ لاتعداد غیر مرئی قدرتی اور آفاقی قوانین کو بغیر ان کا منبع جانے تسلیم کرتے ہیں جو تجربات کے بعد محض اپنے طبعی انعکاس Physical Reflection سے عیاں ہوتے رہے ہیں لیکن دوسری طرف خدا کے انکاری ہیں حالانکہ اسی پیرائے میں مذہبی نقطۂ نظر سے تمام تخلیق خُدا کے ارادے کا طبعی انعکاس ہی ہے کیونکہ جس طرح کسی تجربے کا نتیجہ ایک فطری قانون کا پتہ دیتا ہے بالکل اُسی طرح کوئی بھی تخلیق اپنے خالق کی صِفتِ خلاّقی کا اظہار ہی ہوتی ہے۔ تخلیق کی موجودگی جواز رکھتی ہے

جو "اتفاق" نہیں ہوسکتا۔ دراصل غلطی یہ ہے کہ ہم نے غیر شعوری طور پر رہبری طبعی سائنس کے سپرد کردی ہے۔ یہ غلط بات ہے کہ علم کے کسی ایک شعبے کو تمام علومِ انسانی پر فوقیت دے دی جائے یا اس کو حکمران علم سمجھ لیا جائے۔ یہاں پر ان سائنسدانوں اور جدید علوم کے محققین Researchers کی طرف اشارہ ہے جو کائنات کی طبعی ساخت کی کھوج اور تحقیق میں سرگرداں ہیں لیکن وہ انسانی عقائد کے بارے میں بھی علمی رائے دیتے ہیں حالانکہ وہ صرف طبعیات Physics کے ہی ماہر ہیں اور انہیں دوسرے علوم کا پتہ نہیں۔ طبعی سائنس کو نیا رہبر مان لینا مسائل کا حل نہیں بلکہ مسائل میں اضافہ کا سبب ہوگا۔ اگر ہم کسی سائنسداں سے پوچھیں گے کہ خدا ہے کہ نہیں تو لازماً وہ یہی کہے گا کہ اس کے پاس کوئی طبعی ثبوت نہیں ہے۔ اپنے شعبے کی حد تک تو وہ صحیح ہے کیونکہ اس کا شعبہ اس سوال کا جواب دینے کا اہل ہی نہیں ہے۔ اس بحث سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ایک شخص یا گروہ خواہ کتنا ہی تعلیم یافتہ یا عظیم محقق ہو جائے عموماً انکے کے علم کا صرف ایک ہی گردشی مدار ہوگا لہٰذا ایک خاص طرزِ فکر کا حامل گروہ تمام انسانوں کی قسمت کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ وہ کوئی ایسا نظریہ نہیں پیش کر سکتے کہ جسے وہ بذاتِ خود آفاقی قرار دیں۔ منطقی طور پہ کوئی بھی آفاقی نظریہ پیش کرنیکا مکلّف صرف آفاقی علوم پر مکمّل دسترس رکھنے والا ہی ہوسکتا ہے جبکہ انسانوں میں ایسا کوئی نہیں۔

کائنات کے سربستہ راز

خدا کے حوالے سے بحث منکرین اور یقین کرنے والوں میں صدیوں سے جاری ہے۔ ہر نیا روز یہی ثابت کررہا ہے کہ کائنات اور زندگی انتہائی پیچیدہ سائنس سے مزیّن ہیں۔ مادے اور زندگی کی ابتدا وہ سربستہ راز ہے جس کو سائنسداں ابھی تک حل نہیں کر پائے ہیں اور موجودہ دور کے ذہین ترین افراد بھی زندگی اور کائنات کے بارے میں گومگوں کی کیفیت میں ہی مبتلا ہیں۔ ان نظاموں کو خودکار قرار دینے سے متعلّق جدید سائنس کے نظریئے پر مدلّل تنقید ہوتی رہی ہے اور اس سے زچ ہوکر منکرین صرف ایک ہی جوابی سوال کو پناہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ اگر سب کچھ خدا نے بنایا تو خدا کو کس نے بنایا؟ یہ سوال آپ کو ہر فورم پر جگمگاتا ملے گا اور اسی پر آ کر بحث بے نتیجہ ختم ہوجاتی ہے۔ دیکھیں کہ اسٹیون ہاکنگ کیا کہتے ہیں۔

It is reasonable to ask who or what created the universe, but if the answer is God, then the question has merely been deflected to that of Who created God. In this view

it is accepted that some entity exists that need no creator, and that entity is God......
Stephen Hawking, The Grand Design, Page 216.

یہ پوچھنا مناسب ہے کہ کائنات کو کس نے بنایا، لیکن اگر جواب خدا ہے تو یہ سوال مزید دوسرے سوال کی طرف جاتا ہے کہ خدا کو کس نے بنایا۔ اس نقطۂ نظر میں یہ مانا جاتا ہے کہ کوئی ہستی ایسی ہے جسے تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں اور وہ خدا ہے۔ (اسٹیون ہاکنگ)

رچرڈ ڈاکنز The God Delusion میں رقم طراز ہیں:

Indeed designe is not a real alternativeat at all because it raises a bigger problem than it solves. Who designed the designer?

Page 147, 'The God Delusion' Rchard Dawkins

"بے شک (کائنات کی) تزئین مناسب متبادل (نظریہ) بالکل نہیں ہے کیونکہ یہ بجائے حل کے اور بڑی مشکل کھڑی کرتا ہے کہ تزئین کار یا ڈیزائنر کو کس نے ڈیزائن کیا۔"

یہی وہ اہم موڑ ہے جہاں سے منکرین کسی بھی بحث سے نکل کر اپنے نامکمل نظریے پر ہی بات چیت کو مجبوری گردانتے ہیں جبکہ اسی نکتے کی وضاحت اور تشریح میں ہی سارے مسائل کے حل ہیں۔
آیئے اس پر غور کرتے ہیں کہ خدا کو کس نے بنایا؟

باب ۴

خدا کو کس نے بنایا؟

شعور کے خوگر انسان کے لیئے خدا کا وجود ہمیشہ ایک معمہ ہی رہا ہے اور ہر دور میں علم، منطق اور عقل کی روشنی میں خدا کو جاننے کی کاوشیں جاری رہی ہیں۔ کیونکہ ہم طبعی ماحول میں رہتے ہیں تو ہمارا طرزِ فکر بھی طبعی عوامل سے منسلک ہوتا ہے اور ہماری سوچ بھی عموماً طبعی بنیادوں پر ہی استوار ہوتی ہے۔ خدا کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ہمارا ذہن اسی ذہنی ساخت میں رہتا ہے اور خدا کو بھی ایک طبعی نقطہ نظر from a Physical point of view سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نتیجتاً خدا کو بھی اِس طبعی وجود پر مبنی ماحول کا حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ غلط نقطۂ نظر نہ صرف عوام بلکہ خواص یعنی مفکّرین اور جدید سائنسدانوں کو بھی انہی پیمانوں پر سوچتے ہوئے کنفیوژن کا شکار کر رہا ہے کیونکہ جہاں سوچ کی سمت سیدھی نہیں ہوتی وہیں مخمصے ڈیرہ جماتے ہیں۔ یہاں ہم سوچ کی درست سمت دریافت کرنے کے لیئے عقل، منطق، علم اور سائنس کی دریافتوں کی روشنی میں خدا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن خدا کے وجود کا پیرایہ سمجھنے سے پہلے وجود کی ماہیت سمجھنا ضروری ہے کہ وجودیت خود کیا ہے اور سوال یہ ہے کہ:

کیا اِنسان محدود عقل کے ساتھ کسی لامحدود ہستی یا وجود کا منصِفانہ مطالعہ کر سکتا ہے؟

وجود کا قفس

انسان جب کائنات کی تخلیق کے حوالے سے خدا کے وجود پر غور کرتا ہے تو اس کی عقل اس لیئے معطّل ہو جاتی ہے کہ وہ وجودیت کے پیرائے کو اپنے شعور میں ایک فطری اور سختی سے پیوست تاثر کے پرتو ہی سمجھنے پر مجبور ہے۔ انسان اور اسکے شعور و عقل کا موجود ہونا بذاتِ خود ایک عجوبہ ہے۔ انسان طبعی وجودیت میں قید ہے اور اپنے محدود شعور کے باوصف وجود کے حوالے سے اسی طبعی وجودیت کو حرفِ آخر سمجھتا ہے۔ یہی ایسی بھول بھلیّاں ہے جس میں انسان صدیوں سے گھوم رہا ہے اور نکل نہیں پا رہا بلکہ جدید علوم اور نئی دریافتوں نے اس مخمصے میں اضافہ کیا ہے۔ حقیقت آشنائی کے لیئے اب کسی اچھوتی سوچ کی ضرورت ہے جو اس طبعی وجودیت کے قفس کے قفل کو توڑ دے

جس میں انسانی تخیل مقید ہے اور ایک عقلی اور شفاف نقطۂ نظر سے کائنات، وجودیت اور خدا کو جانا جائے۔ اس کے لیئے سائنسی طریقہ کار اپنانا ہوگا کہ مفروضات hypothesis کا سہارا لیکر علم اور عقل و منطق کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جائے۔

زندگی کی ساخت

پہلے زندگی کو سمجھتے ہیں۔ وجود زندگی سے ہے اور زندگی کی ساخت ایٹم اور خلیے سے ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی مدِ نظر رہے کہ ہر عنصر کی اکائی (ایٹم) ایک پس پردہ فطرت اور جبلّت کی خوگر ہوتی ہے جیسے آکسیجن اگر آگ جلاتی ہے تو کاربن اسے بجھاتی ہے کہ یہ ان کی جبلّت ہے جسے سائنس خاصیّت یا property کا نام دیتی ہے۔ اسی طرح عناصر اور کائناتی قوّتوں کی اکائیاں بھی اپنی جدا خاصیتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ گویا کسی بھی عنصر کی کارکردگی اسکی جبلّت کے طابع اور متعیّن حدود میں ہی ہوگی لہٰذا منطقی طور پر کسی بھی زندگی کی حواسی اور شعوری صلاحیت اس کو پروان چڑھانے والے بنیادی عوامل کی جبلّت کے رنگ میں ہی عیاں ہوگی۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اگر زندگی فوٹون سے ابھرتی ہے تو کیونکہ فوٹون غیر مرئی ہے اور اس کی جبلّت بے قراری ہے یعنی یہ ایک سیماب صفت اکائی ہے جو بہت رفتار سے چلتی ہے تو اس سے متعلق زندگی بھی غیر مرئی اور برق سے زیادہ تیز رفتار ہو سکتی ہے۔

خلوی زندگی

سائنسی دریافتیں بتاتی ہیں کہ وجود میں آنے کے بعد کائنات رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی پھر ایک وقت میں زمین پر حالات ایسے سازگار ہوئے کہ پانی میں ایٹم سے بنے خلیے سے زندگی پھوٹ پڑی جس میں طویل ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بقول سائنسداں انسان اپنے شعور کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟

زندگی ایک فعّال اور بے چین معمہ یا "چیز" ہے جو اپنے آپ کو خاص ماحول میں عیاں کرنے کی جبلّت رکھتی ہے۔ زندگی ایک آزاد اور کھلا راز ہے جو ہر طرح کے ماحول میں ابھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک غیر مرئی سچائی اور مظہر Phenomenon ہے جو موجود ہے۔ سائنس کے مطابق کائنات ایٹم سے بنی اور زندگی خلیے cell میں شعور کا نام ہے۔ گویا شعور احساس زندگی ہوا تو پھر

شعور کیا ہے؟ شعور بھی زندگی کی پہیلی کا ایک حصہ اور غیر حل شدہ عُقدہ ہے۔

اب سوال اٹھتے ہیں کہ:

کیا حیات صرف خلیات ہی میں محصور ہے؟

کیا حیات صرف اور صرف پانی سے ہی ابھر سکتی ہے؟

حرارتی اور مقناطیسی زندگی

اب ایک دوسرا رخ بھی دیکھیے۔ سائنس کے نظریئے کے مطابق کائنات بگ بینگ سے وجود میں آئی۔ اس نظریئے کا سادہ سا تجزیہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس ابتدائی وقت میں نہ صرف توانائی اور قوّتیں موجود تھیں بلکہ ہر طرح کے مادّے، اجرام فلکی اور ہر طرح کی حیات اور فطری قوانین بھی آپس میں مدغم تھے۔ شروع میں ہر طرف بے تحاشا تپش تھی جو ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی اور جوں جوں کائنات پھیلی تو رفتہ رفتہ تمام چیزیں عیاں ہوتی گئیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس دوران زندگی کی سچائی بھی ایک غیر مرئی صورت میں موجود رہی ہوگی اور مختلف ادوار میں قدرتاً مختلف صورتوں میں عیاں ہوئی ہوگی۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جس طرح عناصر خلیات بناتے ہیں اسی طرح کچھ مخصوص پارٹیکل یا قوّتیں ملکر ایسی چیز بناتے ہوں جس میں ایک بالکل جدا پیرائے کی حیات اور شعور ابھرتے یا ظاہر ہوتے ہوں! پانی سے پہلے کیا زندگی توانائی، قوّت اور حرارت کے پیرائے جیسے روشنی یا ثقل سے پیدا ہو کر کسی اجنبی شعور کے ساتھ ارتقاء پذیر نہ ہوئی ہوگی؟ ہم کس منطق یا علم کے تحت ایسی حیات کو مسترد کریں گے جو شاید کائنات کے کسی گوشے میں موجود بھی ہو۔

اس نظریئے کو مسترد کرنے والوں سے سوال ہے کہ: ایسا کیوں نہیں ہوا ہوگا؟

اس لیئے کہ زندگی تو موجودہ دور میں بھی زمین پر آتش فشانی ماحول میں ایک اچھوتے پیرائے میں خود کو ظاہر کر رہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں خود کو آتشی ماحول میں عیاں کرنے کی قوّت ہمیشہ سے موجود ہے۔

"زندگی جو ہم نہیں جانتے تھے: حیاتی ماہرین سمجھتے تھے کہ زندگی کے لیئے سورج کی روشنی ضروری ہے یہاں تک کہ ایک سسٹم دیکھا جو مکمل اندھیرے میں تھا"

Life As We Didn't Know It

Biologists always thought life required the Sun's energy, until they found an ecosystem that thrives in complete darkness

http://science.nasa.gov/science-news/science-at-nasa/2001/ast13apr_1/

ناسا کا اعلان۔آرسینک پر موقوف زندگی کی دریافت۔"۔۔۔ ہماری زمین پر ہی سمندر کی گہرائی میں آتش فشانی وینٹ میں حالیہ دریافت شدہ ٹیوب وارم جو سورج کی روشنی کے بغیر زندہ ہیں اور توانائی حاصل کرنے کے لیئے کیمیکل پر انحصار کرتے ہیں جو ایک عجوبہ ہیں۔یہ شعاع ترکیبی photosynthesis کے بجائے کیمیا ترکیبی Chemosynthesis سے توانائی حاصل کرتے ہیں اور دلچسپ امر یہ ہے کہ گو کہ دونوں طریقوں میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی استعمال ہوتے ہیں لیکن کیمیا ترکیبی میں آکسیجن کے بجائے سلفر خارج ہوتی ہے۔"

NASA announcement: Arsenic-based life form discovered on Earth .... Instead of photosynthesis, vent ecosystems derive their energy from chemicals in a process called "chemosynthesis." Both methods involve an energy source (1). carbon dioxide (2). and water to produce sugars (3). Photosynthesis gives off oxygen gas as a byproduct, while chemosynthesis produces sulfur.

http://www.washingtonpost.com/wp-dyn/content/article/2010/12/02/AR2010120204183.html

https://www.quora.com/Do-we-need-a-broader-definition-of-life

اس سے ہمارے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ کائنات میں حرارت اور روشنی سے مختلف حیات کا عیاں ہونا بعید از قیاس نہیں کیونکہ اِس وقت زمین پر معتدل حالات میں بھی مذکورہ بالا زندگی کا ایک نئی طرز میں ظاہر ہونا زندگی کی اپنی طاقتور اور ہمہ جہت جبلّت اور وصف کا مظہر ہے یعنی حیات کا مظہر کثیر الجہت multi-dimensional ہے اور مختلف ماحولیات میں خود کو ظاہر کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی منطقی ہے کہ اگر حیات کی جہتیں ایک سے زیادہ ہونگی تو وجود کی ماہیّت بھی مختلف ہوسکتی ہے جس میں غیر طبعی حیات نمو پذیر ہوسکتی ہے۔اب کیونکہ انکی آفرینش کے جبلّی پیرائے غیر طبعی اور عام انسانی حواس سے ماورا ہونگے لہٰذا اس بنیاد پر پیدا ہونے والی زندگی بھی اپنے وجود کے حوالے سے انسان کے لیئے نہ صرف غیر مرئی ہوگی بلکہ انسانی حواس سے ماورا ہوگی جیسے ثقل، مقناطیس، روشنی سے منسلک زندگی نامعلوم پیرایوں میں موجود ہوسکتی ہیں۔ ایسے وجود اپنے پیرائے میں نہ صرف زندہ ہونگے بلکہ اپنے اپنے شعوری دائرے میں کسی ارتقاء کی طرف گامزن بھی ہوسکتے ہیں۔یعنی انسان ہی اپنے اب تک کے علم کے تئیں کائناتی زندگی کی ابتدا کو پانی تک محدود سمجھتا رہا ہے جبکہ حقیقت اسکے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔

مشترک اور مختلف جبلّت

ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ زندگی کے لیئے مانوس ماحول ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پیدا ہوا تو اور دوسرے عناصر کے ملاپ سے کیوں نہ پیدا ہوا۔ اسکی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ دو عناصر ایک ایسی چیز بناتے ہیں جس کی جبلّت سے زندگی کی مختلف جہتوں میں سے کوئی ایک جہت مانوس یا ہم آہنگ Compatable ہے۔ جس کی وجہ سے حیوانی زندگی پانی میں نمودار ہوئی۔ ہم اس لیئے اس زندگی کو باآسانی پہچانتے ہیں کہ زندگی اور ہمارے ذہن و دماغ ایک ہی مشترک خلوی منبع cellular origin سے ابھریں ہیں اور یہ فطری اور جبلّی طور پر آپس میں ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح جب تخلیقی جبلّت مختلف ہوگی تو کسی غیر عنصر یا توانائی وحرارت سے متعلّق زندگی کا ادراک جبلّی ہم آہنگی کے فقدان کی وجہ سے ہمارے ذہن اور حواس سے ماوراء ہوگا اور وہ ہمارے لیئے معدوم اور بے وجود ہی رہے گی۔ اسکا منطقی اور اصولی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر نامعلوم پیرائے کی زندگی ہمارے لیئے طبعی طور پر معدوم رہے گی۔

شعور کی قسمیں

اسی کرّۂ ارض پر خلیات پر مبنی حیات جانور، پرند، حشرات الارض، درختوں اور پھولوں کی شکل میں بھی موجود ہے جو شعور کے حامل ہیں اور جوڑے pairs بھی رکھتے ہیں۔ گویا خلوی حیات کے کئی متوازی نظام ہمارے سامنے رواں دواں ہیں مگر اس کے باوجود ابھی انسان انکے شعور اور آپس کے روابط communications کی حقیقت نہیں جان پایا جس سے انسان کی کم علمی بھی عیاں ہے۔ ثابت یہی ہوتا ہے کہ جب خلوی حیات اور اس سے منسلک شعور کی لاتعداد قسمیں ہمارے سامنے ہیں تو غیر خلوی حیات اور اس سے منسلک شعور اور وجود بعید از قیاس کیسے ہو سکتے ہیں۔ اب ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں کہ انسان کسی اجنبی پیرائے کی حیات کی تصدیق کیوں نہیں کر پاتا؟

وجود کا دائمی ذہنی ادراک

اگر زندگی کسی توانائی مثلاً فوٹون Photon سے آشکارہ ہو تو کیا ہم یہ جان سکتے ہیں کہ:

اسکے شعور کے پیرامیٹر کیا ہونگے؟ اسکے حواس کس طرز کے ہونگے؟ اسکی قوّتوں کے پیرائے کیا ہونگے؟ اُس طرزِ حیات کے ارتقاء کے مراحل کیسے ہونگے؟ اور اسکی عقل اگر ہوئی تو اسکی ماہیّت کیا ہوگی؟ یقیناً ہم یہ نہیں جان سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وجود کے حوالے سے ہمارے تصوّر اور

تخّیل کے پیرائے ہماری وجودی اساس یعنی خلوی حیات cellular life سے منسلک ہیں اس کی وجہ سے ہمارے ذہن میں وجود کا متعیّن ادراک فطری طور پر طبعی ہے۔ ہم کبھی بھی کسی اجنبی وجودیت یا اجنبی زندگی کے حقیقی پیرائے Alien Life Parameters کو اپنے تخّیل کے فطری خلوی پیرائے Natural -Cellular-Thought-Parameters میں رہتے ہوئے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ یہ آپس میں مانوس اور ہم آہنگ compatible نہیں ہیں۔ اسی اساسی یا بنیادی خلوی جبلّت کے پرتو ہمارے ذہن میں وجودیت ایک خاص طبعی پیرائے میں اس سختی سے ثبت ہے کہ یہ ادراک perception اب ایک جنّیاتی ورثے Genetic Heritage کی طرح ہر خاص و عام کا مستقل ذہنی وصف بن چکا ہے۔ تمام انسان بشمول اسکالر اور سائنسداں اپنے اطراف کے پُر اثر طبعی ماحول کے پیدائشی اور مستقل اسیر ہوتے ہیں اور وجود اور عمل سے منسلک خیالات اور احساسات بھی خلوی شعور کے زیر اثر ایک خاص طبعی تاثر کے آفاقی دائرے میں گردش کرتے ہیں۔ اسی لیئے ہمارے لیئے کسی اجنبی پیرائے میں زندگی کا وجود ذہناً نا قابل قبول ہو جاتا ہے۔ اپنے شعور اور عقل کے باوصف ہم یہ نتیجہ تو اخذ کر سکتے ہیں کہ زندگی مختلف نہج Dimensions میں ظاہر ہو سکتی ہے یا ہوئی ہے لیکن جبلّی ہم آہنگی کے فقدان کی وجہ سے ہم اپنے تجربات، عقل اور علم کی روشنی میں کسی غیر خلوی حیات کی نمو پذیری کی تصدیق نہیں کر پاتے اسی لیئے ہم اسکو اپنی عقل کے پرتو مسترد کرتے رہے ہیں۔ خلوی شعور کے حوالے سے یہ واضح رہے کہ آگ سے ابھرنے والی زندگی اور اسکے شعوری پیرائے آتشی اور برقی جبلّت سے آشکارا زندگی کا شعور بھی برقی شعور ہی کہلائے گا کیونکہ اسکی اساس برق ہوگی جبکہ روشنی کے پیرامیٹر کی زندگی کا شعور شعاعی یا تنویری ہوگا۔ ایسی کسی حیات یا وجود کی طبعی یا سائنسی تصدیق فی الوقت ممکن نہیں بلکہ انکی قبولیت ایمانیات اور عقائد کے زیر اثر ہی ہو سکتی ہے۔

وجودیت کے پیرائے

ہم جسے وجود کہتے ہیں وہ ایک مخصوص احساس یا تاثر ہے جو ہم کو کسی ایسی ہستی یا چیز کا ادراک دیتا ہے جسکا تعلّق کسی یکساں، مختلف یا منفرد حیات سے ہو سکتا ہے۔ یہ بھی واضح ہوا کہ کائنات میں موجود مختلف عناصر اور توانائیوں میں حیات کے ابھرنے کے مواقع منطقی بنیاد پر دور از کار نہیں۔ گویا وجود مختلف دائروں میں مختلف جہتوں میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ اسطرح وجود کے ایک دائرے میں

رہائش پذیر حیات دوسرے دائرے کی حیات سے جدا خصوصیت کی حامل ہوگیا وران کا آپس میں ممکنہ ربط انکے بنیادی اجزاء کی باہمی ہم آہنگی پر منحصر ہوگا۔ گویا موجود ہونے کے بہت سے پیرائے یا رنگ ہوسکتے ہیں اور یہ مختلف دائروں میں عیاں ہوسکتے ہیں۔ کائنات اور خود انسانی تمدّن میں جاری نظم ایک آفاقی حقیقت ہے اس کے بموجب یہ قیاس کرنا منطقی ہوگا کہ وجود یا موجود ہونے کے کائناتی نظام پر حاوی کوئی نظام ہوسکتا ہے جو وجودیت کو مختلف پیرائے اور رنگ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو ورنہ مختلف طبعی حیات کا ہونا غیر حقیقی ہو جائے گا۔ اب اگر ایسا ہے تو یقیناً وہ سُپر حیات یا نظم یا قوّت جس نے وجود کے دائرے تخلیق کیئے تمام موجود کائناتی حیات سے انتہائی جدااور برتر ہوگی۔ جب ہم ایک وائرلیس ریموٹ کے ذریعے بہت دور سے کسی مشین کو کنٹرول کرتے ہیں تو بظاہر کوئی واسطہ نظر نہیں آتا لیکن درحقیقت وہ مشین ایک نہ نظر آنے والے نظام سے منسلک ہوتی ہے۔ ایک لاعلم کے لیئے یہ ایک عجوبہ یا Baffle ہوگا جبکہ جاننے والوں کے لیئے یہ ایک مربوط نظام ہے۔ بالکل اسی طرح انسان اطراف میں مخفی نظام ہائے کائنات کی ہیّت سمجھنے میں مشغول تو ہے لیکن مکمّل نظم System کو ابھی تک سمجھنے سے قاصر اور حقیقی کائناتی نظام سے بہت حد تک لاعلم ایک مخلوق ہے۔ مختصراً، اگر کائنات ایک تخلیق ہے تو اس میں موجود زندگی بھی ایک تخلیق ہی ہے اور انسان کے شعور کے بموجب وجودیت بھی ایک غیر مرئی مخلوق ہوئی اِلاّ یہ کہ جدید علوم عملی طور پر Practically یہ ثابت کردیں کہ عدم سے وجود یا نیست سے ہست things from nothing خودبخود کیسے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اچانک تخلیق spontaneous creation کے ضمن میں جدید سائنسداں زندگی اور شعور کو عجوبہ اور حیران کن ہی قرار دیتے ہیں۔

وجودِ خدا کی حقیقت

ہم نے جانا کہ وجود ایک ذہنی تاثر ہے جس کی وجہ سے ہم موجود ہونے کو ہی وجود گردانتے ہیں کیونکہ ہماری نمو پذیری شعور کے احساس وجود میں ہوتی ہے۔ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس نے یہ نظام تخلیق کردیا جس میں موجود ہونے کا شعور ہی زندگی کہلایا۔ ہمارا خلوی شعور وجود کا ایک فطری طبعی تاثر ہمارے ذہن میں تخلیق کیئے رہتا ہے۔ انسان خدا کو سمجھنے کی کوشش وجود اور عدم وجود یا حاضر اور غائب کے اُنہی طبعی پیرایوں میں کرتا ہے جو خلوی شعور کے بموجب مستقل فطری تاثر بن چکے ہیں۔ یہ سوال کہ خدا کو کس نے بنایا تجسّس میں اسی فطری تاثر سے اٹھتا ہے اور انسان خدا کو بھی

اپنی طرح کی زندگی اور وجود کا خوگر سمجھتے ہوئے جاننے کی کوشش کرتا ہے جو کہ خدا کے حوالے سے ایک غیر حقیقی تصوّر illusion ہے۔ خدا یقیناً ایک زندہ ہستی ہے لیکن اس ہستی کا پیرایہ کیا ہوگا اُسکو انسان اپنی عقل کی خلوی بنیاد Cellular Based Wisdom کی وجہ سے سمجھنے کا مکلّف ہی نہیں ہے۔ دیکھیئے بجلی یا برق Electric کی ساخت کی بھی ایک جبلّت ہے جس کو قابو کر کے انسان نے کمپیوٹر اور روبوٹ بنا کر انکو مصنوعی زندگی اور مصنوعی عقل دی۔ جس طرح انسان کے تخلیق کردہ الیکٹرانک ماحول میں مقیّد کوئی سپر روبوٹ بھی اپنی برقی Electronic جبلّت کی محدودیت اور نامانوس جبلّی ساخت کی وجہ سے خلوی زندگی Cellular life کے پیرائے نہیں سمجھ سکتا بلکہ اسکی رمق تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح انسان خدا کو طبعی اور خلوی پیرایوں میں مقیّد رہ کر شاید کبھی نہ سمجھ پائے۔ یوں سمجھیں جیسا کہ ریڈار ایک مصنوعی "حواس" کا خوگر نظام ہے جس سے خارج ہونے والے سگنل کسی جسم سے ٹکرا کر اسکا الیکٹرونک تاثر لیکر واپس آ کر اسکی موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن اسٹیلتھ تکنیک Stealth Technology اسکو غیر موثر کر دیتی ہے، یعنی اگر چار جہاز اُڑتے آ رہے ہیں اور ان میں ایک اسٹیلتھ ساخت کا ہے تو ریڈار صرف تین جہاز دکھائے گا کیونکہ اسٹیلتھ نظام سے آراستہ کوئی جسم اسکو نظر نہیں آئیگا۔ گویا جہاز جو کہ ایک ٹھوس جسم ہے کھلی فضا میں موجود ہوتا ہے لیکن ایک مقیّد ماحول یعنی ریڈار کے کنٹرول روم یعنی کسی خاص پیرائے میں موجود سے معدوم یا حاضر سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہی صورتحال انسان کے حواس اور تخیّلات کے بموجب خدا کے وجود کی ہے کہ انسان سب کچھ دیکھ سکتا لیکن خدا کو نہیں کیونکہ کائنات کا ماحول اسی ریڈار کے کنٹرول روم کی طرح ہے جس میں انسان اپنے حواس کے طابع ہر چیز کا شعور حاصل کر سکتا ہے جبکہ خدا کسی نامعلوم اسٹیلتھ جیسے پیرائے میں رہ کر ہر چیز پر حاوی ہے۔ اگر خدا اس طبعی ماحول سے کسی ایسے پیرائے میں بھی منسلک ہوتا جسکا فی الوقت انسان کو علم ہے تو انسان اب تک خدا کے وجود کا پیرایہ جاننے کی طرف پیش قدمی کر چکا ہوتا۔ درحقیقت میٹافزکس جوں جوں فزکس میں ضم ہوتی رہے گی خدا کو سائنسی طور پر قبول کرنے کے مواقع اتنے ہی بڑھیں گے۔

منکرین کے مخمصے

الحاد دراصل کائنات اور وجود کی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں سوچتے ہوئے انسانی ذہن کا مخمصہ ہے اور بس! کیونکہ کوئی بھی بڑے سے بڑا منکرِ خدا خواہ وہ کوئی عظیم اسکالر یا سائنسدان ہی کیوں نہ

ہو آج بھی کائنات اور زندگی کے عجوبے کی تشریح خدا کو خارج کر کے نہیں کر سکا۔ ان کے پاس نہ زندگی اور شعور کی سائنسی وضاحت ہے اور نہ ہی انسانی جذبات و خیالات کے اجراء کی توضیح ہے۔ علم، عقل اور منطق کے سہارے سائنسی نظریات کا دفاع کرتے ہوئے جہاں بے بس ہو جاتے ہیں تو کچھ اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ یہ ایک حیران کن مسٹری ہے جس کا پتہ کبھی چل جائے گا۔ سائنس کی محدودیت اس بات سے ہی عیاں ہے کہ یہ صرف ان سوالات کا جواب دیتی ہے جو کیا اور کیسے سے شروع ہوتے ہیں یعنی کوئی مظہر کیا ہے اور کیسے موجود ہے جبکہ بہت سے انتہائی ضروری "کیوں" سے شروع ہونے والے سوالات کا جواب نہ دیتی ہے نہ ہی دے سکتی ہے بلکہ لفظ کیوں اپنے حقیقی مفہوم میں اس کی لغت سے ہی خارج ہے۔

سائنس آج بھی جن سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی ان میں سے چند یہ ہیں۔

کائنات عدم سے خود بخود کیسے ظاہر ہوئی؟ کائنات کیوں بنی؟ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا؟ کائنات میں ہر جگہ ایک نظم کیسے ہے؟ اور کیوں ہے؟ زمین کے ہر گوشے میں پیدا ہونے والی زندگی اپنے گروپ میں یکساں اور آفاقی جبلّت کیوں رکھتی ہے؟ بے پایاں علوم بھی کیا بگ بینگ سے قبل موجود تھے؟ انکا منبع کیا ہے؟ زندگی کیا ہے اور کیوں ہے؟ شعور کیا ہے اور کیوں ہے؟ اچھے برے خیالات کا اجراء کہاں سے اور کیوں ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

جدید علوم خدا کا متبادل پیش کرنے میں کھلے ناکام ہیں اسی لیئے ہر اسکالر، فلاسفر اور ہر دہریہ کسی بھی مباحثے میں مذکورہ بالا سوالات کے جوابات سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتا ملے گا۔ ان گزارشات سے ہم عقلی، منطقی اور سائنسی طور پر کسی حد تک یہ جان چکے کہ موجودہ فزیکل پیرایوں میں یہ سوال کہ خدا کو کس نے بنایا غیر متعلّق Irrelevant ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے جو سوالات ابھرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

انسان کیا اور کیوں ہے؟ کیسے بنا؟ کس نے بنایا؟

خالق اور مخلوق کا تعلّق

خالق، مخلوق اور تخلیق کا تعلّق سمجھنے کے لیئے ہم ایک جدید سائنسی مثال کا سہارا لیتے ہیں جس کا تعلّق جدید روبوٹ سے ہے جن کا زمانہ تیزی سے آ رہا ہے اور مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence کا بہت چرچا بھی ہے جو روبوٹ کی ایک طرح کی مصنوعی عقل ہے۔ آیئے دیکھیں

کہ جدید سائنس کیا کرنے جا رہی ہے

"By mid-21st century, a team of fully autonomous humanoid robot soccer players shall win soccer game, complying with the official rule of the FIFA, against the winner of the most recent World Cup," RoboCup organizers pledge on the competition's official website.

Federation of international Robot-Soccer Association

"اکیسویں صدی کے وسط تک خود مختار انسانی روبوٹ فٹبال ٹیم اُس وقت کی انسانی ورلڈ چیمپیئن ٹیم کو FIFA کے قوانین کے مطابق کھیلتے ہوئے شکست دیگی۔ روبوٹ کپ انتظامیہ کا اپنی ویب سائٹ پر دعوی۔

https://www.delta.tudelft.nl/article/humanoid-robot-soccer-players-will-win

فیفا کا یہ لنک اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

http://www.fifa.com/news/y=2012/m=12/news=robots-playing-the
-beautiful-game-1962620.html

گویا آئندہ چند دہائیوں میں ایسا ہونے جا رہا ہے۔ ذرا تصور کریں کہ انسانوں سے مقابلے کے دوران اُن خود مختار روبوٹ کھلاڑیوں کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ انسانوں سے مقابلے میں وہ ایک الیکٹرانک حصار میں ہی قید ہونگے، اُنکا سارا کھیل ایک خاص دائرے کے اندر ہی گردش کریگا جو گراؤنڈ تک محدود ہوگا۔ وہ انسانوں کی طرح کھیلیں گے، ڈاج دیں گے، فاؤل بھی کریں گے اور گول بھی، انسانوں کی طرح خوش اور غمگین ہونگے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ارادے اور عمل کی آزادی کے باوجود وہ اپنی محدودیت کے ایک حصار میں ہی مقیّد رہینگے جسکا تعیّن انکا پروگرامر کریگا۔ وہ صرف اُس کھیل کے ماحول کی حد تک ہر فیصلہ کرنے میں آزاد ہونگے! اب یہ پروگرامرز کا کمال ہوگا کہ وہ اُن روبوٹ کے دماغ brain chip میں کس طرح کے خیالات کو جنم دیتے ہیں کہ وہ کامیابی و ناکامی اور جزا اور سزا کے معانی سمجھتے ہوئے جیت کو ایک مقصد بناتے ہوئے اور جائز اور ناجائز fair & foul کی گرہوں میں الجھتے ہوئے جیت کے متلاشی ہونگے۔

ذرا غور کریں کہ حالانکہ یہ محض ایک کھیل ہوگا یا ایک دھوکہ لیکن ان روبوٹ کے لیے ہرگز نہیں کیونکہ وہ جس ذہنی الیکٹرونک سانچے Electronic Mindset میں سوچ رہے ہیں ان کیلئے وہی حقیقت ہے۔ انکے مقابل انسان تو ہونگے لیکن کھیل کے محدود دائرے میں روبوٹ انکے ہم پلّہ ہونگے۔ ہر روبوٹ ایک شخص person کی حیثیت سے مقابل ہوگا۔ اسطرح روبوٹ جن کو ایک

خاص مصنوعی ذہانت دی گئی وہ اپنے ذہنی سانچے میں خودمختار ہو گئے کہ وہ جو چاہیں کریں کیونکہ وہ اپنی عقل کے ذریعے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر عمل کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ وہ اپنے تئیں ایک وجود رکھتے ہیں یعنی ان کا ذہن یا دماغ brain یہ تصور لیے ہوئے ہے کہ وہ متحرک ہستی ہیں اور وجود رکھتے ہیں۔

الیکٹرانک خیال اور شعور

انسان روبوٹ کو جو مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence فراہم کرتا ہے وہ بھی سوفٹ ویئر کا بھنور یا مدار ہے کہ روبوٹ کی یادداشت Memory اور مصنوعی ذہانت انسان کی متعیّن کی ہوئی لہروں میں گردش کرتی ہے۔ روبوٹ کو کسی صورتحال میں فیصلہ کرنیکی محدود آزادی ہوتی ہے، وہ " صحیح یا غلط" True or False کی منطق پہ ماحول کا تجزیہ کر کے ہی کوئی فیصلہ کرتا ہے کیونکہ پروگرام میں اسکی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ ہاں، لیکن پروگرامر کسی بھی مخصوص صورتحال میں روبوٹ کے متوقع عمل کو جان سکتا ہے کیونکہ اُسکا علم حاوی اور بہ نسبت روبوٹ کے لامحدود ہے۔ اسکو اپنے مرتّب کردہ پروگرام کے حوالے سے یہ معلوم رہے گا کہ کس عمل کے بعد کونسے اعمال یقینی، متوقع یا غیر متوقع Random ہونگے اور اسکا انحصار اُسکے علم کی قوّت و وسعت اور پروگرام پر گرفت پر ہی ہوگا۔ مصنوعی ذہانت روبوٹ کا محدود شعور ہے جس کے بموجب اُنکے لیئے اُن کا ماحول اور وجود حقیقت جبکہ انسانی دنیا میں ان کا ماحول ایک فریب illusion ہی ہے۔ مزید یہ کہ ان روبوٹ کے لئے ان کی سوچ سے باہر کی ہر چیز ان کے لیے Infinity یا لامحدودیت ہے۔ دراصل وہ ایک ذہنی قید خانہ میں ہیں جسکو ہم مشین لینگویج میں مرتّب پروگرام بھی کہہ سکتے ہیں یعنی پروگرامر نے ان کو ایک ماحول میں مقید کر دیا ہے اور وہ اس سوفٹ ویئر سے باہر کچھ جان نہیں سکتے۔ وہ اپنے Time and space میں زندہ ہیں۔ مگر غور طلب نکتہ یہ ہے کہ کیا وہ روبوٹ اس پوزیشن میں ہونگے کہ یہ جان سکیں کہ ان کا تخلیق کار کون ہے اور کن صلاحیتوں کا حامل ہے؟ کیا الیکٹرونک وجود سے اوپر کوئی طبعی وجود انکے خیال میں سرائیت کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب پروگرام ڈیٹا میں یہ اشارہ دے کہ ان کا کوئی خالق ہے۔

تصوّرِ خدا کی تشریح

گویا خدا ایک ایسی ہستی جو کہ زندہ ہے قائم ہے اور لامحدود قوّت کی مالک ہے اس طرح کہ ہر ذرّہ یا

پارٹیکل جو کائنات میں موجود ہے اس کی گرفت میں ہے اور ہر چھوٹا یا بڑا انظام اسی کی مشیّت کا طابع ہے۔ یہ بڑا سادہ مگر پیچیدہ نظریہ ہے جس کو سمجھنا پہلے تو بہت مشکل تھا اور انسان خدا کی ہستی پر غور نہیں کر پاتا تھا لیکن علوم کی ترقی اور جدید دریافتوں نے ہمیں ایسی مثالیں ضرور فراہم کر دی ہیں کہ ہم سمجھ سکیں کہ ایسا ممکنات میں ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے آپ صرف کسی ایک سپر کمپیوٹر سسٹم سے منسلک لاکھوں بلکہ کروڑوں کمپیوٹروں کو لے لیں کہ مرکزی سرور کمپیوٹر Server Computer کس طرح نہ صرف ہر کمپیوٹر کو ان کو مطلوبہ معلومات فراہم بھی کر رہا ہوتا ہے بلکہ ہر کمپیوٹر کا انفرادی ریکارڈ بھی رکھ رہا ہوتا ہے اور یہ کام بیک وقت کروڑوں کمپیوٹروں کے ساتھ سیکنڈوں میں مسلسل انجام دے رہا ہوتا ہے۔ کیا ایک عام آدمی کا ذہن پہلے اس بات کو قبول کر پاتا؟ لیکن اب ایسا ممکن ہے۔ اس نکتے کو ہم تفصیل سے آگے جاننے کی سعی بھی کریں گے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا تصوّر ایک مربوط پلاننگ کے تحت ہی انسان کے خیال میں پیوست ہے ورنہ مادّہ پرستانہ نظریہ حیات کی رُو سے جہاں فطرت ایک خودکار نظام کے تحت رواں ہے خدا کا خیال کا آنا ہی غیر منطقی اور غیر سائنسی ہے۔

مذہب، سائنس اور خدا کو سمجھنے کے بعد ہم انسان اور کائنات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم کچھ اہم عوامل کا تجزیہ کریں گے جو ہمارے لیئے آگے معاون ہونگے۔

باب ۵

انسان کیا ہے

خود آگہی

بغیر فلسفیانہ گہرائی میں جائے، انسان کے اس بُنیادی سوال کا ایک سطحی تجزیہ کرتے ہیں کہ:

میں کون ہوں؟

دراصل ہر شخص خواہ وہ کسی بھی ماحول میں ہو مثلاً گھر پر بازار میں یا آفس میں وغیرہ وغیرہ اس کا ذہن یا لاشعور اپنے ماحول کے حساب سے طرزِ عمل کو متعیّن کرتا ہے۔ یعنی کوئی شخص گھر پر محض گھرانے کا سربراہ ہی ہوتا ہے اور اس پر گھرانے کی سرپرستی کی ذمہ داری ہوتی ہے اور گھر پر اس کے خیال کا ارتکاز عموماً گھریلو انتظام سے متعلق ہی ہوتا ہے مثلاً بیوی بچوں کی ضروریات کا خیال وغیرہ۔ اسی طرح جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے کام کاج کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو ہماری ذہنی سوچ تبدیل ہوتی جاتی ہے، مثلاً اگر ہم گاڑی چلا رہے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ٹریفک کے قوانین کیا ہیں اور ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے ہمیں روڈ پر کس طرح کا رویّہ رکھنا ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنے کام کی جگہ پر پہنچتے ہیں تو آفس میں داخل ہوتے ہی تمام ذہنی رویّے بالکل نیا روپ دھار لیتے ہیں اور ہم ایک ذمہ دار ملازم بنتے ہیں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈیوٹی کے دوران آفس کے اندر اور باہر کِن قواعد اور ضوابط پر عمل کرنا ہے۔ ہمارے یہ مذکورہ طرزِ عمل وقت کے ساتھ قدرتی طور پر مربوط ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ قوانین اور ضوابط کی خلاف ورزی پر نقصان ہوسکتا ہے۔ گویا ایک شخص گھر پر ایک ذمہ دار سربراہِ خاندان، گھر سے باہر ایک ذمہ دار شہری اور آفس میں ایک ذمہ دار ملازم ہوتا ہے اور تمام مناسب ذہنی رویّے ہر شخص کے لاشعور Subconcious Mind میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بات اور واضح ہے کہ ان تمام حالتوں میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایک ملک کا شہری ہے اور اس ملک کے قوانین کا احترام بھی

اس پر نہ صرف فرض ہے بلکہ وہ قوانین دیگر تمام سے برتر بھی ہیں۔لہٰذا ہر صورتحال میں خواہ ہم گھر دفتر یا بازار میں ہوں ذہن میں یہ بات بھی راسخ ہوتی ہے کہ ملکی قوانین کا احترام کرنا ہے۔ گویا ہر شخص لاشعوری طور پر پہلے ایک ذمہ دار شہری پھر کچھ اور ہوتا ہے اور ہر قدم پر یہ بات لاشعوری طور پر مدّ نظر رہتی ہے کہ ملکی قوانین کی پاسداری ہوتی رہے۔ یہ تمام ذہنی گرہیں Mind-locks ہیں جو لاشعور میں فعّال رہتی ہیں۔

انسان کائناتی باشندہ

اب ایک زیادہ اہم سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہم ایک ذمہ دار شہری کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے ذمہ دار باشندے بھی ہیں؟ کیا اس کائنات کے حوالے سے ہمارے لاشعور میں تمام ضروری ذہنی رویّے محفوظ ہیں؟ عموماً انسان کائنات میں اپنے مقام اور اسکی ذمہ داریوں کو نظر انداز کئے رہتا ہے یا اس طرف اس کا خیال ہی نہیں جاتا حالانکہ کائنات بھی ایک وسیع تر ماحول یا سلطنت ہے اور انسانی رویّے بھی قدرتی اور منطقی طور پر لازماً کسی ضابطے کے تحت ہی ہونے چاہئیں۔ اس حوالے سے ہم کو ان ضروری رویّوں کی نشاندہی کے لئے انسان کی "حقیقت" جاننے کی ایک سعی کرنی پڑے گی کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہم ایک آزاد ہستی ہیں یا واقعیٔ ہمارا تعلق کسی بڑی بااختیار قوت سے بھی ہے جو اس کائنات کی اصل مالک ہے؟ کیا مُلکی قوانین سے اُوپر کچھ آفاقی اور اُلوہی قوانین بھی ہیں جن کی ہمیں پاسداری کرنی چاہئے؟ کیا انسان کسی برتر ہستی کو جوابدہ بھی ہے؟ کیا اس کائناتی نظامِ زندگی کو کوئی خفیہ نظام چلا رہا ہے؟

لہٰذا ہمیں انسان اور کائنات کے حقیقی تعلق کو سمجھنا ہوگا اور ہر بنُیادی سوال کا مکمّل منطقی اور عقلی جواب بغیر کسی "ہمیں نہیں معلوم" (we don't know) کے حاصل کرنا ہوگا۔ جب تک ہم یہ جوابات نہ حاصل کرلیں اور اپنے رویّے اسکے مطابق نہ اپنالیں ہم ایک اچھے سربراہ خاندان، اچھے شہری اور اچھے ملازم تو بن سکتے ہیں لیکن اس کائنات کے اچھے باشندے نہیں بن سکتے۔

اسی سلسلے میں ہم کچھ مزید حقائق کا مطالعہ کرتے ہیں جو عموماً ہماری توجہ سے محروم رہتے ہیں!

پوشیدہ یا مخفی، تصوّر

پوشیدہ یا مخفی Invisible کیا ہوتا ہے؟

عموماً لوگ کسی بھی محسوس نہ ہونے والی چیز کا وجود قبول نہیں کرتے کسی بھی ان دیکھی و پوشیدہ چیز

کے وجود کو جھٹلانا بہ نسبت اسے ثابت کرنے کے زیادہ آسان ہوتا ہے لیکن ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر انسان خود بھی ایک تصور یا Abstract ہوتا ہے لیکن اس کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ کسی ادارے جیسا کہ مائیکروسوفٹ microsoft کو ہم نہ چھو سکتے نہ دیکھ سکتے ہیں کیونکہ یہ اپنے اَثاثے اور افرادی قوت وغیرہ کے ذریعے پہچانا جاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں مل کر ہی اس کا غیر طبعی خاکہ بناتی ہیں، گویا مائیکروسوفٹ خود ایک تصور یا Imagination ہے لیکن طبعی طور پر اس کا اِظہار اُس کے اثاثہ جات کے ذریعے ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بڑے یقین سے اپنی ذات کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہر انسان صرف اپنے جسم کو ہی دکھا سکتا ہے اپنی شخصیت کو نہیں۔ مثلاً اگر کوئی کسی سے کہے کہ اپنے آپ کو دکھاؤ تو پہلے تو وہ شخص حیرت زدہ ہوگا کہ یہ کیا سوال ہے پھر جب وہ اپنی طرف اشارہ کرے گا تو جسم کے کسی حصے کی طرف اشارہ کرے گا، اگر اس سے کہا جائے کہ یہ تو تمہارا سینہ، چہرہ یا ہاتھ ہے تم کہاں ہو؟ تو یقیناً وہ اپنے آپ کو دکھانے سے قاصر ہی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان بھی درحقیقت اپنی شخصیت کے حوالے سے مخفی یا پوشیدہ Unseen ہے۔ اسے ایک کار کی مثال سے بھی سمجھتے ہیں، فرض کریں کہ اس کا برانڈ نام "ج" ہے اگر ہم برانڈ "ج" کے تمام پارٹس کھول کر علیحدہ کردیں تو "ج" غائب ہو جائے گی لیکن سارے پرزے موجود ہونگے یعنی "ج" ایک تصور ہے۔

روح

اب ذرا کمپیوٹر سسٹم پر ایک نظر ڈالیں اسکے دو حصے ہوتے ہیں ایک ہارڈ ویئر Hardware اور دوسرا سوفٹ ویئر Software اور ہر کمپیوٹر سسٹم بے جان ہوتا ہے جب تک کہ اس میں سوفٹ ویئر نہ ڈالا جائے۔ سوفٹ ویئر لوڈ ہوتے ہی کمپیوٹر سسٹم زندہ ہو جاتا ہے۔ اسطرح کمپیوٹر کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں ایک طبعی یا ظاہری اور دوسرا غیر طبعی یا پوشیدہ۔ سوفٹ ویئر کو ہم محسوس نہیں کر سکتے لیکن وہ تحریراً موجود ہوتا ہے جبکہ اس کی خصوصیات پوشیدہ ہیں۔ انسان کے بھی دو رخ ہیں، میں ایک شخص ہوں اور ایک نام رکھتا ہوں جب میں کہتا ہوں کہ "میں" تو درحقیقت ایک غیبی وجود کی حیثیت سے بات کرتا ہوں جو کہ ایک جسم کے ذریعے اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی میری ذات ایک Abstract ہے جو کہ "روح" بھی کہلاتی ہے گویا روح ایک سوفٹ ویئر ہے اور جسم ایک ہارڈ ویئر اور دونوں مل کر ایک جیتا جاگتا "انسان" بناتے ہیں۔ روح بھی ایک معمہ ہے لیکن ہم اپنے

مشاہدے کی بنیاد پر اس کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ روح مسلسل توانائی کو جنم دیتا ایک پراسرار مظہر ہے جس کی وجہ سے پورے جسم کے ہر عضو کو قوّت ملتی ہے اسی لیئے جب تک روح موجود ہے جسم کو توانائی ملتی رہتی ہے اور جیسے ہی یہ جدا ہوتی ہے جسم بے جان ہو جاتا ہے بغیر سوفٹ وئیر کے کمپیوٹر کی طرح۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کسی اچھوتی طرز کا حیاتی روبوٹ Biological Robot ہی ہے جس کا ہارڈ وئیر اور سوفٹ وئیر اور اعلیٰ وارفع اور اس کی ذہانت بھی سب مخلوق میں برتر ہے۔ سائنسداں جسم کے اندر موجود کسی روح کو نہیں مانتا کیونکہ اس کو ڈھونڈ detect نہیں پاتا مگر انسان کی ہستی کو مائنڈ mind کہتا ہے۔ روح کی کوئی سائنسی توجیہہ ہی زندگی کے راز سے پردہ اُٹھائے گی اور وہ وقت قریب ہی ہے جب جنیاتی سائنس Genetic Science انسانی جین میں چھپے ایسے خفیہ کوڈ دریافت کرلے جو غیر معمولی صلاحیّت یا روحانی قوّت Spiritual Power کا منبع Orignator ہوں اور وہ لمحہ زندگی اور کائنات کے بہت سے راز طشت ازبام کرنے کی طرف پہلا قدم ہوگا۔ اپنی پہچان کے سلسلے میں روح کے بعد اپنی شخصیت کے دوسرے پہلو یعنی جسم پر ایک دوسری طرح نظر ڈالتے ہیں کہ درحقیقت یہ ہے کیا؟

انسانی جسم

جسم کا بنیادی عنصر ایٹم Atom ہے اور انسان ایٹم ہی سے بنا ہے ایٹم ہی جسم کے مختلف اعضاء بناتے ہیں۔ ہر انسانی عضوٗ اپنے ساخت اور کام کے لحاظ سے بے مثال ہے اور ان تمام اعضاء کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے جو زندگی کو رواں رکھتا ہے۔ سب سے اہم عضوٗ ہمارا دماغ ہے جو ایک ایسا عجوبہ ہے جسے انسان ابھی تک نہیں سمجھ پایا۔ انسان زندگی اور کائناتی حقائق کا جو مشاہدہ کرتا ہے وہ دماغ کے واسطے سے کرتا ہے اسی واسطے سے کائنات ہمارے لیئے ایک حقیقت ہے یہی ہمیں بتاتا ہے کہ "میں کون ہوں" "مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ سوچتا ہے دریافت کرتا ہے گتھیوں کو سلجھاتا ہے سب سے بڑھ کر اس میں جذبات جنم لیتے ہیں جن کا اِنسان کو علم نہیں کہ یہ کیوں پیدا ہوتے ہیں اور کیسے ہمارے جسم اور چہرے کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان غیر طبعی جذبات کا ہمارے طبعی جسم پر اظہار اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ان دونوں میں رابطہ کا کوئی نظام تو موجود ہے مگر وہ کیا ہے؟ یہ ہمارا دماغ ہی ہے جس میں گزرتی زندگی کی معلومات جمع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک چھوٹے سے عضوٗ میں یہ صلاحیت ہے کہ برسوں کے واقعات محفوظ رکھتا ہے۔

نکتۂ فکر: (Point to Ponder) جسم پر ہمارا اختیار کہیں مکمل ہے کہیں محدود اور کہیں بالکل نہیں اور ہمارے تمام اعضاء دماغ کے ذریعے ہمارے ارادے کے طابع ہوتے ہیں۔لیکن یہ کس نے فیصلہ کیا کہ میرا اختیار میرے دل اور دورانِ خون اور دوسرے اندرونی نظام پر بالکل نہیں ہوگا لیکن پھیپھڑوں پر جزوی ہوگا؟ آخر وہ کیا ہے جو ہمارے عضو کو ہمارے طابع کرتا ہے اور یہ کیسا نظام ہے کہ میری انگلیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی چیز کو پکڑنا ہے یا چھوڑنا ہے یا یہ کہ کس موقع پر کتنی قوت استعمال کرنی ہے؟

شعور

انسان کا اہم وصف شعور ہے جو اس کو انسان ہونے کا احساس دلاتا ہے مگر انسان اپنی بے بہا ترقی کے باوجود اس قابل نہ ہو سکا کہ جان سکے کہ شعور درحقیقت ہے کیا اور یہ کس طرح کام کرتا ہے۔ ٹفٹس یونیورسٹی کے فلاسفر ڈینیل ڈینٹ اپنی کتاب Consciousness Explained میں لکھتے ہیں کہ،

ترجمہ "انسانی شعور بس آخری موجود راز ہے، راز وہ واقعہ ہوتا ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پہ غور کیسے کریں۔ ویسے تو اور بھی بڑے راز mysteries ہیں جیسے کائنات کی ابتدا، زندگی اور پیدائش کا عقدہ، کائناتی ڈیزائن کا عُقدہ، وقت، خلاء اور کششِ ثقل کے معمے ۔یہ سائنس کے لیئے محض لاعلمی ہی نہیں بلکہ مکمل عجوبہ ہیں۔۔۔شعور کے حوالے سے ہم ابھی تک شدید اُلجھاؤ کا شکار ہیں صرف تنہا شعور ہی بہت سے بڑے بڑے فلاسفروں کی زبان گُنگ کر کے مخمصے میں چھوڑ دیتا ہے اور بہت سے یہ سمجھتے ہیں کہ تمام رازوں میں شاید شعور کا راز کبھی نہ سمجھا جا سکے۔"

Ref: Daniel C. Dennett. Consciousness Explained (1991), 21-22.

یہ بحث ہمیشہ ہی رہی ہے کہ شعور کیسے کام کرتا ہے کیونکہ سائنسداں سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے دماغ میں بستے ہیں اور یہ تصور کہ "ہم" دماغ کے طبع عنصری سے جدا ہیں درحقیقت "روح" کی وکالت کرنے والے گروہ کا نقطۂ نظر ہے۔سائنسی نقطۂ نظر سے یہ سمجھانا کہ ہم کوئی تاثر کیسے لیتے ہیں بہت مشکل ہے کیونکہ بدقسمتی سے ہم اُس کو پرکھ رہے ہیں جو کہ خود ہم ہیں۔ دنیا کے بڑے فلاسفر اور سائنسداں شعور کو سمجھنے میں ناکامی کا برملا اعتراف کرتے ہیں اور ایک مستقل مخمصے میں مبتلا ہیں۔جدید ریسرچ کے زاویئے یہ واضح کرتے ہیں کہ اگر سائنسداں کسی نہ کسی طرح طبعی طور پر شعور کی تشریح کرنے کے قابل ہو بھی گئے تو بھی وہ صرف ایک انتہائی ترقی یافتہ سپر حیاتی سائنس

Super Biology کا انکشاف کریں گے جو ہمارے دماغ میں موجود ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں، جبکہ روح دماغ اور جسم کا تعلق طبعی طور پر ثابت ہونا تب بھی باقی رہیگا۔

انسانی اعمال

جسم اور روح یا مائنڈ کا مرکّب انسان ہے جو عمل پر قادر ہے اور عمل کی وضاحت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی عمل جو کہ کسی معیّن وقت میں ادا ہوتا ہے دراصل وہ نتیجہ ہوتا ہے ماحول کو جذب کرنے کی انسانی حواسِ خمسہ کی صلاحیت اور دماغ کے ذریعے ذات کے ردِعمل کا جو جسم کے ذریعے عملاً ظاہر ہوتا ہے۔ مذہب کے مطابق ہمارا ارادہ روح سے جنم لیتا ہے اور اس کی تکمیل جسمانی عمل کے ذریعے ہوتی ہے اسطرح اطراف میں مرتّب ہونے والے اِن اعمال کے اثرات عمل اور ردِعمل کا تسلسل ہیں جو کہ انسانی معاشرے میں اچھے اور بُرے اثرات چھوڑتا رہتا ہے جس کی بنا پر انسان اپنے اعمال اور ان کے نتیجے کے ذمہّ دار بنتے ہیں۔

دماغ اور اعصاب

ہم اس وقت جو کچھ پڑھ رہے ہیں یا غور و فکر کرتے ہیں وہ دماغ کی وجہ سے ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ درحقیقت دماغ ہے کیا؟ اور کس طرح کام کرتا ہے۔

دماغ کو کائنات کا پیچیدہ ترین آلہ Most Complex Device سمجھا جاتا ہے۔ دماغ اوسطاً ایک اعشاریہ تین کلوگرام وزنی سیکڑوں ارب خاص سیل Cell نیورون Neuron پر مشتمل ہوتا ہے جن میں کمپیوٹر کے ٹرانسسٹر سرکٹ کی طرح برقی خصوصیات Electrical Properties ہوتی ہیں۔ ٹرانسسٹر سرکٹ کی طرح یہ نیورون آپس میں کھربوں کنکشن سے جڑے ہوتے ہیں ان میں ایسی دوطرفہ نبضیں ہوتی ہیں جن سے سگنل گزرتے ہیں۔ دو نیورون میں باہم تعلّق بائیوکیمیکل جنکشن سے ہوتا ہے اسطرح سگنل ایک سے دوسرے نیورون میں آیون Ions کے جاری ہونے سے منتقل ہوتے ہیں۔ روشنی آنکھ کے لینس کے ذریعے بیرونی دنیا کا ایک عکس آنکھ کے پردے پہ بناتی ہے جس کو عصبِ بصری Optic Nerve یا بصری اعصاب برقی سگنل کی صورت میں دماغ میں لیجاتے ہیں پھر دماغ حواس کے ذریعے ان برقی اشاروں Electrical Signals کا تعیّن کر کے ایک تصویر ذہن کے پردے پر بناتا ہے۔ یہی تصویر کسی بھی شخص کے لیئے بیرونی دنیا کی منظرکشی ہوتی ہے اور وہی انسان کے لیئے حقیقت ہوتی ہے گویا دماغ ایسا واسطہ یا لینس Lense

ہے جو انسان کو بیرونی دنیا دکھاتا ہے۔

حواس

ہم بحثیت روح اور جسم کی اکائی کے جو بھی ماحول سے اخذ یا جذب کرتے ہیں درحقیقت ہمارے حواس اور اعصاب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا پانچ بنیادی حواس ہیں اور ہر مذکورہ حسِ کے پیچھے ایک متعیّن نظام ہے جو کسی چیز کا ایک حسّی تاثر دیتا ہے مثلاً خوبصورتی یا بدصورتی درحقیقت پہلے سے ہی ہمارے ذہن یا روح میں ایک مقفّل تصوّر یا مظہر Locked Phenomenon ہے جو کسی بیرونی طبعی ساخت کو ایک نام یا احساس Perception دیتا ہے۔ یعنی کوئی بھی بیرونی تصویر یا ساخت جب ہمارے ذہن میں موجود نا قابلِ تبدیل تاثر fixed perception پر منطبق یا چسپاں ہو جاتی ہے تبھی ہم اسے ویسی حقیقت سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھیں کہ ہمارے معلوم ذائقے بھی محدود ہیں، اگر زبان ہم کو کڑواہٹ نہ بتاتی تو ہم اس ذائقے سے کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ ہمارے رویّے بھی ان تاثر پر منحصر ہوتے ہیں جبکہ مختلف لوگوں میں اندرونی متعیّن تاثر مختلف بھی ہوتا ہے جو اختلاف رائے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مختصراً حواس ہماری ذات اور بیرونی دنیا کے رابطہ کار ہیں۔ ہم جو بھی نتیجہ اخذ کرتے ہیں یا فیصلہ کرتے ہیں وہ ہماری ذات کو دماغ کے ذریعے حواس کا پیغام ہوتا ہے اور ہمارے یقین کی بنیاد یہی پیغام ہوتا ہے۔ اس لئے حواسِ خمسہ کا آفاقی ہونا اور اربوں انسانوں کا کسی تاثر Perception پر ہم خیال ہونا مربوط نظام کے علاوہ ناممکنات میں سے ہے۔ ہم کسی بھی معلوم حقیقت کو اپنے حواس کے ذریعے "وقت اور وجودیت" کے پیرائے میں ہی بیان کر سکتے ہیں لہٰذا ہم کسی ایسی حقیقت کے بارے میں نہیں جان سکتے جو اس کائناتی ماحول سے اوپر ہو اور ہمارے حواس کی پہنچ سے باہر ہو۔

انسانی نظام کی پیچیدگی

کمپیوٹر سسٹم اس وقت بیدار ہوتا ہے جب تین بنیادی ارکان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں یعنی ہارڈ وئیر، سوفٹ وئیر اور توانائی اور ان میں سے کسی بھی ایک کی غیر موجودگی کمپیوٹر سسٹم کی نیند یا موت ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اگر ہم کمپیوٹر سسٹم میں سوفٹ وئیر اور ہارڈ وئیر کا تعلّق سمجھنا چاہیں کہ کس طرح احکامات کا مجموعہ پروگرام Program ایک نیم طبعی شکل اختیار کر کے اسکرین پہ ظاہر ہوتا ہے تو عام انسانی ذہن سمجھنے سے لاچار ہو جائیں گے کیونکہ اس نظام کو سمجھنے کے لیے اِس فیلڈ کا

ایکسپرٹ ہونا یا غیر معمولی ذہین ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح انسان بظاہر روح اور جسم کا مرکّب ہے مگر خود اپنے شعور اور خواہش کی ماہیت کے بارے میں لاعلم ہے کہ انکی حقیقت کیا ہے اور خواہش کیسے پیدا ہو کر طبعی نتائج مرتّب کرتی ہے یعنی اس کا یہ ارادہ کہ وہ گلاس اُٹھائے کس اندرونی نظام یا Mechanism کے تحت تکمیل پذیر ہوتا ہے؟ اور کس طرح ہاتھ اور انگلیوں کو پتہ چلتا ہے کہ کتنی قوّت استعمال کرنی ہے۔

خواہش اور خیال

خواہش کو ذہن کی ایک کیفیّت سے زیادہ نہیں سمجھا جا سکا اور نہ ہی خیال آنے کی وجہ سمجھی جا سکی۔

خواہش کیا ہے؟ خواہش کا نقطۂ آغاز کیا اور کہاں ہے؟

ہماری خواہش اور دماغ کا تعلّق کیسا اور کیا ہے؟

کیا خیال کی پرواز لامحدود ہے؟

اس ضمن میں تمام جدید ریسرچ دماغ میں نہایت پیچیدہ نظام ہی عیاں کرتیں ہیں یعنی ہم انتہائی پیچیدہ نظام ہیں۔ ہم فرض تو کرتے ہیں کہ ہماری سوچ اور اَفکار لامحدود ہیں مگر اس مفروضے کا کوئی سائنسی جواز ہمارے پاس نہیں کیونکہ ہمارے تخیّلات صرف کائناتی پیرایوں کے بموجب ہی ہیں۔

انفرادی علم کی محدُودیت

روزمرّہ کا مشاہدہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مختلف افراد میں ذہانت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ جن کو ہم کم علم، احمق اور عقلمند وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ ایک کم علم یا احمق بھی مناسب تعلیم و تربیت حاصل کر کے عقلمند بن جاتا ہے۔ خیالات اور عمل کا ارتکاز، مقصد کی لگن اور مسلسل جدوجہد جو کسی ایک مقصد کے لئے جاری رہے ایک انسان کو کسی بھی شعبے کا استاد یا ایکسپرٹ بنا دیتی ہے اور انسان علوم کے خزانے حاصل کر کے ماہر کہلاتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ایک شخص کتنا ہی علم حاصل کر لے وہ مجموعی انسانی علوم کا ایک انتہائی معمولی سا حصہ ہوتا ہے اور کسی خاص شعبے کی حد تک ہی محدود ہوتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کوئی بھی شخص جو کسی ایک شعبے میں درجۂ اُولیٰ حاصل کرتا ہے وہ درحقیقت اُسی شعبے کا اسیر بن جاتا ہے اور دوسرے علوم کی باریکیوں کو نہیں سمجھ پاتا۔ ایک ماہر دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں بڑی حد تک لاعلم رہتا ہے بلکہ اطراف کے ماحول کو اور اس کی تمام جہتوں Dimensions اور ظاہری رُخوں کو مِن وعَن قبول کرنا

اُسکی مجبوری ہو جاتی ہے گویا ایک ڈاکٹر کسی انجینئر کے علم اور ذہن کو نہیں سمجھ سکتا وہ اُسکے علم کو جوں کا توں ہی قبول کرتا ہے۔

مجموعی دانش اور تحقیق

اس بحث میں پڑے بغیر کہ ہمارے دماغ کا کتنا حصہ کام کرتا ہے ہم اس کو صرف ایک عام عضو کی طرح لیتے ہیں۔ ہمارے جسم کی طاقت اور پٹھوں اور ہڈیوں کی مضبوطی کا تعلق ان کے مناسب استعمال اور ورزش وغیرہ سے ہے۔ دماغ بھی اسی طرح کام کرتے ہیں جیسا کہ کوئی دوسرا عضو جبکہ دماغ کی ورزش فکر اور غور ہے۔ ہم جتنا کسی بات پر غور کرتے اور نتائج اخذ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں ہمارے خیالات کی پرواز اسی مناسبت سے بلند تر ہوتی رہتی ہے۔ سو ہر وہ طبعی و غیر طبعی مظہر جو انسان کو غور پر مجبور کرے در حقیقت انسان دوست ہوتا ہے اور فکر کی بلندی کا واسطہ بنتا ہے۔ ایک مضبوط ذہنی رویہ فکر، غور اور تجربات کا نتیجہ ہی ہوتا ہے۔ ایک فلسفی اور مفکر کا ذہنی معیار عام لوگوں کے مقابلے میں بلند ہوتا ہے کیونکہ وہ فکر کی بلند منزل پر ہوتے ہیں ان کا دائرہ فکر اور نظر وسیع ہوتی ہے۔ انسان کی کل دانش کی مثال ایک نہایت بلند عمارت کی سی ہے کہ جس کے نچلی منزلوں پر عام انسان بستے ہیں وہاں ان کا دائرہ نظر بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ غور کرنے والا اوپر کی منزلوں پر چڑھتا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دائرہ نظر وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے خیالات کی مثال درخت کی سی ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ ہمارا ذہن ایک جنگل یا باغ کی طرح ہے کہ جس میں خیالات کے چھوٹے بڑے پودے اور درخت ہیں۔ ہر نیا اور اچھوتا خیال شروع میں ایک پودے کی طرح ہوتا ہے پھر مسلسل غور و فکر کی آبیاری سے وہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک تناور اور بلند درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جتنی تفکّر کی شدت اور ارتکاز ہوتا ہے اتنا ہی بلندی پر یہ درخت پروان چڑھتا ہے لیکن یہ خیال رہے کہ کوئی خیال یا نظریہ یا شعبۂ علم کتنا ہی علم سے بھرپور ہو جائے وہ محض ایک شعبہ ہی رہتا ہے یا تصوّرات و علوم کے باغ میں محض ایک درخت جو کہ زمین کے ایک بہت ہی چھوٹے حصہ پر جما ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کسی بھی شعبہ میں چاہے کتنی معلومات حاصل کر لیں وہ انسانی علوم اور دانش کے ذخائر میں محض ایک حصہ ہوتا ہے نہ کہ کُل علم۔

مسلسل سوچ، غور و فکر انسان پر نئی جہتیں آشکارا کرتی ہے لیکن کچھ مواقع ایسے آتے ہیں جہاں پر جا کر انسانی سوچ معطّل ہو جاتی ہے کہ اس سے آگے کچھ واضح نہیں ہو رہا ہوتا۔ یہ سوچ اور تخیّل کی

وہ رکاوٹ ہے جس کو انسان مسلسل فکر کے ارتکاز سے توڑتا ہے۔ ریسرچ وہ عمل ہے جو کہ فکری رکاوٹوں کو توڑ دیتا ہے اور انسان کو نئے طبعی قوانین اور حالات سے واقف کرتا ہے۔ یہ نئی جہتیں New Dimensions دراصل وہ چھوٹی کھڑکیاں ہیں جو ایک بڑے ماحول کی طرف رسائی دیتی ہیں۔

جیسا کہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ انسان ایٹم سے بنا ہے تو پھر ہمارے جسم کے علاوہ ہمارے خیالات اور جذبات، ہمارے حواس اور شعور کا منبع بھی ایٹم ہوا۔

سوالات یہ ہیں:

ایٹم میں زندگی کیسے آتی ہے؟ ایٹم میں ایسا کیا ہے کہ شعور اور جذبات ابھر آتے ہے؟

زندگی میں شعور، جذبات اور حواس کیسے عیاں ہوتے ہیں؟

ہمارا جسم کس کے طابع ہے؟ دماغ کے یا روح کے؟

دماغ یا روح کا ناظم کون ہے؟

انسانی شعور، خواہش اور عمل میں کیسا اور کیا رشتہ ہے؟

انسانی شعور اور جذبات کا نظام آفاقی کیوں ہے؟

اور سارے انسان ایک ہی طرح کیوں نمو پذیر ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ

ان تمام سوالات کے درست اور حتمی جوابات اسی وقت حاصل ہونگے جب ہم یقین کے ساتھ جان لیں کہ اس کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی اور اسکا اصل حاکم کون ہے؟

فطرت، انسان یا خدا!

باب ۶

کائنات

ہمارے اطراف میں موجود بہت سے حیرت انگیز آثار اور مظاہر ہیں جن میں سے اکثر کو معمول سمجھ کر ہم ان کے پس منظر اور حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ آیئے دیکھتے ہیں وہ کیا ہیں۔

روشنی

یہ برقی مقناطیسیّت (Electromagnetic) ہے جس کا بُنیادی عنصر فوٹون photon ہے یہ لہروں کی شکل میں برق رفتاری سے سفر کرتی ہے اور جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ صرف اسی کا مرہونِ منّت ہے۔ یہ حیرت زدہ کرنے والی حقیقت ہے کہ روشنی خود نظر نہیں آتی لیکن ہم کو تمام اشیاء دکھاتی ہے۔ روشنی اور ہمارے حواسِ خمسہ کے درمیان ایک تعلّق ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات ہمیں موجود لگتی ہے۔ یہ وہ مرکزی نقطۂ وجود ہے جس کے اطراف پوری زندگی اور "وقت" کی گردش ہوتی ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق یہ کائنات میں نیوٹرینو کے بعد تیز ترین رفتار کی حامل ہے۔ روشنی کے بغیر دن اور رات کا وجود نہیں کیونکہ ہمیں دن کا روشن نظر آنا دراصل اِن غیر مرئی شعاعوں کا فضا میں موجود خاک کے ذرّوں سے ٹکرانا اور پھر ہماری آنکھوں کے ذریعے دماغ تک پہنچنا ہوتا ہے۔ یہ عجیب مظہر ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ ہم ان حیرت انگیز چیزوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کو فطرت کی عطا سمجھ کر ہی مطمئن رہتے ہیں۔

توانائیاں

توانائی کائنات کے اجزائے ترکیبی میں بہت ہی اہم ہے اس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس توانائی کی تعریف اس طرح کرتی ہے کہ یہ مادّے کی ایک صلاحیت ہے جس سے کہ کام کیا جاتا ہے۔ یہ روشنی، حرارت، الیکٹریکل اور میکینکل اشکال میں ہوتی ہے۔ سائنس توانائی کے اصل مخرج یا اس کے وجود کے ماخذ (Origin) کے بارے میں لاعلم ہے۔ آپ بڑے سے بڑے سائنسدانوں کا مطالعہ کرلیں وہ توانائی کے حوالے سے مبہم نظریات کے حامل نظر آتے ہیں وہ سمجھتے

ہیں کہ زندگی کے لیے توانائی ضروری ہے لیکن اس کا ماخذ انہیں ابھی تک نہیں مل سکا۔ سائنسداں اس کو بھی ایک ماحولیاتی اتفاق Environmental Coincident قرار دیتے ہیں۔

ایٹم اور زندگی

سب سے عام فہم مثال ایٹم کی ہے۔جس میں الیکٹرون Electron کی مسلسل گردش اس بات کی غماز ہے کہ اس میں توانائی کا لامحدود ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن یہ لامحدود توانائی وہاں پر کیسے آئی اور کیسے موجود ہے یا کہاں سے آتی رہتی ہے یہ سائنسدانوں کے لئے ایک معمہ ہے۔ مگر جب ہر حرکت کے پیچھے طاقت یا توانائی، خواہش اور شعور یا اِرادے کا ہونا لازمی ہے تو پھر:

کیا ایٹم کوئی شعور رکھتا ہے؟ کیا ایٹم میں توانائی اس کی خواہش کے طابع ہے؟

ایٹم میں یہ کیسا شعوری نظم ہے جو پوری کائنات میں وجود کا جواز ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ کسی بھی قسم کی مسلسل حرکت کیلئے توانائی، شعور اور ارادے کی تکون لازمی ہوتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ایٹم کے اندر کسی اجنبی طرز کا شعور ہو جو ہمارے علم سے بالاتر ہو! اب یہ سائنسدانوں پر لازم ہے کہ ایٹم کے اندر موجود ان تینوں کے درمیان کسی ایسے رابطہ کا نظام تلاش کریں یا پھر کم از کم کوئی مستند اور ثابت شدہ توانائی کا ماخذ بتائیں تبھی اس کائنات اور زندگی کا کوئی مناسب سائنسی جواز مل سکے گا۔

وقت

وقت کیا ہے؟

کوئی بھی اسکالر یا جدید سائنسدان وقت کی صحیح تعریف نہیں کر سکا کیونکہ یہ ایک اچھوتی پہیلی ہے۔ وقت کی کتنی بھی جدید سائنسی توجیہات پڑھ لیں وہ صرف موجود ماحول Present Environment سے متعلق انسانی احساس کی تشریح ہے مثلاً: وقت ایک جانا پہچانا ذریعہ ہے۔جس کے ذریعے انسان اطراف و کائنات کو محسوس کرتا اور اسکا جائزہ لیتا ہے۔

وقت ایک پیمانہ ہے۔جس میں ماضی، حال اور مُستقبل کے واقعات درج ہوتے ہیں۔

وقت حرکت اور طاقت کی موجودگی کا نام ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وجہ یہی ہے کہ ہم انسان مجبور ہیں کہ دن اور رات کے نظام کے حوالے سے ہی وقت کی تشریح کریں کیونکہ ہم وقت کو اپنے اطراف ہر لحظہ بدلتے ہوئے ماحول اور معاملات کے حوالے ہی سے پہچانتے ہیں۔ وقت کی پُراسراریت کی تشریح بھی مُشکل ہے۔ غالبًا وقت ایک "سپر ہائی

ٹیک "پروڈکٹ اور انسان کے حوالے سے کائنات کے پُر اسرار اجزا میں سے ایک ہے دن اور رات جس کی ذیلی طبعی شکلیں ہیں۔ جدید سائنس کے مطابق وقت کی مختلف جہتیں Dimensions اور بدلتے پیمانے ہیں جو کہ خلا، کشش ثقل، رفتار اور حواسِ خمسہ سے منسلک ہیں۔ ایک عام انسان وقت کی تشریح مسلسل بدلتے ہوئے دن اور رات کے حوالے سے ہی کرتا ہے۔ ہم اپنے روزمرّہ کے کام کاج کو دن اور رات کے تناظر میں ہی پلان کرتے ہیں لیکن اس طرف توجہ نہیں دے پاتے کہ یہ عظیم الشان نظامِ لیل ونہار آخر کیسے اور کیوں چل رہا ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق یہ نظام طبعی قوانین کا پرتو ہے یعنی کششِ ثقل, رفتار اور گردش وغیرہ کہ جس نے نظامِ شمسی کو جنم دیا۔
لیکن ذرا نظامِ شمسی پہ غور تو کریں کہ یہ کیا ہے؟

نظامِ شمسی

امریکی خلائی ادارے ناسا کے حوالے سے درج ذیل معلومات آپکی دلچسپی کا سامان ہونگی۔

Ref: http://solarsystem.nasa.gov/planets/profile.cfm?Object=SolarSys

(Information re-arranged...)

۱۔ نظامِ شمسی سے مراد سورج اور اُسکے گرد گردش کرتے ہوئے سیارے اور اجرامِ فلکی ہیں۔
۲۔ ہمارا نظامِ شمسی 4.6 ارب سال پہلے بنا۔
۳۔ یہ نظام کہکشاں کا حصہ ہے جسے ثریا Milky Way کہتے ہیں۔
۴۔ سورج کے اطراف آٹھ سیارے اور بے شمار چھوٹے اجرامِ فلکی گردش کرتے ہیں۔
۵۔ سورج سے زمین کا فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل یا پندرہ کروڑ کلومیٹر ہے۔
۶۔ یہ نظام کہکشاں کے ایک بڑے بازو میں واقع ہے۔
۷۔ کہکشاں میں اربوں نظامِ شمسی ہیں۔
۸۔ کائنات میں اربوں کہکشائیں ہیں۔

ان مختصر معلومات سے نہ صرف نظامِ شمسی بلکہ کائنات کی ناقابلِ تصوّر وسعت و ہمہ گیریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ صرف ہمارا نظامِ شمسی نہایت ہی وسیع و عریض ہے کہ زمین اور دوسرے کئی سیارے لاکھوں کروڑں میل کی دوری پر ہوتے ہوئے سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں جس میں سورج کی کششِ ثقل کی قوّت کا تصوّر اور پیمائش بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس نظامِ شمسی کا آخری کنارہ سورج سے 1.87 روشنی یا نوری سال دور ہے (ایک روشنی سال کا مطلب 1,86,000 میل فی سیکنڈ

کی رفتار سے ایک سال کا سفر ہوتا ہے)۔

ذرا غور کریں کہ ہمارے اطراف کس قدر عظیم الشان نظام مسلسل گردِش کر رہا ہے جو ایٹم سے لیکر نظامِ شمسی تک اِنتہائی مَربوط ہے کہ ایٹم جو اتنا چھوٹا کہ خوردبین سے بھی نظر نہ آئے اور نظامِ شمسی اِتنا وَسیع کہ عام دُوربین بھی نہ دکھا پائے اور کبھی اِس نظام میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ آخر کسی پلاننگ Planning کے بغیر یہ نظامِ شمسی کیسے ممکن ہوا؟ انسان کائنات کی سب سے ذہین مخلوق ہے اورانسانی دماغ کائنات کی سب سے پیچیدہ حیاتیاتی آلہ Complex Biological Apparatus ہے۔انسان نے وقت ناپنے کے لیئے گھڑیاں بنائیں جو خراب بھی ہو جاتی ہیں لیکن قدرتی وقت کی رفتار میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آتا۔اب اگر سائنسدانوں کے مطابق نظامِ شمسی کی خالق فطرت Nature ہے تو وہ انسان سے زیادہ ذہین نہ ہوئی؟ کیا ہماری عقل یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ:

ذہانت تو آشکارہ ہو لیکن پسِ پردہ ہستی نہ ہو؟

کششِ ثقل

کششِ ثقل gravity کی اصلیت بھی سائنسدانوں کے لیئے ایک معمہ ہے جو پوری کائنات میں ہر جگہ مختلف جہتوں Parameter/Dimensions اور رُخوں کے ساتھ کارفرما ہے۔ اس کی پراسراریت کا اس سے اندازہ لگائیں کہ کائنات کے حوالے سے پارٹکل فزکس کا معیاری نمونہ Standard Model of Particle Physics کششِ ثقل کے بغیر ہی بنا کیونکہ یہ فنّی طور پہ اس میں فِٹ نہیں بیٹھتی! کششِ ثقل کو منتقل کرنے والا پارٹکل گریویٹون Graviton بھی ابھی تک راز ہی ہے۔ کائناتی راز کے سائنسی دریافتوں کی حالیہ پیش رفت بھی بہت دلچسپ نتائج کی نوید ہو سکتی ہیں۔اس میں ایک ہگز بوسون ہے۔

ایٹم میں وزن

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ ایٹم جو نظر نہیں آتا اس سے بنی چیزیں نظر کیسے آتی ہیں اوران میں وزن کیسے آتا ہے۔سائنسدانوں کے لئے ہمیشہ سے ایک مسئلہ یہ رہا ہے کہ ایٹم میں مادّہ mass کیسے آتا ہے کیونکہ الیکٹرون پروٹون وغیرہ تو توانائی Energy ہیں۔ایک سائنسداں پیٹر ہگز Peter Higgs نے یہ نظریہ دیا کہ پوری کائنات میں ایک نامعلوم فیلڈ پھیلی ہوئی ہے جس کو چھونے سے

ایٹم میں مادّہ آتا ہے۔اس ماحول یا فیلڈ کو ہگز فیلڈ Higgs Field کا نام دیا گیا ہے۔ جدید تجربات سے جو ہیڈرون کولائیڈر Hadron Collider سے ۴ جولائی ۲۰۱۲ کو کیے گئے اس پارٹیکل کی موجودگی کی تصدیق ہوئی ہے جسے ہگز بوزن پارٹیکلز Higgs Boson Particles کا نام دیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اسے خدائی پارٹیکل God Particle بھی کہتے ہیں۔ گویا ہگز فیلڈ ایک توانائی کی فضا ہے جو پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے جب کوئی پارٹکل اس فیلڈ میں سے گزرتا ہے تو اُسے مادّہ ملتا ہے۔اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے پانی میں تیرنے والے کے جسم پر پانی لگ جاتا ہے۔سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اسکی مزید چھان بین فطرت کے راز عیاں کریگی ابھی اس میں کچھ ابہام بھی ہیں جو مزید تحقیقات سے ہی واضح ہونگے لیکن یہ ایک بڑی دریافت ہے اور سائنسدانوں کے خیال کے مطابق کائنات کی تخلیق کے وقت ہونے والے بگ بینگ Big Bang کی وجہ یہی پارٹیکل ہوسکتا ہے! مزید یہ کہ یہ کائنات سے پہلے یعنی عدم کی خبر بھی دے سکتا ہے۔
اب ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ:

کیا انسانوں کے عقائد اور نظریات پر اثر انداز ہونے والے اہم ترین سائنسی نظریات مکمل اور غلطیوں سے مبرّا ہیں؟

باب ۷

سائنسی نظریات کا عمومی جائزہ

کامن سینس بنیادی عملی معلومات کا وہ معیار ہے جو ایک صاف ستھری اور محفوظ زندگی گزارنے کا سلیقہ دیتا ہے۔ عام عقل وہی ہوتی ہے جو مضبوط شواہد پر مبنی کسی بھی صورتحال میں ایک بہتر فیصلہ کرے۔ آئیں تو پھر ہم اس نظامِ کائنات اور زندگی کو عام انسانی سوجھ بوجھ commonsense سے ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بنیادی سوالات کے حوالے سے ہمارا موضوع کائنات کی ابتدا اور انسان کی تخلیق ہی ہے لہٰذا ان دو حوالوں سے یہاں ہم سائنسی نقطہ نظر کا عام فہم جائزہ لیتے ہیں۔

قوانین فطرت اور نظریات

قوانینِ فطرت مستحکم اور ناقابل تبدیل ہوتے ہیں جبکہ نظریہ Theory محض انسانی مفروضہ hypothesis ہوتا ہے جو کہ مختلف تجربات سے ہی صحیح ثابت کی جا سکتا ہے یعنی تھیوری یا نظریہ کبھی بھی نئے شواہد کی روشنی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ قوانینِ فطرت ایک حقیقت ہیں جبکہ کوئی بھی نظریہ نئی معلومات کے حصول پر مسترد یا تبدیل ہو سکتا ہے۔

جدید سائنسی نظریات کا نچوڑ یہی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے کوئی ارادہ کارفرما نہیں یہ خود بنی، اس طرح انسان ہی کائنات میں سب سے زیادہ ذہین مخلوق ہوا۔ صورتحال یہ ہے کہ سائنسداں موجودہ علم کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں کہ آئندہ ایسی کسی دریافت کا امکان نہیں جو کسی مابعد الطّبعیاتی مظہر Paraphysical Phenomenon کو ثابت کر سکے بلکہ سائنس خدا کے بغیر کائنات کے ہر پہلو کی تشریح کرنے کے قریب ہے! ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک غیر منطقی نقطۂ نظر ہے کیونکہ مستقبل کی دریافتوں کا تو کسی کو پتہ نہیں لہٰذا ایسے تمام نظریات جو ابھی تک قوانین کی شکل اختیار نہیں کر پائے مستقبل کے رحم و کرم پر ہی ہیں اور کسی بھی وقت کسی انقلابی دریافت کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء اور کائنات کی ابتدا سے متعلق کوئی بھی نظریہ کل نئی معلومات کی بنیاد پر کیوں تبدیل نہیں ہو سکتا؟

بگ بینگ

کائنات کی بے حد گھمبیر اور پیچیدہ ساخت کو سمجھنے کی جستجو میں سائنسداں مشہور بگ بینگ تھیوری لائے ہیں کہ کائنات ایک عظیم دھماکے سے اچانک وجود میں آ گئی!

Big bang proponents suggest that some 10 billion to 20 billion years ago, a massive blast allowed all the universe's known matter and energy-even space and time themselves-to spring from some ancient and unknown type of energy.

http://science.nationalgeographic.com/science/space/universe/origins-universe-article/

بگ بینگ کا نظریہ پیش کرنے والے کہتے ہیں کہ ۱۰ سے ۲۰ ارب سال پہلے کسی انجانی اور قدیم توانائی سے اُبھرنے والے ایک بہت بڑے دھماکے کی وجہ سے تمام موجود مادہ، توانائی اور وقت وخلاء وجود میں آئے۔

بگ بینگ سے تخلیق

بگ بینگ کی حمایت میں سائنسدان ہاکنگ اپنے طور پر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ:
قانونِ کشش ثقل کی موجودگی میں کائنات کچھ نہ ہونے کے باوجود وجود میں آسکتی ہے۔ اس سائنسدان کو بلاشبہ دورِ حاضر کا عظیم سائنسدان سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب گرینڈ ڈیزائن میں لکھتے ہیں:

"Because there is a law such as gravity, the universe can and will create itself from nothing. Spontaneous creation is the reason there is something rather than nothing, why the universe exists, why we exist,"Hawking writes."It is not necessary to invoke God to light the blue touch paper and set the universe going."

" کیونکہ ایک قانون موجود ہے جیسے ثقل، تو کائنات نہ صرف خود بخود اپنی تخلیق کرسکتی ہے بلکہ کرے گی۔ یہ اچانک تخلیق ہی ہے کہ یہاں کچھ نہ ہونے کے بجائے کچھ ہے، اسی سے کائنات ہے اور اسی سے ہم موجود ہیں۔ ہمیں کسی خدا کو پکارنے کی ضرورت نہیں کہ وہ فلیتے سے کائنات کو رواں دواں کردے!"

یہ انتہائی لایعنی بات دنیا کا تسلیم شدہ سب سے عظیم سائنسدان کہہ رہا ہے اور عام لوگ اسے سن کے اس لئے یقین کرلیتے ہیں کہ ایک قابل انسان کہہ رہا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔

اب ذرا اس نظریہ کی کمزوری پر نظر ڈالیں کہ جب کچھ نہیں تھا تو عدم میں مادّے کی غیر موجودگی میں قانونِ ثقل کیسے موجود ہوا؟ کیونکہ کشش ثقل تو مادّہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس قانون کی موجودگی میں مذکورہ ماحول یعنی عدم یا نیست Nothing کیسے ہوا؟ بگ بینگ سے قبل کچھ بھی نہیں

تھا۔ اگر ایسا ہی تھا جو کہ یقیناً ہو بھی سکتا ہے تو پھر کچھ سوالات بھی جنم لیتے ہیں یعنی کہ سائنس کے حوالے سے کچھ نہ ہونا Nothing کیا ہے اور Nothing کیسے Thing میں ظہور پزیر ہوئی یعنی عدم سے موجود۔ پھر مادے کی حقیقت اور اس کے منبع کے حوالے سے بھی سوالات اُٹھتے ہیں کہ آخر اتنا کائناتی مادہ کہاں سے آگیا پھر وہ قوت جس نے اتنا عظیم دھماکہ کیا وہ کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ اور پھر کہاں چلی گئی؟ اور طبعی قوتوں Forces of Nature کا منبع کیا ہے؟ یہ فطری قوتیں Forces of Nature کہاں سے اُبھرتی ہیں؟

آئیں بگ بینگ کے نظریئے کے حوالے سے اٹھنے والے چند ضروری نکات کا غیر علمی اور کامن سینس سے جائزہ لیں۔ اس تھیوری کے مطابق بگ بینگ کے بعد کائنات میں شدید گرم ماحول تھا اور درجۂ حرارت بے انتہا تھا کہ تمام اجرام فلکی دہک رہے تھے جو بعد میں رفتہ رفتہ اربوں سال میں ٹھنڈے ہوئے یہاں تک کہ کیمیائی عمل سے پانی کا ظہور ہوا جس سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اب یہاں ایک عجیب مخمصے والی صورتحال سامنے آتی ہے۔ اب اگر ہم اس مظہر کو ہر سائنسی توجیہہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک عام انسان کی اوسط ذہانت سے دیکھتے ہیں تو عام طبعی قوانین کے تحت کوئی گرم چیز اسی وقت ٹھنڈی ہوتی ہے جب وہ کسی ٹھنڈے ماحول یا چیز سے متصل ہو۔ تھرماس میں موجود گرم یا ٹھنڈی اشیاء کا رابطہ باہر سے منقطع کیا جاتا ہے یا ایک خلاء تخلیق کیا جاتا ہے تبھی وہ اپنا درجۂ حرارت برقرار رکھتی ہیں۔ اطراف میں خلاء کا ہونا تو ضمانت ہے کہ درجۂ حرارت یکساں رہے گا! بگ بینگ تھیوری میں یہ ایک بڑا جھول ہے کہ اجرام فلکی کس قانون کے تحت ٹھنڈے ہوئے جبکہ وہ Big Bang کسی بھی وقت کے ماحول میں وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ سائنس کے مطابق وقت اسکے بعد شروع ہوا۔ سائنسی نظریئے کے مطابق وہاں کچھ نہیں تھا اور کچھ نہیں میں کوئی حرارت یا ٹھنڈک بھی نہیں ہوتی! اگر وہاں ٹھنڈک تھی تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ بگ بینگ سے باہر کچھ اور بھی تھا۔ بگ بینگ کے بعد کائنات کی تخلیق وقوع پذیر ہونے کے لیئے یہاں منطقی طور پہ ایک یخ ماحول کی موجودگی سائنسی قوانین کی پیروی میں لازم ہے ورنہ اجرام کبھی ٹھنڈے نہ ہوتے۔ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ماحول یخ تھا تو وہ کسی برتر ماحول سے منسلک یا اسکا حصہ ہوگا، سوال یہی ابھرتا ہے کہ وہ برتر ماحول کیا تھا؟ مزید یہ کہ کائنات کے لیئے جگہ Space کہاں سے آئی؟ جگہ Space کا ہونا بذاتِ خود ایک فزیکل وجود ہے خواہ آپ اسے خلاء کا نام ہی دیں ورنہ

وہ عدم اور nothing ہے جبکہ عدم کا مطلب فزکس یا طبعیات کی نفی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کے پھیلاؤ کی وجہ سے تپش کم ہوئی تو مزید یہ کہ کائنات کا پھیلنا کس ماحول کے اندر ہو رہا ہے یعنی کائنات کی سرحد کے باہر کیا ہے۔ کیا وہ ٹھنڈا ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟ اب یہاں یقیناً سائنسدانوں نے اسکی سائنسی توجیہات دی ہونگی جو عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہی ہونگی۔ یہاں قرین قیاس یہی ہے کہ بگ بینگ ایک پہلے سے تخلیق شدہ ماحول (وجودیت) کے اندر وقوع پذیر ہوا۔

مصنوعی بگ بینگ

ہیڈرون کولائیڈر: Hadron Collider

ایک خطیر رقم خرچ کر کے کائنات کی ابتداء سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک مصنوعی Big Bang کا اہتمام کیا گیا ہے جس کی تعمیر میں انسانی تاریخ کی انجینیئر نگ کی عظیم الشان کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ اس کا مقصد طبعیات کے ناحل شدہ سوالات کا جواب تلاش کرنا ہے کہ کائنات کے آغاز پہ ہونے والے Big Bang کے وقت کیا ہوا ہوگا۔ یہ ایک انتہائی برق رفتار Particle Collider ہے۔ دیکھیئے کہ اس کی ویب سائٹ کیا کہتی ہے۔

سرن: یورپ کی ایٹمی تحقیقات کا ادارہ:

کائنات کیا ہے؟ اسکی ابتدا کیسے ہوئی؟ طبعیات کے ماہرین سرن لیبارٹری پہ ان سوالات کے جوابات کے لیئے دنیا کے طاقتور ترین پارٹکل ایکسیلیریٹر Large Hadron Collider کو استعمال کر رہے ہیں۔ یورپ کی ایٹمی تحقیقات کے ادارے میں سائنسداں اور انجینیئر ز کائنات کی بنیادی ساخت کی کھوج میں منہمک ہیں۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی اور پیچیدہ ترین مشین پر مادّے کی ساخت میں موجود پارٹکل پر تحقیق کر رہے ہیں۔ پارٹکل روشنی کی رفتار کے قریب ٹکرائے جائیں گے۔ اس سے پتہ چلے گا کہ یہ آپس میں کس طرح ملتے ہیں جس سے فطرت کے قوانین سے آگاہی ہوگی۔

ref: http://home.web.cern.ch/about

یوں سمجھیں کہ اس تجربے میں دس کلومیٹر دور سے دو سوئی کی نوکیں روشنی کی رفتار سے ٹکرانی ہوتی ہیں جو نہایت ہی عرق ریزی کا کام ہے۔ اس تجربے کی جُزیات میں جائے بغیر ایک چھوٹا سا مگر بڑا اہم نکتہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق کا سبب بننے والے ایک مبینہ دھماکے Big Bang کی تحقیق کے دوران ویسا ہی انتہائی چھوٹا تجربہ کرنے کی کاوش میں انسان کو، جو کائنات کی سب سے ذہین مخلوق ہے، ہزاروں سائنسدانوں کی سالوں کی پلاننگ اور کوششیں درکار ہوئیں تو آپ خود ہی سوچیں کہ

اُس اصل دھماکہ کے لیے جو حقیقتاً کائنات اور انسان کی تخلیق کا سبب ہوگا کیا کوئی پلاننگ یا ارادہ درکار نہ ہوا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یکساں نتیجے کے حامل ایک ہی کام دو مختلف طریقوں سے اس طرح ہوں کہ ایک کی تو زبردست علمی منصوبہ بندی ہو اور دوسرے کے لئے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہی نہیں ہو؟ پھر ایک اہم نکتہ یہ بھی کہ کیا ایسے تجربے سے کوئی کائنات وجود میں آ جائے گی؟ اگر یہ تجربہ کامیاب ہوا تو اس تجربے سے کوئی کائنات خواہ بہت چھوٹی ہو، کیوں نہ بنی؟ یہ کیسا تضاد ہے؟ کس منطق سے دونوں صحیح ہیں؟ کیا انسان ایک مطلق ناپید ماحول یا Nothing کو بنانے میں ہی ناکام ہے؟

ایم تھیوری

سائنسی فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیادیں کتنی کھوکھلی ہیں اس کا اندازہ جدید ایم۔ تھیوری M-Theory سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ سائنس ٹھوس حقائق پر ہی انحصار کرتی ہے لیکن یہ تھیوری سائنسی مفکرّین کے خوابی تخلیات کی مثال ہے۔ کائنات کے خود بخود وجود میں آنے کی تھیوری کو ایک منطقی جواز دینے کے لیے ایک نئی مشترکہ تھیوری پیش کی جا رہی ہے جس کی بنیاد خلا کے چند حقیقی مظاہر یعنی کانٹم غیر یقینی، کرَوڈ اسپیس Curved Space، کوارک quark، اسٹرنگ string اور ملٹی ڈائمنشن multidimension پر مبنی ہے جس کا حسابی تخمینہ بے شمار کائناتیں نکلتا ہے۔ یعنی اگر ہم ۵۰۰ کو ۵۰۰ سے ۱۰ دفعہ ضرب در ضرب دیں تو اتنی کائناتیں خود بخود بنیں! سائنس کی رو سے کیونکہ قانونِ کشش ثقل کی وجہ سے کائنات خود بخود بن سکتی ہے لہٰذا اس عمل سے لاکھوں کائنات بنتی اور ٹوٹتی رہیں لیکن ہماری کائنات اُن لاتعداد میں ایک ہے جو اتفاقاً بن کر قائم رہ گئی! طبعیٔ قوانین، فطری توانائی اور زندگی بھی ماحولیاتی اتّفاق سے وجود میں آئے، سارا نظام کائنات انہی قوانین پر چل رہا ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے اور امکانیت کے قانون Law of Probability کے تحت ممکن ہے۔ اب دیکھیں کہ یہ قانون امکانیت لاڈکشنری کے مطابق کیا ہے؟

قانون امکانیت

سچائی کے ظاہر ہونے کے امکانات، کسی نظریہ کے صحیح ہونے کے آثارات اسکے تجربات اور نتائج کے تواتر کی بنیاد پر۔

What is PROBABILITY? definition of PROBABILITY

Likelihood; appearance of truth. The likelihood of a proposition or hypothesis being true, from its conformity to reason or experience, or from superior evidence or arguments adduced in its favor.

http://thelawdictionary.org/probability/

ایم تھیوری کائنات کی تخلیق اور اسکی ہیئتِ ترکیبی کو سمجھنے کا محض ایک نظریہ Theory ہے،جس میں اہم ترین عنصر ثقل gravity کا کردار موجود ہی نہیں !علمی حلقوں میں اس پر بہت اختلاف بھی ہے اور عام انسان تو اس کو حماقت ہی سمجھے گا کیونکہ کچھ لوگوں نے خود ہی کائناتی تخلیق کا نظریہ وضع کیا اور خود ہی ایک قانونِ امکان کی تخلیق کر کے اپنے اس تخیل یعنی نظریئے کو حقیقت کا درجہ بھی دے دیا۔تو کیا انسانیت کی نظریاتی رہنمائی ان چند لوگوں پر چھوڑی جاسکتی ہے،جن کے اخلاص پر تو ہم شبہ نہیں کرتے کیونکہ وہ علمِ طبعیات کے اصولوں سے ہی تحقیق کر رہے ہیں لیکن غور طلب یہ بات ہے کہ ایک غیر یقینی اور غیر مصدّقہ نظریہ کس طرح انسانوں کے لیے دائمی نظریہ حیات کی بنیاد بن سکتا ہے؟

نظریہ ارتقاء

انسانی وجود کی جدید سائنسی توجیہہ نظریہ ارتقاء Theory of Evolution ہے۔ارتقاء وہ عمل ہے جس میں زندگی نئی شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی ہے جبکہ اس کے میکینزم کو فطری یا قدرتی چناؤ natural selection کہا جاتا ہے۔اس کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ زندگی کی ہر شکل اپنی بچ جانے والی نسلوں میں ایک غیر محسوس ارتقائی عمل سے گزر رہی ہوتی ہے جو کہ طویل عرصے پر محیط مگر مزید بہتری کی طرف ہوتا ہے۔اس قدرتی عمل کا مطالعہ ارتقائی سائنس یا حیوانیات ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید سائنس نے ارتقاء کے مشاہدے میں زبردست پیش رفت کی ہے اور ان کی کاوشیں یقیناً لائقِ تحسین ہیں لیکن بظاہر اس میں بہت سے جھول بھی ہیں۔اب اس ہی کو لیں کہ اگر زندہ خلیات خود ہی جنم لے رہیں اور زندگی کے ارتقاء کی طرف خود ہی بڑھ رہے ہیں تو پھر اس عظیم الشان عمل میں مختلف شعبوں جیسے انسان، جانور، پرندے اور حشرات الارض وغیرہ کی تخصیص کیسے خود بخود ہوئی۔پھر تمام کے نر اور مادہ جوڑے بھی خود بخود کیسے بن گئے۔جذبات اور خیالات میں بھی جوڑے بن گئے جیسا خوشی ،غم ،نفرت ،محبت وغیرہ۔کوئی بھی علمی تحقیق اس وقت تک ہی قابلِ

قبول ہوتی ہے جب تک خالص شواہد پر مبنی ہو جب نظریہ ارتقاء نا قابل ثبوت تخیل کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو علمی سے زیادہ تفریحی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اس نظریہ کا استدلال کہ انسان سمیت سب جاندار ایک خلیے کی پیداوار ہیں ابھی تک ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ہم خالص علمی اور تحقیقی بحث کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہیں لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک نظریہ Theory ہے اور نظریئے کے قدرتی یا طبعی قانون بننے میں بے شمار مشکلات حائل ہیں اور کون جانے کہ مستقبل میں کچھ نئی معلومات اس نظریہ کا حُلیہ ہی بدل دیں۔ ہم اس نظریئے کو مطلق مسترد نہیں کرتے کیونکہ یہ ایک نا معلوم برتر ٹیکنالوجی (فطرت) کی انسانی تشریح ہے جس میں بہت جھول ہونے کے باوجود ایک قابل داد تشریح ہے جو سائنسی بنیادوں پر ایستادہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کل سائنسی معلومات انسان کو ہی زمین کی مخلوق ماننے سے انکار کر دیں اور انسان ایک اجنبی جنس alien قرار دیا جائے۔ عرق ریزی سے حاصل کوئی بھی علم اپنی اہمیت منواتا ہے لیکن اسکا اطلاق جہاں جہاں غیر منطقی ہوگا تو اسکی مخالفت بھی عقلی اور منطقی بنیادوں پر ہی کی جائے گی۔ دراصل اسکالر اور سائنسدان کی تحقیق نہایت محدود دائرے میں ہوتی ہیں اور وہ ماحول کے اطراف موجود بہت سے پُر اسرار اور حیرت زدہ کرنے والے طبعی موجودات اور حالات کو جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔نظریہ ارتقاء بھی اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ سائنسداں زندگی کے ارتقاء کے حوالے سے اربوں سال کی بات کرتے ہیں کہ کس طرح زندگی اربوں سال میں یہاں تک پہنچی۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ ارب سال کہنا تو بہت آسان ہے لیکن اس کا مطلب گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ ہوتا ہے کہ اس دوران نظام شمسی میں زمین نے اربوں بار سورج کا طواف اپنے پھیلتے اور سکڑتے ہوئے محور میں بغیر کسی تبدیلی کے مکمل کیا اور چاند تو زمین کے گرد اربوں دفعہ اس طرح اپنے محور میں گھوما کہ اس کا چہرہ کبھی زمین سے ہٹا نہیں یعنی اسکی محوری گردش اور زمین کے گرد مداری گردش یکساں رہی۔اس سارے عمل کو محض آٹو میٹک یا فطری سمجھ کر قبول کر لینا حقائق کا عقلی تجزیہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں اسکالر اہم سوالات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ:۔

۱۔ نظام شمسی کیوں قوانین کی پاسداری کر رہا ہے

۲۔کیا چاند کوئی ریاضی داں ہے جو ایک حسابی انداز precise calculated parameters میں گردشی قفل کے ساتھ زمین کی طرف چہرہ کیئے مدار میں گردش کرتا ہے۔

۳۔ وہ کون سا طبعئی قانون ہے جو نظام شمسی کو چلا رہا ہے اور کبھی خطا نہیں کرتا۔

نظر یہ ارتقاء محدود علمی پیرائے میں پُر کشش ضرور ہوسکتا ہے لیکن سو فیصد درست نہیں جبکہ جدید سائنسدان کھینچ تان کر ہر زندگی کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں کیونکہ انکے پاس کوئی عقلی متبادل نہیں ہے۔ فنا ہوجانے والے جاندار کے چھوڑے جانے والے نقوش جو زمین یا چٹانوں میں دفن ہوجاتے ہیں فوسل fossi l کہلاتے ہیں ان کی چھان بین کا علم paleontology کہلاتا ہے۔ اسی علم کے بموجب ایک ملی میٹر جسامت کا کیڑا ٹارڈیگریڈ tardigrade جسے پانی کا ریچھ بھی کہتے ہیں پچاس کروڑ سال سے زندہ ہے اور سب سے سخت جان جانا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنے طویل دورانیئے میں اس میں کوئی ارتقائی تبدیلی کیوں نہیں آئی؟ یعنی اس کی جسامت اور شکل کیوں تبدیل نہیں ہوئی۔ اس کی سخت جانی پر بی بی سی کی حیران کن رپورٹ اس کا لنک ملاحظہ ہو۔

http://www.bbc.com/news/science-environment-40752669

http://www.bbc.com/earth/story/20150313-the-toughest-animals-on-earth

انسان اور بن مانس: فوسل fossil کے جدید علوم کی دریافتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان کی ارتقاء کی وضاحت کا عام فہم یا کامن سینس جائزہ دلچسپ ہوگا۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق زندگی کی ایک شاخ مختلف ادوار طے کرتی اربوں سال میں پہلے بندر یا بن مانس پھر ارتقائی منازل طے کر کے انسانی شکل اختیار کر گئی۔ اس کی سائنسی تشریح ایک پیچیدہ علم ہے جس سے ہمیں یہاں کوئی غرض نہیں کیونکہ ایک عام انسان اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہی رہے گا۔ ہم صرف کامن سینس سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کی سچآئی کے بارے میں سادہ سی توجہ کی ضرورت ہے کہ اس کے مطابق بن مانس سے انسان بننے میں انتہائی سست رفتاری سے تبدیلی کروڑوں سال میں آئی ہے۔ اب غور کریں کہ ایسی تبدیلیاں جو لاکھوں اور کروڑوں سال پر محیط ہوں یقیناً اچانک نہیں ہونگی بلکہ اس میں بتدریج تبدیلی کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایک تبدیلی جو کہ الفِ سے شروع ہوتی ہے یے تک پہنچنے تک پہلے الف سے ب، پھر پ، پھر ت کی شکل اختیار کرتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ یے تک پہنچی ہوگی۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور بن مانس یا چمپینزی (Chimpanzy) کے درمیان کے تمام اِرتقائی مراحل غائب ہیں! یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے اور طبعی قوانین کے خلاف بھی، بھلا یہ کیسے ممکن ہوا کہ بن مانس اور انسان تو موجود ہوں لیکن بیچ کے تمام مراحل غائب ہو چکے ہوں! اگر نظریہ ارتقاء واقعئی حقیقی نظریہ ہوتا تو بن مانس اور انسان کے درمیان مختلف مراحل

کے بن مانس یا انسان بھی موجود ہوتے بلکہ بن مانس تو مفقود ہوتا۔ اس کو مزید آسانی سے سمجھنے کے لیے آیئے ایک پودے کی مثال لیتے ہیں۔ بیج سے درخت بننے کا عمل بھی ایک ارتقائی عمل ہے جس میں مختلف مراحل آتے ہیں۔ ایک بیج کونپل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے پھر پودہ بنتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک بڑا درخت بن جاتا ہے۔ اب غور کریں تو یہ تمام مراحل ساری دنیا میں مختلف جگہوں پر موجود ملیں گے یعنی بیج سے درخت تک کا ہر مرحلہ آنکھوں کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ وہ انسانی ارتقائی عمل جو لاکھوں سال پر محیط ہو بھلا اس میں یہ کیسے ممکن ہے کہ بن مانس تو نظر آئے لیکن درمیانی مختلف انسانی ارتقائی درجات نظر نہ آئیں۔ کیا عقل اس نظریہ کو صحیح مان سکتی ہے؟

اس نظریہ کے مطابق ہر تبدیلی ایک بہتری کی طرف ہوتی ہے یعنی ارتقائی منازل رفتہ رفتہ مزید آزاد زندگی کی طرف بڑھتی ہیں۔ لیکن ارتقاء نے غذا پر دارومدار کو ختم نہیں کیا۔ آج بھی ہر انسان غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو اس ارتقاء کے لاکھوں کروڑوں سال میں ایسا انسان کیوں نہ بنا جو باہر کی مدد کا محتاج نہ ہو یعنی ہوا، پانی اور غذا کا؟ نہ ہی بیماریوں کا خاتمہ ہوا بلکہ نئی بیماریاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ نیچرل سلیکشن تو جاندار کو بہتری کی طرف لیجاتا ہے پھر جانور سے زیادہ انسان میں بیماریاں کیوں پیدا ہو رہی ہیں! ہر جاندار کی مادہ آسانی سے بچہ جن دیتی ہے لیکن ارتقاء میں عورت دردزہ میں مبتلہ کیوں ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بھی طبعی عوامل ہیں جو جانور کے لیئے زیادہ آرام دہ ہیں بہ نسبت انسان کے جیسے موسم کی سختی جانور فطری طور پر جھیل جاتے ہیں لیکن انسان نہیں۔ ایسے بہت سے عوامل یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام نے انسان کو خالق کے نائب کی جو خصوصی حیثیت دی ہے اور اسکی ساخت کی جس برتری کا دعویٰ کیا ہے اس کی سائنسی تصدیق مستقبل میں نظریہ ارتقاء کی مزید وضاحت کردیگی۔

فطرت

ایک اور پہلو کو بھی دیکھتے ہیں کہ کائنات کا نظام بظاہر عام فہم ہے اور فطرت کے تمام مظاہر وغیرہ ہر انسان کے لیے سمجھنا آسان ہیں تو پھر ہم اس کائنات کی ابتدا کی ایسی تشریح کیوں نہیں دیکھتے ہیں کہ عام انسان آسانی سے سمجھ لے ہمیں علمیت کی گہرائی میں آخر جانا ہی کیوں پڑ رہا ہے؟

سائنس فطرت کی اس طرح تعریف کرتی ہے۔

وسیع تر معنوں میں نیچر فطری، طبعی اور مادّی دنیا ہے۔ ایک طبعی دنیا زندگی جسکا عمومی حصہ ہے۔ یہی

سائنس کا شعبۂ تحقیق ہے جس میں انسانی اعمال کو جدا رکھا جاتا ہے۔
آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

The phenomena of the physical world collectively, including plants, animals, the landscape, and other features and products of the earth,

مجموعی طور پر پوری دنیا، جس میں درخت، جانور اور مناظر قدرت و نباتات اور زمینی چیزیں۔
فطرت کا مطلب طبعی قوانین کا ماحول اور زندگی ہے اس کا دائرہ ایک سب ایٹم سے خلاء Subatomic to Space تک ہے۔
کائنات کے بارے میں سائنس کہتی ہے کہ یہ تمام چیزوں کی موجودگی ہے جو کہ مادّہ، توانائی، اجرامِ فلکی، ستارے، کہکشائیں اور کہکشاؤں کے درمیان کی چیزوں پر مشتمل ہے۔
مندرجہ بالا نیچر کی تمام تعریفیں بڑی مبہم ہیں اور محض ماحول کی طبعی وضاحت ہی ہیں اور ان میں کسی طور پر بھی نیچر یا قدرت کی ابتدا کے حوالے سے انسانوں کے لیئے رہنمائی شامل نہیں ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے۔
اب جبکہ سائنس خدا کو نظرانداز کرتے ہوئے کائنات کو محض قوانینِ فطرت یا قوانینِ طبعی کا مظہر قرار دے چکی ہے جس میں تمام مظاہرِ قدرت ایک انتہائی مربوط نظام کے تحت کام کر رہے ہیں تو جدید سائنسدانوں کو اس کائنات کے نظام Mechanism کی شفّاف طور پر بغیر کسی مفروضے کے مکمّل عقلی اور علمی تشریح کرنا پڑیگی تا کہ ایک عام انسانی ذہن مطمئن ہو سکے۔ کیا سائنس ایسا کر پائی ہے؟ لفظ فطری Natural دراصل سائنسی تحقیقات میں حقائق سے فرار کا نام ہے۔ کائناتی نظم Universal Discipline کو "فطرت" کا تخیّلاتی نام دینے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فطرت Nature بھی کوئی شعور یا ذہن رکھتی ہے؟

ذہین نیچر

بظاہر تو فطرت انسان سے بہت زیادہ ذہین ثابت ہوئی ہے کیونکہ اس نے نہ صرف لاکھوں قوانینِ طبعی کی تخلیق انسانی مدد کے بغیر کر لی بلکہ ابھی تک ان قوانین میں کوئی خامی بھی نہیں پائی گئی مزید یہ کہ نیچر نے انسان کو ہر طرف پھیلے ہوئے زبردست نظام میں اس بری طرح جکڑا ہوا ہے کہ وہ اس سے نکل نہیں سکتا۔ اس طرح فطرت ہر طرح سے انسان سے ذہانت میں برتری ثابت کر رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایک اور سوال ابھرتا ہے کہ جب انسان پر نیچر ایک اچھوتی ذہانت کیساتھ

حاوی ہے تو پھر نیچر سے برتر کوئی قوت یا ہستی کیوں نہیں ہوسکتی ہے جو نیچر پر بھی حاوی ہو۔ موجودہ نظامِ قدرت پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عام انسان کے لیے قوانینِ فطرت کو سمجھنا، جن کا تعلق عام زندگی سے ہے، بہت آسان ہے۔ یعنی ہر کوئی جانتا ہے کہ موسم کی روانی کیا ہے، رات کے بعد دن آتا ہے، کون سی فصلیں کب پیدا ہوتی ہیں، بارشیں اور ہوائیں کس نظام کے تحت ہیں وغیرہ وغیرہ، لیکن جوں جوں ہم ان قوانینِ طبعیٔ کی ماہیت و منبع کو مزید سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے ہیں ویسے ویسے یہ پیچیدہ تر ہوتے جاتے ہیں جس سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ کائنات میں کہ ایک برتر اور حاوی نظام ضرور کارفرما ہے جو کہ انتہائی پیچیدہ علوم سے مزیّن ہے جو ایک طرف عام انسان کو مطمئن کرتا ہے تو دوسری طرف متجسس انسان کی تسکین کے لیئے جس میں حقیقت جاننے کی اُپج رچی بسی ہے بے پناہ علوم کے ذخائر بھی مدفون رکھتا ہے۔ عاقل انسان اس نظام میں اپنے لیئے بے پناہ رغبت پاتا ہے جو اس کی حقیقت آشنائی کی خواہش کی تکمیل کرتا ہے۔ گویا دنیا کا ماحول درحقیقت پراسرار رنگ لیئے ہے۔ بظاہر قدرت یا فطرت محض قوانینِ طبعی کا اظہار ہے جو ہر موجود چیز پر وقت اور مادّے کے پیرامیٹر میں اثر انداز ہوتا ہے۔

غیر سائنسی تشریحات

ایک مکمل نظریہ خواہ کوئی بھی ہو اس کا اپنے خدوخال میں مکمل نظریاتی ہونا ہی اس کی حقانیت کی دلیل ہوگی۔ اسی طرح سائنسدان اور اسکالر اگر خدا کو جھٹلا کر ایک متبادل نظریۂ حیات پیش کرتے ہیں تو ان کو نیم منطقی اور غیر سائنسی کے بجائے اپنے طبعیٔ و سائنسی خدوخال میں مکمل نظریہ پیش کرنا ہوگا۔ آپ کو ہر ہر وقوعے کی تشریح سائنسی اور منطقی بنیاد پر کرنی ہوگی۔ آپ خدائی نظریات سے متاثر الفاظ اور جملے نہ استعمال کریں ورنہ یہ آپ کی کمزوری کو اور عیاں کریں گے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ الحاد پر مبنی پیچیدہ بنیادی سائنسی نظریات علمی جھول لیئے ہوئے اور نامکمل ہوتے ہیں ان کی تشریح لغت کے اعتبار سے مکمل سائنسی نہیں ہوتی۔ مثلاً جدید دور کے سب سے مانے ہوئے سائنسدان مسٹر اسٹیون ہاکنگ جو اپنے آپ کو ایک منکرِ خدا کہتے ہیں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

In the double-slit experiment Feynman's idea means the particles take paths that go through only one slit or only the other; paths that thread through the first slit, back out through the second slit, and then through the first again; paths that visits the restaurant, and then circle the Jupiter a few times before

heading home; even paths that go accros the universe and back.This, in Feynman's view, explains how the particle acquresthe information about which slits are open--if a slit is open, the particle take path through it.
The Grand Design ... page 97

"دوہرے سلٹ کے تجربے میں فین مین کے مطابق پارٹکل سلٹ سے گزرنے میں صرف ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ پاتھ جو سلٹ نمبر ا سے داخل ہوئے وہ سلٹ ۲ سے نکلتے ہیں اور پھر سلٹ ا ایک میں جاتے ہیں۔ یعنی جو پاتھ ریسٹورنٹ گیا، پھر گھر جانے سے پہلے مریخ کے کئی چکر لگا کر واپس ہوا۔ یہ فین مین کے نقطہ نظر سے، وضاحت کرتا ہے کہ ایک پارٹکل کس طرح معلومات حاصل کرتا ہے کہ کون سی سلٹ کھلی ہے! اگر کوئی سلٹ کھلی ہے تو پارٹکل اس سے گزرنے کا راستہ لیتا ہے!"

یہ ایک انتہائی لایعنی، غیر حقیقی اور تشنہ سائنسی تشریح ہے۔ بظاہر تو یہ عام سے جملے ہیں جو روزمرّہ استعمال کیئے جاتے ہیں اور اس میں کوئی اعتراض کی بات نظر نہیں آتی لیکن اگر خالص علمی اور نظریاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ تضاد سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں پارٹکل کو ذی شعور مانا گیا ہے جبکہ دوسری طرف یہی سائنسدان کسی اجنبی غیبی شعور کو مسترد بھی کرتے ہیں۔ آخر ایک پارٹکل کس طرح معلومات حاصل کرتا ہے یا اس کے پاس موازنہ کرنے کی کون سی صلاحیت ہے جس کا تذکرہ کیا گیا؟ گویا پارٹکل میں حواس اور دانش کی موجودگی بھی قبول کر لی کیونکہ وہ پارٹکل مختلف سلٹ میں سے جو کہ کچھ بند اور کچھ کھُلی ہیں اپنے گزرنے کے لیئے کھُلی کا انتخاب کرتا ہے۔ خوب! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پارٹکل کا مخصوص رویّہ کہ وہ کن حالات میں کیا رخ اختیار کرتا ہے پارٹکل کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے! تو فیصلہ کس نے کیا یا کہاں ہوا؟ اب نکتہ یہ ہے کہ پارٹکل کی کوئی مخصوص حرکت بغیر شعور کے کیسے ممکن ہے؟ اس کی وضاحت سائنسی بنیاد پر کیا کی جائے گی؟ یا تو پارٹکل میں شعور کی موجودگی یا یہاں پر ایک بیرونی اور خفیہ نظام کی موجودگی تسلیم کرنی ہوگی۔ ایسا برتر، پیچیدہ تر اور عظیم تر نظام جو ان پارٹکلز کو ایک مخصوص خاصیت دیتا ہے اور ان پر اسکی گرفت ہے۔ دراصل یہی وہ کمی ہے جو الحادی سائنس کو عجیب بناتی ہے یعنی الحادی سائنسداں اپنی بہت سی انتہائی اہم دریافتوں کی طبعی تشریح اپنے نظریات کے دائرے میں خالص مادّی سائنسی لغت کے ذریعے بیان نہیں کر پاتے بلکہ لاشعوری طور پہ ایک سِر خدائی سائنس کی موجودگی قبول کرتے ہیں۔

ایسا ہی ایک اور استدلال ایٹم کی ساخت کے حوالے سے ہے کہ سوال اُٹھا کہ اگر ہر چیز ایٹم سے بنی

ہے تو نظر کیوں آتی ہے کیونکہ ایٹم تو توانائی ہے مزید یہ کہ ہم ایٹم سے بنی اشیاء کو ٹھوس کیوں دیکھتے ہیں جبکہ الیکٹرون اور نیوکلس کے درمیان اتنا نسبتی فاصلہ ہے کہ جتنا ایک فٹبال گراونڈ کی باونڈری اور بیچ کے نقطے میں ہوتا ہے۔ اس کا جواب ایک ملحد رچرڈ ڈاکنز کی زبانی ملاحظہ ہو۔

Richard Dawkins , The God Delusion, Page 412, "

I would answer it like this. Our brains have evolved to help our bodies to find their way around on the scale at which those bodies operate. We never evolved to navigate the world of atoms. If we had, our brain probably would perceive rocks as full of empty space.

"میں اسکا جواب اسطرح دونگا کہ ہمارے دماغ بتدریج اسطرح ترقی کرتے ہوئے بنے کہ ماحول میں ایسے راستے تلاش کرنے میں ہمارے جسم کی مدد کریں جو کہ وہ اپنائے ہوئے ہے۔ ہم کبھی بھی ایٹم کی دنیا کے حوالے سے نمو پذیر نہیں ہوئے ورنہ ہمارا دماغ شاید چٹانوں کو خالی جگہوں سے ہی تعبیر کرتا۔"

یہ ایک مضحکہ خیز اور غیر علمی تشریح ہے کیونکہ دماغ خود بھی تو ایٹم سے بنا ہے تو ایٹم اپنی جبلّت کا مخالف کیوں ہوا؟ انسان ایٹم کے حوالے سے نمو پذیر کیوں نہ ہوا؟ انسانوں کے کھربوں دماغ ایک غیر فطری طرز یعنی ایٹم کو نظر انداز کر کے ہی کیوں نمو پذیر ہوئے؟ یہاں دماغوں کی خود اختیاری ترقی کا ذکر بڑی آسانی سے کر دیا گیا ہے جیسے وہ آزاد ذی ہوش ہیں۔ کیا ایسا ہے؟

سائنسدانوں میں اختلافات

بڑے بڑے سائنسدانوں کے خیالات کو اگر پرکھیں تو اس میں بہت اختلافات ہیں اور ماضی کے کچھ عظیم سائنسدانوں کے نظریات نئی دریافتوں کی روشنی میں دم توڑتے نظر آتے ہیں۔ ماضی قریب کے عظیم سائنسداں آئنسٹائن کے انقلابی نظریات جو کائنات، خلاء اور کہکشاؤں کے بارے میں تھے وہ جدید سائنسدانوں کی نظر میں پرانے ہو چکے ہیں اور نئے نظریات اخذ کیے جارہے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ کائنات ذہین تخلیق Intelligent Design ہے جبکہ اسکے مخالفین نظریۂ ارتقاء کے حمایتی ہیں، Fred Hoyle نے تو زندگی کے ارتقائی نظریے کو حماقت کی انتہا قرار دیا ہے۔ وہ بگ بینگ کی تھیوری سے بھی اتفاق نہیں کرتا۔ دوسری طرف زندگی کی ابتدا کے بارے میں بھی سائنسدانوں میں اختلافات ہیں، مغرب میں ایک نہ ختم ہونیوالی بحث

جاری ہے۔ان متغیر سائنسی نظریات کے ساتھ سائنسدانوں کا کوئی مشترکہ اور مستند سائنسی نظریۂ حیات دینا بظاہر ایک خواب ہی ہے۔

سپر سائنس

Super Science

ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ یہ کائنات دراصل ایک "برتر سائنس" کا اظہار ہے جو انتہائی زیرک منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ایک عظیم تر اور لامحدود اختیار والا غیر مرئی نظام کائنات میں کارفرما ہے جو ہمارے شعور سے بلند ہے۔یہی نظریہ ہر سوال کا تسلی بخش جواب رکھتا ہے۔سائنسدانوں کے لیئے اس کو تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اپنی خام علمی سرشت کے بموجب ہی کائنات کی تشریح کرنے پر مجبور ہیں۔

باب ۸

حل کی تلاش

اگر کسی مشین کی ساخت کی جانکاری کے لیئے ہم اسے کھولنا چاہیں تو ضروری اوزار کی موجودگی لازم ہوگی ورنہ اس کے بارے میں اتنا ہی جان پائیں گے جتنے وسائل کا استعمال کریں گے۔ اسی طرح کائنات کو سمجھنے کے لیے جن علوم اور واسطوں کی ضرورت ہے اگر وہ مکمل طور پر ہماری دسترس میں نہیں ہونگے تو ہم کائنات کو اتنا ہی جان پائیں گے جتنا کہ ہمارے پاس اس کو جاننے والے علوم ہونگے۔

انسان ابھی تک کائنات کے بارے میں اسی وجہ سے مکمل معلومات حاصل کرنے سے قاصر ہے کہ وہ کائنات کی تحقیق کُل مہیا علوم کی مدد سے نہیں کر رہا۔ علوم پر ایک طرح سے جدیدیت کا غلبہ ہے لہذا کائنات کو سمجھنے کے لیے وہی پیمانے اور "اوزار" استعمال ہو رہے ہیں جو کہ سائنس کا خاصہ ہیں یعنی صرف طبعی علوم۔ اسی وجہ سے کائنات کی بے پایاں وسعتوں میں کھوئی ہوئی جدید سائنس جو کہ مابعدالطبعیات Metaphysics کی مُنکر ہے ابھی تک حقیقتِ زندگی و کائنات کے حصول میں سرگرداں ہی ہے۔

کائنات اور زندگی کی حقیقت اسی وقت جانی جاسکتی ہے جب طبعی اور غیر طبعی علوم کے ماہرین مل کر کشادہ دلی سے مربوط جستجو کریں۔ ایک کامن سینس اور دوسرا مابعد الطبعی پیرایہ ہی سائنس کے ساتھ انسان کو کائنات کی حقیقی تصویر دکھا سکتا ہے جو کہ ایک مناسب طرزِ عمل ہوگا۔

اس اہم نکتے کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم اپنے اصل مقصد یعنی انسان کے بنیادی سوالات کے جوابات کی تلاش کی سمت بڑھتے ہیں۔

آزاد ماحول

غیر جانبدار اور درست تحقیق کے لیئے ضروری ہوتا ہے کہ محقق بذات خود زیرِ تحقیق مظہر کے دائرے سے باہر ہو کیونکہ زیرِ مشاہدہ ماحول کی تاثیریت کا کچھ نہ کچھ اثر اُس شخص کی کاوش پر بھی ہوسکتا ہے جو کسی ریسرچ میں مشغول ہوتا ہے اور نتیجے پر اس کی چھاپ یقینی ہوگی۔ لہذا کائناتی علوم کے کسی

شعبے کا محقق بھی کائنات میں رہتے ہوئے کائناتی محدودیت کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ اس کائنات کی ابتداء کی خالص طبعی بنیادوں پر سائنسی تحقیق اب تک اس لیئے بے نتیجہ ہے کیونکہ اس کی ساخت کے غیر طبعی پہلو کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ درحقیقت خالق کے حوالے سے کسی شک میں رہنے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کے حقیقی جائزے کے لیے کوئی غیر جانبدار اور آزاد فورم یا ماحول میسّر نہیں ہے۔ ابھی تک ہم صرف "وقت اور شئے" Time & Space کے اندر ہی تمام تحقیق کررہے ہیں جو بے نتیجہ رہی ہے لہٰذا کائنات کے بارے میں مکمل معلومات کے لیے ہمیں یا تو کائنات کے باہر جانا پڑے گا یا پھر کسی ایسے تعلّق کا پتہ چلانا پڑے گا جو ماورائے کائنات ہو یعنی ایسی جگہ جو کہ اس کائنات سے باہر ہو جہاں سے جا کر اس کا پورا مشاہدہ کیا جاسکے۔

ماورائے کائنات

یہ کائنات مادّے اور وقت یا روشنی کی مظہر Time & Space Based Phenomenon ہے لہٰذا اس کائنات سے باہر کے ماحول کو ہم مابعد الوقت یا وقتِ منفی یعنی Antitime اور منفی مادّے Anti-Matter کا نام دے سکتے ہیں یعنی وقت اور مادّے سے اوپر یا باہر کوئی مظہر یا کیفیّت! گویا اس کائنات اور زندگی کے نامعلوم حقائق جاننے کے لیے ہمیں کسی ایسے واسطے کو تلاش کرنا ہوگا جو کہ ہمیں موجودہ وقتِ مثبت سے باہر "وقتِ منفی"Antitime یا ماوراء الوقت تک پہنچا سکے۔ بظاہر یہ عجیب بات لگتی ہے لیکن ایسے کسی واسطے کی تلاش ہماری ضرورت ہے جس سے ہم اس کائنات کی حقیقت کے بارے میں جاننے کی بہتر پوزیشن میں ہونگے۔ اگر ہم کائنات اور لامحدودیت سے بھی پرے کوئی رابطہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہم بہتر طور پر اس کائنات، انسانی وجود اور انسانی اعمال کے متعلق عملی نظریہ قائم کرسکیں گے۔ یہی ایک طریقہ ہے جو کہ ہمارے مخمصوں اور کنفیوژن کو دور کرسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ واسطہ کیسے ملے گا؟ کیا سائنس یہ رسائی بہم پہنچا سکتی ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ فی الوقت سائنس نہ کسی ایسے آثارِ وجود کو تسلیم کرتی ہے جو کائنات سے جدا ہو اور نہ ہی کائنات سے باہر رابطے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ دوسری طرف مذہب ایک ایسا واسطہ ضرور ہے جو کائنات کے باہر سے تعلّق کا دعوٰی کرتا ہے اور یہی وہ صِفت ہے جو اسے موجودہ صورتحال

میں سائنس سے ممتاز کرتی ہے۔اس نقطۂ اتصال کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں لازماً ایک مذہب یا نظریۂ حیات کو تلاش کرنا ہوگا جو نہ صرف طاقتور منطقی بنیاد پر اُستوار ہو بلکہ وہ نئے خیالات اور نئی ایجادات کو جذب کرنے کی صلاحیت اور جدید تہذیبوں کو سمونے کی قدرت رکھتا ہو، جو روائتی عقائد سے بڑھکر ایک موئثر نظریۂ حیات ہواور جو جدید سائنس سے نہ صرف علمی ہم آہنگی رکھتا ہو بلکہ کائنات سے باہر کے نامعلوم ماحول سے ایک مُحکم رابطہ مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اگر ہم اس میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ ذریعہ ہمیں ایسا اشارہ بھی مہیّا کردے جو ہمارے بنیادی سوالات کا نہ صرف جواب دے بلکہ وہ مذہب اور سائنس کوایک ایسی مشترک بنیاد بھی فراہم کردے جس پر دونوں انسانیت کی فلاح کے لیے یک ذہن ہو کر آگے بڑھیں۔

ادھوری حقیقت

اب تک کی گفتگو سے ہم کو سائنس اور مذہب کے دائرہ کار، اُنکے بنیادی اِختلافات اور نظریاتی بُنیادوں کمزوری یا مضبوطی کا اندازہ ہوا ہے۔ یہ حقیقت بھی آشکارہ ہوئی کہ ہم کائنات کے ایک غبارے میں قید ہیں جسے ایک حقیقت سمجھتے ہیں جبکہ یہ مکمّل سچائی Absolute Reality نہیں ہے بلکہ "محدود طبعی نیم حقیقت" ہے۔تمام خیالات، اعمال اور نتائج صرف طبعی ہی ہیں جو ہم دماغ کے واسطے سے اخذ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف طبعی ماحول کے اسیر ہیں اس لیئے ہم صرف طبعی سچائی Physical Truth یا نیم حقیقت کو مکمل سچائی سمجھتے ہیں جبکہ یہ ادھوری حقیقت ہے۔

مکمل سچائی

قطعیٔ یا حقیقی سچائی کیا ہے؟ اور اسے کیسے تلاش کیا جائے؟

یہ بات تو ظاہر ہے کہ یہ کائنات واضح طور دو حصوں یعنی عیاں اور پِنہاں Visible & Invisible کی حامل ہے لہذا حقیقی سچائی وہ ہوسکتی ہے جس میں طبعی اور غیر طبعی تمام عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہو اور عقلی اور منطقی بنیادوں پرکوئی واضح اور شفاف نتیجہ اخذ ہوا ہو۔مکمل سچائی Absolute Truth کی تلاش میں ہمیں غیر طبعی ماحول اور طبعی ماحول کے درمیان طبعی رابطہ ڈھونڈنا پڑیگا۔ یعنی اُس منفی وقت(Anti time) یا ماوراء الطبعیّات (Metaphysics) سے کوئی ایسا رابطہ جو ہمیں اس کائنات اور اسکے چھپے اور کھلے رُخوں یا پنہاں اور عیاں جہتوں Dimensions کے بارے میں غیر مبہم اشارے فراہم کرے۔تو اہم سوال یہ ہے کہ:

کیا کائنات کے باہر سے متعلق کسی مظہر سے طبعی تعلق کی دریافت کا کوئی امکان موجود ہے؟
ہاں! اب اگر واقعئی یہ کائنات ایک عظیم خالق کی تخلیق ہے کہ جس نے انسان کو شعور و تجسّس عطا کیا ہے تو وہ یقیناً ایسی تخلیق میں، جو طبعی اور غیر طبعی عناصر پر مبنی ہو، اپنی ذات اور اس کائنات سے ماوراء ماحول سے متعلق کچھ نہ کچھ اشارے یا طبعی ثبوت بھی رکھے گا تا کہ طبعی دنیا کی مخلوق غیر طبعی دنیا سے تعلق ڈھونڈ سکے اور خالق کی پہچان کر لے۔ یہ مظہر فزکس اور میٹا فزکس کے درمیان رابطے کا ایک پل بھی ہوسکتا ہے۔ گویا کائنات اور انسان کے حوالے سے کسی برتر حقیقت کی آشنائی کے لیئے اب ہمیں عدم سے متعلق طبعی واسطے کی تلاش کرنی ہے کہ کیا واقعی وہ موجود ہے؟

طبعی واسطے کی تلاش

کسی نادیدہ لامحدود قوّت یا خالق کائنات کے بارے میں طبعی واسطہ ڈھونڈنا ایک بہت مشکل کام ہے کیونکہ طبعی دنیا میں موجود ہر چیز کا تعلق طبعی قوانین سے ہے۔ ویسے تو تمام طبعی اور فطری قوانین کی موجودگی اور ان کی مستقل اور یکساں کارکردگی ہی کسی قانون بنانے والے کا پتہ دیتی ہیں جو کہ منطقی طور پر درست ثبوت ہوتا لیکن جدید مفکّرین اور مادہ پرست محققین یہ استدلال لاتے ہیں کہ یہ تو فطرتاً by nature موجود ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ان طبعی قوانین کو عطیۂ فطرت سمجھ رکھا ہے لہٰذا ہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں کیونکہ اب ہمیں کوئی مختلف طریقہ کار اختیار کرنا ہے جو منکرین کے مروّجہ استدلال پر بھی پورا اترتا ہو۔
وہ طریقہ کیا ہوسکتا ہے اور کیا وہ موجود بھی ہوسکتا ہے؟

امید کی کرن

ہاں، ہمارے پاس روشنی کی ایک کرن ہے۔ کیونکہ سائنسدانوں کا یہ موقف ہے کہ فطری قوانین اٹل ہوتے ہیں یہ کبھی تبدیل نہیں ہوسکتے اور ہر عمل ان کے تحت ہی ہوتا ہے جبکہ مذہب کے موقف کے مطابق سوائے خالق کے کوئی بھی ان قوانین میں تصرّف نہیں کرسکتا۔ تو اس صورتحال میں ایک منطقی قدم یہ ہوسکتا ہے کہ ہم تلاش کریں کہ دنیا میں کہاں کہاں کن کن فطری قوانین کی خلاف ورزی ہوئی کیونکہ کوئی بھی بڑی خلاف ورزی اسکالرز کے لیئے غیر معمولی اور اہلِ مذہب کے لیئے خالق کا اِشارہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس طرح ہمیں اختلاف کا ایک مشترک نکتہ بھی مل جائے گا۔

طبعی قانون کی خلاف ورزی

فطری ماحول میں کئی عوامل خلافِ فطرت ملتے تو ہیں لیکن وہ غیر طبعی ماحول سے متعلق ہیں جبکہ ہمیں خالص طبعی ثبوت درکار ہے۔ مگر ٹھہریئے!

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں ایک انہونی اور خلافِ فطرت بات یہ نظر آتی ہے کہ کچھ کتابیں ایسی موجود ہیں جنکا کوئی انسان دعویدار نہیں ہے جبکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر کتاب کا مصنف ہو گا خواہ ایک ہو یا زیادہ لیکن بغیر مصنف کے کوئی تحریر نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں موجود لاکھوں کروڑوں کتابوں پر ان کے مصنفوں کے نام اس قانون کی لازماً پیروی میں درج ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں حیرت ہوئی ہے کہ کچھ مخصوص کتابوں کے بارے میں اس مستند قانون کی کئی بار خلاف ورزی ہوئی ہے۔ یعنی وہ کتابیں جن کو انسان آسمانی کتابیں کہتے ہیں ان پر کسی بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مشہور آسمانی کتابوں کے حوالے سے کسی انسان نے کبھی یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ وہ اس کا مصنف ہے یا یہ اس کی تحریر ہے۔ بہت خوب! اسطرح ہمیں کم از کم ایک فطری و طبعی قانون کی خلاف ورزی کا سراغ ملا۔ یہ بڑی انہونی اور پراسرار بات ہے جسکی تفتیش کی ضرورت ہو گی۔ ہمیں اس خلاف ورزی کی چھان بین کرنی اور اس کی وجہ تلاش کرنی ہے۔

ہمیں اس معمّہ کا حل نکالنا ہے کہ ایک مضبوط طبعی قانون کی خلاف ورزی آخر کیونکر ہوئی؟

کیا آسمانی کتابوں کا واقعیً کوئی مصنف نہیں ہے؟

آخر ان کتابوں کا مصنف کون ہے؟

ان کتابوں کا مضمون کیا ہے؟

آسمانی کتابیں

ہر مذہب میں تحریراً کچھ مقدس مواد ایسا ہوتا ہے جس کو آسمانی یا الہامی صحیفہ کہا جاتا ہے۔ انکے متعلق عام تأثر یہی ہے کہ یہ آسمان سے نازل ہوئی ہیں گویا مابعدالطبعیاتی ماحول metaphysical phenomenon سے ان کا ظہور طبعیاتی دنیا Physical World میں ہوا۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ کروڑوں اربوں انسان اس پر یقین بھی رکھتے رہے ہیں کہ حقیقتاً ایسا ہی ہے۔

کیا ہم بھی یقین کر لیں؟ یا اس دعویٰ کی سچائی کو پرکھنے کی ضرورت ہے؟ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ:

وہ کیا حالات تھے جن میں یہ کتابیں ظاہر ہوئیں اور محفوظ کی گئیں؟ اور

آخر کوئی بھی انسان ان کتابوں کا مصنف ہونے کا دعویدار کیوں نہیں ہوا؟
لیکن یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ جدید اسکالرز اور فلسفی ان کتابوں کو آسمانی نہیں مانتے بلکہ انکو بغیر کسی مستند تاریخی ثبوت کے انسان یا انسانوں کی تحریر قرار دیتے ہیں۔ ہم اس نکتے پر ضرور غور کریں گے کہ آیا انکی بات میں کتنا وزن ہے۔اس تحقیق کے لیے ابتدائی طور پہ ہمیں کچھ یا کم از کم ایک مقبول و معیاری کتاب کو چن کر اس کے بارے میں تحقیق کرنی ہوگی۔

حالیہ آسمانی کتاب

مختلف آسمانی کتابوں کی موجودگی میں بہر حال ہمیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا تا کہ اس کی سچائی کا تجزیہ کیا جا سکے۔مشہور ترین آسمانی کتابیں چار ہیں۔
توریت، زبور، انجیل اور قرآن۔
ہمارا یہ سمجھنا عین منطقی ہوگا کہ اگر کوئی خالق کائنات ہے تو وہ ایک ہی ہوگا اور تمام مذکورہ کتابیں اسی کی طرف سے ہی ہو سکتی ہیں۔اب اگر روز مرّہ کی زندگی کے طرز عمل کو مدِ نظر رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً لوگ کسی بھی کتاب کا جدید ترین ایڈیشن یا کسی سوفٹ وئیر کا جدید ورژن ہی منتخب کرتے ہیں کیونکہ ان میں تمام اضافہ یا ترمیم موجود ہوتی ہے اس طرح ہم کو مکمل updated مواد حاصل ہوتا ہے۔ یہ مناسب طرزِ عمل ہے جو ہمارے معمول میں شامل ہے لہٰذا آسمانی کتابوں کے سلسلے میں انتخاب کے لیے ہم اسی طریقے کو بروئے کار لاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آسمانی کتابوں میں جدید ترین ایڈیشن یا کتاب کون سی ہے۔

قرآن اور اسلام

اس اصول کو موجود آسمانی کتابوں پر لاگو کرنے پر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سب سے قریب ترین زمانہ میں ظاہر ہونے والی کتاب قرآن ہے جو مذہب اسلام کو متعارف کراتی ہے۔ اس کتاب کا ظہور تقریباً چودہ سو برس قبل ہوا جب کہ دوسری مشہور آسمانی کُتب تقریباً دو ہزار سال سے قبل کی ہیں۔قرآن کی حمایت میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس کتاب کا صرف ایک ہی ایڈیشن شروع سے اب تک زیرِ استعمال رہا ہے۔ کسی بھی آسمانی کتاب کا ایک ہی ایڈیشن ہونا زیادہ منطقی بات ہے۔ لہٰذا ان مضبوط دلائل کی موجودگی میں قرآن کا انتخاب ایک مناسب قدم ہے۔
اب ہمارے پاس تحقیق کے لیے الوہی کتاب قرآن ہے جس کی حقانیت کی مزید جانچ علمی و عقلی

بنیادوں پر ضروری ہے۔

منفرد اور فطری حفاظت

یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کا مسودہ واقعی اصلی ہے کیونکہ آسمانی کتاب کو محفوظ کرنے کے طریقے ایسے ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی تحریف نہ ہو سکے۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن اپنا ایک مُنفرد محفوظی نظام سامنے لاتا ہے کہ اس کا سارا مواد انسانی ذہن میں محفوظ کیا گیا۔ یہ تاریخی حقیقت سامنے آئی کہ قرآن اپنے نزول سے اب تک ہمیشہ انسانی ذہنوں اور قلوب میں بھی محفوظ رہا ہے۔ یہ بڑی حیرت ناک بات ہے کہ قرآن انسانی دماغ کے ساتھ انتہائی مربوط تعلّق ظاہر کرتا ہے جو کہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

خاص ذہنی کارکردگی

آیئے اپنی جستجو میں سائنس کو بھی شامل کرتے ہیں اور دوبارہ اسی سائنسی نظریہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو کہتا ہے کہ ہر عمل کسی طبعی قانون کے تحت ہی ہوتا ہے خواہ اس کا تعلّق فِطرت سے ہو یا انسان سے، اس طرح ہمارا دماغ بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہوا یعنی ہماری سوچ، فکر، یادداشت، اور ہمارے ردِّعمل خاص طریقہ پر ہی عمل پزیر ہوتے ہیں۔ اب اگر انسانی دماغ کسی خاص کیفیت یا صورتحال میں غیر معمولی کارکردگی دکھاتا ہے تو پھر ہم کو اس پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ کیا اس مخصوص فعل کے ساتھ کوئی خصوصی طبعی قانون منسلک ہے؟

حفظ

مشاہدے سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ایک چار یا پانچ سال کا بچہ خواہ اسکی مادری زبان کوئی بھی ہو تقریباً ۶۰۰ صفحے کا قرآن زبانی یاد کر لیتا ہے جو کہ ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن میں محفوظ بھی ہو جاتا ہے۔ اب یہاں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ:

کیا انسانی دماغ کی طویل نثر یا کتابوں کو زبانی یاد کر لینے کی صلاحیت کسی عمومی فطری قانون common natural law کے تابع ہے؟ عموماً انسانی دماغ ضخیم کتاب کو بآسانی زبانی یاد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یا یہ کہ عام انسان اس فعل کو غیر ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ایک بہت وقت طلب کام ہوتا ہے۔ ثقیل اور بڑی بڑی عبارتیں مشکل سے ہی ذہن نشین ہوتی ہیں لیکن دوسری طرف قرآن کو دنیا میں لاکھوں لوگ روز آنہ بآسانی حفظ یا زبانی یاد کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ

بھی انہونی اور غیر معمولی بات ہے کہ قرآن کی آیات کو انسانی ذہن آسانی سے جذب اور یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہے گویا یہاں قرآن کے حوالے سے ایک بہت اہم اشارہ ملتا ہے کہ انسانی دماغ اس سے خصوصی اُنسیت compatibility رکھتا ہے جو کسی مخصوص مظہر کی خبر بھی دیتا ہے یعنی قرآن کے حفظ کے حوالے سے کوئی مُنفرِد قانونِ فطرت special natural law بھی موجود ہے۔ یہاں خوش قسمتی سے ہمیں آسمانی کتاب کے انتخاب میں ایک زبردست فطری مدد بھی مل گئی۔ اب اگر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یقیناً کوئی طبعی قانون موجود ہے جس کی وجہ سے قرآن کے الفاظ انسانی ذہن میں جم جاتے ہیں تو یہ نتیجہ بھی منطقی ہوا کہ قرآن کے الفاظ اس لیے دماغ میں محفوظ ہونگے کیونکہ اگر کوئی خالق کائنات ہے تو اس کی یہ منشا ہوگی کہ اس کے پیغامات انسانی ذہن محفوظ رکھے لہٰذا وہی ایسا نظم بھی تخلیق کرے گا۔ اب خالق اور انسان کا رشتہ قرآن کے ذریعے استوار ہونا فطری ہوا اور قرآن کا انتخاب مزید مستند ہوا۔

قرآن کا انسانی مصنّف

آیئے اب منکرین کے اس دعوے کا جائزہ لیں کہ یہ انسانی تحریر ہے۔

ہر انسان کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اس کے کام کی تعریف ہو، ہم سب کا مشاہدہ یہی ہے کہ ہر مصنّف اپنی کتاب پر اپنا نام ضرور لکھتا ہے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس پر کسی مصنّف کا نام تحریر ہی نہیں ہے اور کسی بھی انسان یا انسانوں کے گروپ نے کبھی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اس کتاب کا مصنّف ہے تو پھر: کون اس کا تحریر کرنے والا ہے؟ کون اسے انسانوں کے سامنے لایا؟

تحقیق سے پتہ چلا کہ ایک انتہائی معتبر شخص اسے انسانوں کے سامنے لائے تھے، لیکن وہ بھی اس کے مصنّف ہونے کے دعویدار نہیں تھے۔

تو پھر یہ معمّہ حل کیسے ہو؟

صادق وامین انسان

آئیں اور اُس ہستی کے متعلق تحقیق کریں جس نے اس کتاب کو انسانوں کے سامنے پیش کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ وہ محترم شخص ایک انتہائی سچّے اور امانت دار انسان تھے۔ انسانوں کے درمیان ان کی صادق وامین کی حیثیت 40 سال کی رفاقت کے بعد اس دور کے لوگوں نے ہی متعیّن کی لیکن قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ وہ محترم شخص تو لکھنے اور پڑھنے سے قاصر تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ

کیسے کسی کتاب کو تحریر کرتے؟ اب کوئی بتائے کہ آخر ایسا کیا ہوا ہوگا کہ ایک شخص جس کو لکھنا اور پڑھنا مطلق نہ آتا ہو وہ اچانک اتنی حکیمانہ باتیں انتہائی دلاویز پیرائے میں بیان کرنے لگے جو نثری طور پر انتہائی اعلیٰ درجے کی ہوں؟ وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اس کتاب کے غیر مرئی مالک یعنی خالقِ کائنات نے ایسے شخص کو منتخب کیا جس پر کوئی شک ہی نہیں کر سکتا کہ وہ لکھ سکتا ہے! گویا ایک خالق جو اپنی مخلوق کی نفسیات کا بھی خالق ہے اسے پتہ ہے کہ انسان اُسکے پیغام کو وحی تسلیم کرنے کے بجائے اس شخص ہی کو مصنف گردانیں گے کہ جس پر اس کا نزول ہو لہٰذا انسانوں کے اس ممکنہ ردِ عمل کو زائل کر دیا گیا۔ اس قرآن میں کئی جگہ پیغمبر کو ہدایت کی گئی ہے کہ کیا درست ہے۔ کیا کوئی مصنف اپنی کتاب میں خود کو ہدایت دیتا؟ اسی کتاب میں بہت جگہوں پر پیغام پہچانے والے کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کیا کوئی مصنف تحریر میں اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے؟ قرآن کو انسانی تحریر کہنا نہ تاریخ سے ثابت ہے اور نہ ہی عقل اور منطق سے، لہٰذا یہ بے بنیاد بات ہے کہ قرآن انسانی تحریر ہے۔

حاکمانہ طرزِ تحریر

مختلف موضوعات پہ کتابیں تحریر کی جاتی ہیں اور ہر ایک کا خاص طرزِ تحریر ہوتا ہے خواہ وہ ریسرچ کا پیپر ہو یا بچے کی کہانی ہو یا تعلیمی کتاب۔ ہر مصنف شہرت اور تعریف کا متمنی ہوتا ہے لہٰذا اس کی تحریر میں قاری کے لئے ایک طرح کا احترام جھلکتا ہے یعنی طرزِ تحریر ایسا ہوتا ہے کہ قاری اس سے مسرور ہوتا ہے۔ اس لیئے الوحی اور آسمانی کُتب عام کُتب سے اپنے طرزِ تخاطب میں بہت مختلف ہی ہونی چاہئیں کیونکہ وہ انسانوں کی تحریر کردہ نہیں ہوتیں اُنکا طرزِ تخاطب قدرتاً حکمرانہ ہوتا ہے جیسے کوئی ناصح یا حاکم کسی سے مخاطب ہو، یہی طرز قرآن کا ہے۔

آسمانی کتاب کی خصوصیات

کسی بھی آسمانی کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہونی چاہیے کہ اس میں ایسی معلومات ضرور ہونی چاہئیں جو اُس دور کے انسانوں کے عقل وشعور اور علوم سے بالاتر ہونے کے باوجود بھی اتنی عام فہم ہوں کہ ایک عام انسان بھی اس کو سطحی طور پہ سمجھ سکے۔ گویا اس میں طبعی اور غیر مرئی دونوں دنیاؤں سے متعلق معلومات ہونی چاہئیں۔ قرآن اس معیار پر بھی پورا اُترتا ہے۔ قرآن میں فلکیات اور انسانی جسم کے بارے میں ایسی معلومات، جن کا تذکرہ آگے کیا جائے گا، درج ہیں جن کا اس کے

دورِ نزول میں انسانوں کے لیے جاننا ناممکن تھا، مثلاً حیوانی زندگی کا آغاز پانی سے ہونا، ماں کے رحم میں پیدائش کے مرحلے، کائناتی توازن وغیرہ وغیرہ۔ اس روشنی میں بھی قرآن کے بارے میں یہ کہنا کہ پیغمبرؐ نے اس کو تحریر کیا، ایک نہایت لغوبات ہے کیونکہ پیغمبرؐ کو اُن معلومات کا علم کیونکر ہوا جو اب تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد انسانوں کے علم میں آئیں ہے۔

بلاغت

الہامی کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہونی چاہیئے کہ اسکی زبان میں بہت بلاغت ہو۔ یعنی بدلتے ہوئے ادوار میں اس کا متن قابلِ فہم اور کارآمد رہے۔ قرآن کو اس بارے میں فوقیت حاصل ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے جس کی بلاغت مُسلّم ہے اور دنیا کی کوئی زبان اس کی گہرائی اور بلاغت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس کی بلاغت کے باعث بہت سی تحریروں کے نئے مطالب سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب اس دعویٰ سے شروع ہوتی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ ایک بڑا دعوٰی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چودہ سو سے زائد سال میں اس میں کوئی غلط بات ثابت نہ کی جاسکی بلکہ اس کے برعکس سائنس نے اس میں موجود باتوں کی تصدیق ہی کی ہے۔ قرآن کا طرزِ تکلم، طرزِ خطاب اور اس کی غیر معمولی معلومات ہی اس کو آسمانی ثابت کرنے کو کافی ہیں۔ پھر اس میں انسانوں کو ایک چیلنج بھی ہے کہ اس جیسی ایک آیت بنا کر لے آؤ! کیا کوئی انسان انسانوں کو ایسے مقابلے کے لیے بلائے گا؟

خودحفاظتی

یہ قرآن کا سب سے تابناک پہلو ہے جو اسے تمام کتابوں پر فوقیت دلاتا ہے اور وہ ہے اسکی حفاظت کا دعویٰ۔ اسی میں درج خالق کائنات کا فرمان مرقوم ہے کہ "ہم نے اسے اُتارا اور ہم ہی اسکی حفاظت کریں گے" کیا کوئی انسان اپنی تحریر کی ہمیشہ کی حفاظت کی ضمانت دے سکتا ہے؟
یہ قرآن ہے جو خود اعلان کرتا ہے کہ اس کا خالق ہی اس کا محافظ ہے۔ خود تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی آج قرآن کا ایک ایک لفظ ویسا ہی ہے جیسا کہ نازل ہوا۔
اس کی سائنسی اور عقلی توجیہ کیا ہوسکتی ہے؟
ایک کتاب اپنی حفاظت کیسے کرسکتی ہے؟
کوئی بھی انسان مرنے کے بعد اپنی کتاب کی حفاظت نہیں کرسکتا تو بھلا ایک بے جان کتاب اپنی

حفاظت کا دعویٰ کیسے کرسکتی ہے! یہ کتاب کا نہیں خالق کا اعلان ہے۔ دیکھیں کہ حفاظت کا سسٹم کیسا ہے کہ انسانی دماغ اور قرآن کی تحریر میں ایک غیر معمولی تعلّق ہے جس کی وجہ سے یہ انسانی دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کے ذہن اور قلب میں محفوظ ہونا اسکے متن کی حفاظت کا بے مثال نظام ہے جو نسل در نسل اس کو لیکر چل رہا ہے۔ اسطرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب کو نازل کرنے والی ہستی زبردست قوّت والی ہے تبھی اس نے ایسا انتظام کیا کہ نہ تو اس کتاب کی تحریر کو بدلا جا سکے نہ اسے تباہ کیا جا سکے۔

قرآن کا چیلنج

قرآن انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کی بناوٹ میں کوئی نقص تو تلاش کرے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی نگاہ کو بار بار تلاش کرنے پھر بھی کوئی نقص نہیں ملے گا یہاں تک کہ وہ مایوس ہو جائے گا۔ اتنا بڑا چیلنج کوئی انسان تو انسان کو نہیں دے سکتا جو کہ صدیوں میں بھی انسان قبول نہ کر سکا بلکہ موجودہ دور کے علوم تو اور زیادہ پیچیدہ نظام کو دریافت کر رہے ہے جہاں پر عقل ہی حیران رہ جاتی ہے۔

گویا اب ہمارے پاس قرآن کے حق میں مزید دلائل آ گئے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن کے الفاظ کسی انسان کو نہیں بلکہ کسی نادیدہ ہستی ہی کو منسوب کیے جا سکتے ہیں۔

کامیاب تلاش

کائنات کے حقائق کی عقلی تلاش ہمیں آخر کار قرآن اور اسلام تک لے آئی ہے گویا ہم اُس ماوراءِ کائناتی رابطے Para-Universal Connection کو بظاہر پا گئے ہیں جسکی تلاش شروع کی تھی۔ مختصراً یہ کہ ہم نے خوش قسمتی سے ایک ایسا طبعیٔ واسطہ تلاش کر لیا ہے جو کہ بظاہر اپنی معنویت اور بلاغت کے اعتبار سے غیر مرئی دنیا سے کچھ نہ کچھ تعلق ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا آگے ہمارا مجوزہ موازنہ اب بذریعہ قرآن، اسلام اور سائنس کے حوالے سے ہی ہوگا۔

لیکن یہاں پر ایک عجیب بات یہ بھی ہوئی کہ جیسا کہ ہم سمجھ رہے تھے کہ اس کتاب کے حوالے سے طبعیٔ قانون (مصنف و کتاب) کی خلاف ورزی ہوئی ہے وہ غلط ثابت ہوا کیونکہ اس کتاب کے نفس مضمون کا تعلق بہر حال ایک غیر مرئی ہستی سے تو ہے، گویا ہم اپنی لغت کے اعتبار سے اور طبعی

قانون کے تقاضے کی خانہ پُری کے لئے اسے "مصنف" کہہ سکتے ہیں جب کہ یقیناً اس کی ماہیت مروّجہ مصنف سے بہت مختلف ہے۔لیکن انتہائی دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس ہستی کا تعلق اس ماوراء الوقت Para-Time, یالامحدود سے پَرے Beyond infinity سے ہے جس کا ہمیں کوئی طبعی علم نہیں ہے گویا یوں کہیں کہ وہ ہستی انسان ہرگز نہیں ہے۔گویا ہمارے سامنے ایک ایسی اچھوتی کتاب ہے کہ جوخودتو طبعی دنیا میں موجود ہے لیکن اس کا متعلقہ "تحریرکُنندہ" آفاق سے پرے ایک غیر مرئی دنیا یاعدم سے ہے۔اس طرح یہ کتاب ایک ایسا ذریعہ بن کر سامنے آتی ہے جوکہ دونوں جہان یعنی طبعی دنیا اور غیر طبعی دنیا کے درمیان رابطہ کار ہے۔گویا یہ ایک پُل bridge یا کڑی ہے جو Physical اور Metaphysical کو یکجا کر دیتی ہے۔

اگلے باب میں ہم مطالعہ کریں گے کہ قرآن میں کس حد تک قوّت ہے کہ وہ انسان کو مکمل ضابطۂ حیات فراہم کرسکتا ہے۔

باب ۹

خدائی سرگوشیاں۔ القرآن

سائنس اور مذہب کے درمیان ہم آہنگی کے حصول کے لیئے بالائے کائنات اشاروں کی علمی تلاش ضروری تھی جس میں ہم درجہ بہ درجہ منطقی پیش رفت سے وحی سے حاصل شدہ آخری آسمانی کتاب قرآن تک پہنچے تاکہ طبعی یا سائنسی دنیا اور غیر طبعی یا روحانی دنیا کے درمیان تعلق قائم کرنے کے ذرائع تلاش کیئے جائیں۔ انسان کی رہنمائی کے حوالے سے کائنات و زندگی کے بارے میں سائنسی نظریات انکی خامیوں کے ساتھ ہم پچھلے ابواب میں جان چکے ہیں۔ ہم اس باب میں قرآنی نظریۂ حیات کا مطالعہ کریں گے کہ یہ کس حد تک انسان اور کائنات کے بارے میں حقیقت پسندانہ نظریات کا حامل ہے اور اس کے آسمانی ہونے کے بارے میں مزید سائنسی شواہد حاصل کرنے کی جستجو بھی کریں گے۔ ہم قرآن کو جدید سائنسی دریافتوں اور نظریات کی کسوٹی پر بھی پرکھیں گے کہ آیا یہ کتاب جدید انسان کو کلّی مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آگے ہم اس مطالعہ کی ابتدا اُن غیبی توجیہات سے کریں گے جو کہ کائنات کی ابتدا، زندگی کی تخلیق، کائناتی مظاہر اور انسان کی زندگی کے چیدہ چیدہ رخوں سے متعلّق ہونگی۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی اہم موضوع پر سائنس کے نقطۂ نظر پر بھی نظر ڈالتے رہیں گے۔ یہ بھی واضح ہو کہ اگلے صفحات میں ہمارا عمومی مخاطب جدید انسان ہے جو سائنسی سوچ رکھتا ہے اور جسے ہم اسلام کی عقلی اور علمی (سائنسی) بنیاد کے اہم گوشوں کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ قرآنی فلسفۂ حیات انسان اور کائناتی مظاہر کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

تخلیق کی وجہ

قرآن: (سورۃ ۵۱، آیت ۵۶)

"اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا سوائے اس کے کہ ہماری عبادت کریں۔"

یہ درست ہی ہے کیونکہ انسان خود بھی ہر اس چیز پر جو اس نے تخلیق کی ہو حق جتلاتا ہے اسکے علاوہ انسان ان افراد پر بھی جو کہ گھر اور آفس کے ملازمین پر ہی مشتمل ہوں اپنا حکم چلانا چاہتا ہے۔ تو پھر

انسان کوبھی ایک برتر ہستی کے سامنے جھکنے کے لیے تیار رہنا چاہیے یہ ایک فطری قانون کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہرقوّت والااور برتر اپنی اطاعت اور تکریم چاہتا ہے نہ کہ وہ جو خالق بھی ہو۔ قرآن انسان کے علاوہ ایک اورطرح کی مخلوق کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے جسکوعموماًلوگ جانتے تو ہیں لیکن ہم اسکوآگے خالص سائنسی طور پر سمجھنے کی کاوش کریں گے کہ یہ کیا ہے۔

تخلیق کی حقیقت

قرآن:(سورۃ ٦،آیت ٣٢)

"دنیا کی زندگی کچھ نہیں بجز کھیل تماشے کے"

یہ انتہائی عظیم الشان اور لامحدود علم اورقوّت کے مقام سے مخلوق کے لیئے پیغام ہے۔روبوٹ کی فٹبال ٹیم کے حوالے سے پچھلے صفحات کی نگارشات پرغورہمیں انسان اوردنیا کی حقیقت بتاتا ہے۔

نظام کائنات

قرآن:(سورۃ ٤٠،آیت ٦٨)

"(اللہ)وہی ہے جوزندگی اورموت دیتا ہے۔

وہ جوچاہتا ہےتو کہتا ہے کہ ہوجااوروہ ہوجاتی ہے"۔

یہ نظام کائنات ایک لامحدود ہستی کے ارادے کانتیجہ ہے جس نے ایسانظام قائم کردیا ہے جوصرف ارادے کی قوّت سے چل رہا ہے۔اس سے زیادہ سمجھنے کی انسان میں صلاحیت نہیں ہے۔اس موضوع پرہم پچھلے ابواب میں بحث کرچکے ہیں کہ کس طرح انسان حواس خمسہ کے ایک خول میں مقیّد ہے۔

طبعی قوانین

قرآن(سورۃ ٥٤،آیت ٤٩)

"اللہ نے ہرچیزایک جبلت پرتخلیق کی"

قرآن(سورۃ ٦٥،آیت ٣)

"اللہ نے ہرچیز کاایک اندازٹھہرادیا ہے"

طبعی قوانین جن پرسائنسی عمارت کھڑی ہےاس کے بارے میں واضح تذکرہ قرآن نے اس طرح کیا کہ ہرچیزمعیّن قوانین کےتحت وقوع پزیرہوتی ہے دوسرے الفاظ میں ہرچیز کی ایک سرشت پر تخلیق کی گئی ہے کہ اس سے جدانہیں ہوسکتی۔ یہاں پرقرآن اورسائنس یک زبان ہوکرطبعی یا

کائناتی قوانین کی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں جبکہ قرآن کے مطابق ان تمام اعمال اور انکے ردِّ عمل اور اثرات کا مناسب طور پر اندراج ہے کیونکہ ہر قانون دراصل مابعدالطبعیّات کا حصہ ہے۔ گویا جدید علوم سے انسان نے کائنات کے نظم کی بنیاد کے اہم عنصر کو جان لیا۔

کائناتیں

قرآن: (سورۃ ۴۱، آیت ۱۲):

" پھر دو دنوں میں اس نے سات آسمان بنائے اور ہر آسمان کے اس نے قوانین بنائے،
اور ہم نے نیچے کے آسمان کو روشنی سے سجایا اور محفوظ بنایا۔
یہ ہے اس کارساز کی صناعی وہ غالب اور سب جانتا ہے"

یہاں قرآن ایک چھپی حقیقت بیان کرتا ہے جو کہ سائنسدانوں میں ابھی زیرِ بحث ہی ہے یعنی ایک سے زیادہ آسمان یا کائنات کی تصدیق! قرآن کے مُطابق ہر آسمان یا ہر کائنات میں اس کے اپنے قوانین ہیں جو ابھی تک ہم سے اوجھل ہیں جبکہ اِس کائنات کو روشنی Light کا خوگر بنایا، یہاں پر کائناتی قوّتوں forces of Nature کی طرف اشارہ ہے جن سے کائنات روشن اور قائم ہے! سائنس ابھی تک کسی دوسری کائنات کا سراغ نہیں لگا سکی ہے لیکن اگر دریافت بھی کی تو جدید معلومات کے مطابق بھی وہ ہماری کائنات سے بہت ہی مختلف ہوسکتی ہے شاید اجنبی قوانین اور بغیر روشنی کے ہی ہو۔ سرکردہ سائنسدانوں کا یہی نظریہ ہے ملاحظہ کیجئے:

"Our universe seems to be one of many, each with different laws. That multiverse idea is not a notion invented to account for the miracle of fine-tuning. It is a consequence of the no-boundary condition as well as many other theories of modern cosmology.

"ہماری کائنات بہت سی کائناتوں میں سے ایک ہوسکتی ہے۔ جس میں ہر کائنات الگ الگ قوانین کی حامل ہوگی۔ یہ نظریہ محض کسی مینا کاری کیلئے نہیں بلکہ یہ مختلف نظریات کے ٹھوس مطالعہ کا حاصل ہے۔"

The Grand Design, Stephen Hawking, Page 209)

غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ قرآن میں آخر کئی کائناتوں اور قوانین کا تذکرہ کیوں آیا۔ انسان تو اب اس قابل ہوا ہے کہ اس مفروضہ پر غور کرے جب کہ قرآن یقین کے ساتھ اس کو تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان کررہا ہے تو پھر یہاں پر قرآن تو سائنس سے ایک قدم آگے نظر آتا

ہے کیونکہ سائنس کا Parallel Universes دریافت کرنا ابھی باقی ہے اور وہ مفروضے کی حد تک ہی فعال ہے۔ یہ مزید ثبوت ہے کہ یہ انسانی تحریر نہیں!

عظیم شق یا بگ بینگ

قرآن: (سورۃ ۲۱، آیت ۳۰)

" کیا وہ جو ایمان نہیں رکھتے ، انہوں نے دیکھا نہیں کہ زمین اور آسمان بند تھے
پھر ہم نے انہیں کھول دیا"

کائنات کی تخلیق کی پہیلی کو بوجھتے ہوئے انسان اب Big Bang کے نظریئے پر پہنچا ہے جبکہ قرآن زمین اور آسمان کے یکجا ہونے کا اشارہ ۱۴۰۰ سال پیشتر دے چکا ہے! یہاں پھر قرآن ایک قدم آگے۔ یہ واضح رہے کہ قرآن نہ بگ بینگ کی تصدیق کر رہا ہے اور نہ ہی مسترد بلکہ ان منکرین کو جو اس کی حقیقت کی جستجو میں ہیں صرف ایک اشارہ دے رہا ہے کہ کیا اُنہوں نے جو ایمان نہیں رکھتے دیکھا نہیں کہ یہ باہم ملے ہوئے یا بند تھے؟ یہ آیت بظاہر دورِ حاضر یا مستقبلِ قریب کے لیئے ہی لگتی ہے۔ یہ عجیب کنائے کا پیش گوئی کرتا ہوا خطاب ہے کہ تخلیق کے عقدے کے حل کی جستجو میں منکرین خدا ہی یہاں تک پہنچیں گے! کیا ایسا نہیں ہو رہا؟ اس موضوع پر ہم پچھلے صفحات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ قرآن کے الفاظ یہی تاثر لیئے ہوئے ہیں کہ زمین اور آسمان جدا کیے گئے گویا انسان کے حوالے سے ایک مخصوص محدود وجودیت کی تخلیق کے بعد اسکے اندر تخلیقِ کائنات ہوئی۔ یہاں خالق خود اشارہ دے رہا ہے کہ وہ اس ماحول کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ میری ناقص رائے میں قرآن کا انسان کے حوالے سے خطاب اسی شعوری وجودیت کے دائرے کے اندر ہے! جبکہ ماورائے شعور وجودیت کے پیمانے عدم میں بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔

انسان و کائنات کا موازنہ

قرآن: (سورۃ ۴۰، آیت ۵۷)

"بالیقین آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے عظیم تر ہے
لیکن اکثر انسان جانتے نہیں"

قرآن: (سورۃ ۷۹، آیات ۲۷۔۲۹)

" کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی۔
اللہ نے اس کو بنایا اور اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی پھر توازن قائم کیا۔
اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔"

یہ قرآنی دعوٰی اس تناظر میں بڑا غور طلب ہے کہ اُس وقت کیا گیا ہے جب انسانی علوم بہ نسبت آج کے بہت نچلی سطح پر تھے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اگر کسی انسان سے دریافت کیا جاتا کہ انسان اور کائنات کا موازنہ کرو کہ کون زیادہ پیچیدہ ہے تو انسان جو صرف اپنے حواس خمسہ ہی سے کام لے سکتا تھا دیکھتا کہ آسمان پر تو چاند، سورج اور ستارے ہیں لیکن جب اپنے پر نظر ڈالتا تو آنکھ، کان، حرکت کرتا دل وغیرہ جیسے زیادہ پیچیدہ نظام کار فرما نظر آتے تو لازماً اس کا خیال یہی ہوتا کہ انسان کو بنانا مشکل تر کام ہے۔ لیکن قرآن اس وقت کہتا ہے کہ غور کرو کہ کائنات کی تخلیق مشکل تر ہے، اس طرح قرآن کائنات کو زیادہ پیچیدہ قرار دیتا ہے جو اُس دور کی انہونی بات تھی مزید یہ بھی اشارہ ہے کہ: لیکن اکثر انسان جانتے نہیں: یعنی اُس دور کا انسان لاعلم تھا! اگر یہ انسانی تحریر ہوتی تو یہ بات کوئی نہ کہتا، نہ ہی انسان کی لاعلمی کا دعوٰی کیا جاتا کیونکہ یہ تو اب عیاں ہو رہا ہے کہ کائنات کی وسعتیں اور کوسمولوجی (Cosmology) کی پیچیدگیاں کتنی حیران کن ہیں اور بمقابلہ انسان کی تخلیق عظیم تر تخلیق ہیں کیونکہ اس کائنات میں ہمارا نظامِ شمسی مٹی کے ذرّے کے مانند بھی نہیں ہے تو بھلا انسان کس گنتی میں! آج کے انسان کو معلوم ہے کہ کائنات کی وسعتیں ناقابل تصوّر ہیں اور اس میں موجود کہکشائیں اور اجرام فلکی کا نظم انتہائی حیران کن ہے جسے آج کی دریافتیں ثابت کر رہی ہیں۔ اس طرح قرآن کا اُس وقت کا یہ دعوٰی اسے ایک مستند آسمانی صحیفہ بناتا ہے۔ گو کہ سائنس خود بھی کائنات اور زندگی کی ابتدا کے نہایت پیچیدہ عوامل کی اصلیت کو آشکارہ کرنے سے قاصر ہے لیکن جدید سائنس خالق کو سمجھنے میں بہت معاون بھی رہی ہے۔ جوں جوں نئے شواہد سامنے آرہے ہیں وہ بہرحال ایک زبردست اور پنہاں قوّت کا پتہ تو دیتے ہیں۔

کائنات کا توازن

قرآن: (سورة ۵۵، آیت ۷)

"اس نے کائنات کو بلند کیا اور توازن قائم کیا۔

قرآن: (سورة ۳۵، آیت ۴۱)

"یہی سچ ہے کہ اللہ زمین اور آسمان کو تھامے ہوئے ہے اور گرنے سے بچائے ہوئے ہیں۔
اور اگر وہ گرتے ہیں تو اللہ کے علاوہ کوئی بھی ان کو نہیں سنبھال سکتا۔
اللہ ہی معاف کرنے والا ہے"

یہاں قرآن کائنات میں اجرام فلکی کے مابین حیران کر دینے والے زبردست توازن کی طرف

اشارہ کرتا ہے۔اس توازن کا حوالہ دیکر دراصل قرآن نے اس زبردست قوّت کی طرف توجہ دلائی ہے جسے ہم کشش ثقل کہتے ہیں۔اس قوت نے کائنات کے اربوں کھربوں ستاروں اور نظام ہائے شمسی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ کائنات میں کششِ ثقل مختلف رخوں میں عمل پزیر بھی ہورہی ہوتی ہے اور سارا نظام خودکار طریقے سے بغیر کسی لغزش کے چل بھی رہا ہوتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان اجرامِ فلکی کے درمیان ثقل کا توازن اتنا زبردست اور نازک ہے کہ کشش ثقل کی مقدار میں ذرا سا اضافہ یا کمی اس نظام کی ہیئت ہی بدل دے گی یہاں تک کہ یہ نظام تباہ بھی ہوسکتا ہے۔کھربوں اجرامِ فلکی اور نظامِ ہائے شمسی اس کائنات کے اندر معلّق ہیں اور ان میں ہرطرح کی گردشیں ہیں جس کی وجہ سے ہر طرف ایک مستقل حرکت ہے۔ہم یہاں مختصراً سیاروں کی مختلف گردشوں کا جائزہ لیتے ہیں۔کائناتی نظام ہائے شمسی میں ایک یا زیادہ سورج ہوتے ہیں۔ آسمان میں موجود آدھے ستارے کئی ستاروں یا سورجوں کے نظم Multiple Star System سے منسلک ہیں یعنی دو یا زیادہ سورج کے نظام سے۔اس کے سب سے سادہ نظام میں ستارے مختلف طرح سے دو سورجوں کے گرد گھومتے ہیں، کہیں دائرے کی شکل میں اور کہیں بیضوی، کبھی سورج کے قریب اور کبھی بہت دور۔ایک گردش انگریزی کے حرف 8 کی طرح بھی ہوتی ہے یعنی کسی سیارے کی ایک سورج کے گرد گھڑی کی سوئی کی سمت گردش clockwise تو دوسرے کے گرد اسکے مخالف یعنی anticlockwise لیکن ان سیاروں میں موسم کی شدت کی وجہ سے زندگی ممکن نہیں ہوتی ہے کیونکہ دائرے کی گردش ہی زندگی کیلئے سازگار ہے۔ ذرا دیکھیں کہ جدید سائنس ثقل اور کائناتی توازن کے بارے میں کیا کہتی ہے۔

۱۔**کشش ثقل**:اس کائنات میں کشش ثقل کمزور ترین قوّت ہے پھر بھی انتہائی توازن میں ہے۔اگر کشش ثقل ذرا بھی زیادہ ہوتی تو چھوٹے ستارے نہ بن سکتے اور اس میں ذرا کمی ہوتی تو بڑے ستارے نہ بن پاتے بلکہ کوئی بھاری عنصر بھی نہیں بن پاتا ہے، صرف سرخ ڈوارپ (Red Dwarf) ستارے ہی وجود پزیر ہوتے جن پر زندگی ممکن نہیں ہوتی۔

۲۔ **پروٹون اور نیوٹرون کا توازن**: پروٹون ایٹم کے نیوکلس میں پایا جانے والا سب اٹامک پارٹکل ہے، اسپر مثبت الیکٹرک چارج ہوتا ہے جو الیکٹرون کے منفی چارج کے برابر ہوتا ہے۔ نیوٹرون ایک سب اٹامک پارٹکل ہے جس پر کوئی چارج نہیں ہوتا۔ایک عنصر کے مستقل وجود کے لیئے

نیوٹرون کے مادّہ mass کا پروٹون سے زیادہ ہونا ضروری ہے لیکن یہ بھی ہزار میں ایک حصہ تک انتہائی باریک بینی سے دگنا ہونا چاہیئے، اس باریک تناسب میں معمولی سا اضافے کا مطلب ہے افراتفری۔ پروٹون کا مادّہ mass قطعیت کے ساتھ اتنا ہی ہوتا ہے جو کہ کائنات کے توازن کے لیئے درکار ہے اگر یہ ذرا بھی زیادہ یا کم ہو تو ایٹم یا تو جدا ہو جائیں گے یا پھر آپس میں ٹکرا جائیں گے اور ہر چیز جس میں وہ ہیں تباہ ہو جائے گی۔ اگر پروٹون کا مادّہ mass ذرا بھی زیادہ ہوتا تو وہ غیر مستحکم ہو کر نیوٹرون، پوزیٹرون اور نیوٹرینو میں تحلیل ہو جاتا۔ ہائیڈروجن کے ایٹم میں کیونکہ صرف ایک پروٹون ہوتا ہے لہٰذا اس کے تحلیل ہونے سے کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا کیونکہ وہ کائناتی نظام کا غالب عنصر ہے۔

http://www.pathlights.com/ce_encyclopedia/Encyclopedia/01-ma10.htm

اب ایک اور اہم رخ بھی دیکھیں کہ قطع نظر چار بنیادی قوّتوں، ثقل، برقی مقناطیسی، کمزور اور طاقتور ایٹمی قوّتوں کے اندرونی قطعی توازن کے ان قوّتوں کی انفرادی طاقت ایک دوسرے کے مقابلے میں زبردست فرق لیئے ہوئے ہے جہاں طاقتور ترین قوّت strong nuclear کمزور ترین ثقل gravity کے مقابلے میں دس ہزار ارب، ارب، ارب، ارب گنا طاقتور ہے! جبکہ ارتقاء کے اصول کے مطابق بگ بینگ کے وقت سب کو برابر ہونا چاہیے تھا۔ (یہاں پر یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ان قوّتوں کی طاقت ان معنوں میں ہرگز نہیں جو روزمرّہ کی زندگی میں مستعمل ہے بلکہ یہ خاص سائنسی صورتحال کی اصطلاح ہے) اسی طرح پروٹون سے نیوٹرون مادّی تناسب ہمیشہ سے یکساں ہے اس میں کبھی تبدیلی نہ آئی نہ آنی ہے۔ مندرجہ بالا مختصر حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ سائنس نے قرآن کے کائناتی توازن کے دعوٰی کی تصدیق کر دی لیکن سوال یہ ہے کہ آخر قرآن میں یہ تذکرہ اتنی صراحت سے کیوں آیا کیونکہ اُس دور کا انسان تو کائنات کے ایسے توازن کے بارے میں لاعلم تھا۔ کیا ان آیات میں خالقِ کائنات موجودہ دور کے انسان سے مخاطب ہے؟ یہاں پر مفکرّین سے سوال ہے کہ اگر تمام کائنات کا نظام صرف طبعی قوانین کے طابع ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ طبعی قوانین خود اپنی تخلیق بھی کریں اور کائنات میں ایسا توازن بھی قائم کریں جو ایک دو نظام شمسی نہیں بلکہ اربوں نظام ہائے شمسی کو تھام کر رکھے۔ کیا عقلِ انسانی اس کو منطقی بنیادوں پر تسلیم کر سکتی ہے؟ مزید یہ کہ اس آسمانی کتاب میں

سائنسی عجوبے کا تذکرہ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن ایک آسمانی کتاب اور خالقِ کائنات کا کلام ہے ورنہ انسان تو اب جان پایا ہے کہ کہکشاؤں اور کائنات میں توازن کی نوعیّت کیا ہے۔

کائنات کا پھیلاؤ

آیئے اب دیکھیں اس آسمانی کتاب میں ڈیڑھ ہزار سال پہلے کا ایک تہلکہ خیز انکشاف!

قرآن: (سورۃ ۵۱، آیت ۴۷)

"ہم نے آسمان بنائے اور ہم ہی ان کو پھیلا رہے ہیں"۔

کائنات کے پھیلاؤ کا تصوّر تو ابھی حال میں سائنسدانوں کے علم میں آیا ہے۔ جبکہ یہ حقیقت بہت پہلے قرآن بتا چکا ہے۔ سائنسدان اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

The metric expansion of space is the increase of the distance between two distant parts of the universe with time. It is an intrinsic expansion whereby the scale of space itself changes. This is different from other examples of expansions and explosions in that, as far as observations can ascertain, it is a property of the entirety of the universe rather than a phenomenon that can be contained and observed from the outside.

Cosmic Compendium: The Big Bang & Early Universe
by:Rupert W. Anderson pg 81

"خلاء کا پھیلاؤ دراصل کائنات کے دو حصوں کے درمیان وقت کے ساتھ بڑھتا ہوا فاصلہ ہے۔ یہ ایک جبلّی پھیلاؤ ہے جس میں جگہ کا اسکیل خود ہی تبدیل ہوتا ہے۔ یہ عام طرح کے پھیلاؤ سے مختلف ہے، جیسا کہ جہاں تک مشاہدے سے اخذ کیا جا سکے یہ کائنات کی کلیّت کی خاصیت ہے نہ کہ ایسا مظہر جس کا باہر سے مشاہدہ کیا جا سکے یا روکا جا سکے۔"

جدید سائنسی نظریہ کائنات کے ساکت ہونے کے خلاف ہے جو تجربات سے ثابت ہو رہا ہے۔ یہ پھیلاؤ ایسا ہے کہ جیسے غبّارہ پھولنے سے مختلف نقطوں کے درمیان فاصلے بڑھتے ہیں۔ بہت دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ سائنس کے مطابق ہر حرکت کرتے جسم کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی حرکت کو ہمیشہ برقرار رکھے گا تاوقتیکہ کوئی بیرونی قوّت اثر انداز نہ ہو، اس خاصیّت کو Inertia انرشیا کہا جاتا ہے۔ اب جدید سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہیں کہ کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا ہے تو اس کی وجہ وہ ایک نامعلوم توانائی کو بتاتے ہیں جسے اندھیری یا ڈارک توانائی Dark Energy کا نام دیا گیا ہے جو کششِ ثقل کے خلاف عمل پزیر ہے۔ کائنات میں پھیلاؤ کی

رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ ہے اور بہت سی دور دراز کہکشائیں اوجھل بھی ہوتی جا رہی ہیں!

حوالہ: "کائنات کے پھیلنے کی درست ترین پیائش ناسا کی خلائی دوربین اسپٹزر کی رہین منت ہے اور یہ بے مثال ہے۔ کائنات بذاتِ خود ۷۴۔۳ (74.3) کلومیٹر فی سیکنڈ فی میگا پارسیک (ایک میگا پارسیک تقریباً ۳۲ لاکھ نوری سال کے برابر ہوتا ہے) کی رفتار سے پھیل رہی ہے۔ اگر چہ کہ یہ نمبر سمجھنا ذرا مشکل ہے تو یہ جان لیں کہ یہ انتہائی ، انتہائی سے بھی تیز رفتار ہے اور اسمیں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گو کہ نئی پیائش سائنسدانوں پر یہ آشکارہ نہیں کرتی کہ کائنات کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے لیکن یہ راز سمجھنے میں ضرور مدد کرتی ہے کہ اس پھیلاؤ میں تیزی کیوں آتی جا رہی ہے۔ اس وجہ کو اندھیری توانائی کا نام دیا گیا ہے لیکن سائنسدان ابھی تک یہ نہیں جان پائے ہیں کہ یہ کیا ہے۔"

https://www.space.com/17884-universe-expansion-speed-hubble-constant.html

صرف یہی قرآنی انکشاف اور دعوی منکرین اسلام کے لیئے قرآن اور اسلام کی حقانیت کی بڑی سائنسی دلیل ہے۔ یہاں بھی قرآن سائنس سے ایک قدم آگے ہے۔

بے عیب کائنات

قرآن: (سورۃ ۶۷، آیات ۳-۴)

"جس نے تہہ بہ تہہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔
پھر پلٹ کے دیکھو تمہیں کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ
تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی"

اگر یہ کائنات خود بخود بنی ہوتی جیسا کہ کچھ سائنسداں خیال کرتے ہیں تو اسکے اندر بے ربطی اور خامیاں ضرور ہوتیں کیونکہ انسانی تجربہ یہی بتاتا ہے کہ بغیر انتظام اور مناسب منصوبہ بندی کے بغیر کوئی بھی کام خامیوں سے مبرّا نہیں ہوتا۔ قرآن کی طرف سے انسان یا جدید سائنس کو ایک کھلا چیلنج کہ اس کائنات میں عیب یا غلطی نکال کر دکھاؤ یقیناً یہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ یہ زبردست گرفت control کا اظہار بھی ہے کہ ایک عظیم الشان ہستی کس طرح کائنات کے عظیم الشان قوانین اور برتر ٹکنالوجی Superior Technology پر قادر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان ابھی تک کائنات میں کوئی نقص نہیں ڈھونڈ سکا۔ یہ مزید ثبوت ہوا کہ قرآن بلاشبہ ایک الوہی کتاب ہی ہے کیونکہ انسان کا انسانوں کو اتنا بڑا چیلنج دینا ایک غیر عقلی بات ہے۔

آسمان میں راستے

قرآن: (سورۃ ۵۱، آیت ۷)

" آسمان کی قسم کہ جس میں راستے ہیں" یا

" آسمان کی قسم کہ جس میں اِرتعاش ہیں"

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ

عربی زبان میں زبردست بلاغت ہے جس وجہ سے اس کے بہت سے مضامین کے مختلف مطالب بھی نکلتے ہیں تاکہ ہر دور میں یہ کتاب کارآمد رہے۔ حُبک کے معنی ہوا سے پیدا ہونے والے پانی اور ریت کے ارتعاش کے بھی ہیں۔ یہاں اس کا مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے کہ آسمان میں لہریں اور ارتعاش Waves & Vibrations ہے۔ جدید دور کی سائنس اور خاص طور پر خلائی سائنس کائنات کے سربستہ راز کو کھول رہی ہے، کائناتی شعائیں Cosmic Waves اور روشنی Electromagnetic waves تو اب ثابت شدہ ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل ایک کتاب میں درج یہ سائنسی بات ایک انسان کیسے لکھ سکتا تھا جب کہ اس وقت سائنسی علوم کا نام ونشان نہ تھا۔ یہی وضاحت ہوسکتی ہے کہ کیونکہ اسکا علم صرف کائنات کے خالق کو تھا اسی لئے اس نے اس کا تذکرہ کیا۔ کیا یہ قرآن کا کمال اور اُسکے آسمانی صَحِیفہ ہونے کا ثبوت نہیں کہ وہ ان باتوں سے بہت پہلے پردہ اٹھا چکا ہے۔

چابیاں

قرآن: (سورۃ ۴۲، آیت ۱۲)

"زمین اور آسمان کی کنجیاں اسی کی ہیں"

قرآن کائنات میں موجود ایک زبردست اور منظّم نظام کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ زمین اور آسمان میں حرکت پزیر ہر چیز اور ہر قانون اُس ہی کی دسترس میں ہے اور ایک نظم order کے تحت ٹھوس طرح سے مقفّل locked ہے جس کی چابیاں خالق کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ یہاں زمین وآسمان میں ان گنت مقفّل رازوں کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اُن تک رسائی کی چابی خالق کے پاس ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس نظام میں کوئی تبدیلی کر سکے ہاں اگر خالق ہی اس کی اجازت دے تب ہی انسان غیر معمولی کام کر سکتا ہے یعنی تخلیق میں بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے جیسے کہ کلوننگ وغیرہ اور جنیاتی سائنس Genetic Sciences۔

روح

قرآن (سورۃ ۱۷، آیت ۸۵)

"یہ لوگ روح کے متعلق تم سے پوچھتے ہیں
کہو یہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو اس کا کم ہی علم دیا گیا ہے"

یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جس پر قرآن اور سائنس میں اختلاف ہے۔ سائنس کسی بھی طرح کے روح کے تصّور کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ جبکہ مذہب اور قرآن اس کو زندگی کا بہت اہم عنصر قرار دیتے ہے۔ سائنس اس کو نہ ماننے کے باوجود خود بھی اس کا کوئی واضح اور ٹھوس متبادل بتانے سے قاصر ہے۔ سائنس اس ضمن میں مخمصے میں ہی ہے کیونکہ نہ وہ روح کو قبول کرتی ہے اور نہ ہی وہ خود سمجھ سکی کی زندگی ہے کیا؟ وہ یہ سمجھانے سے بھی قاصر ہے کہ Cell میں زندگی کیسے آجاتی ہے۔ یعنی زندگی کی ابتداء سائنسدانوں کے لیے ایک معمّہ ہے جس کو سارے جدید اور بے پناہ علوم کے باوجود سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر ہی ہیں۔ روح کی عقلی توجیہہ کے حوالے سے ہم کمپیوٹر سسٹم کی مثال لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کمپیوٹر سسٹم سوفٹ وئیر کے ذریعے کام کرتے ہیں۔ سوفٹ وئیر کیا ہے؟ یہ مختلف ہدایت کا ایک مجموعہ ہے جو توانائی کے ذریعے اثر انگیزی پا کر کمپیوٹر سسٹم کی طبعی باڈی یا ہارڈ وئیر کو زندہ کرتا ہے۔ سوفٹ وئیر بذات خود غیر مرئی ہے لیکن اس کی عمل پزیری یا اثر انگیزی مشین کی زبان Machine language کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ ہم ان ہدایات commands کو کاغذ پر لکھا دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ سوفٹ وئیر ایک روح کی طرح غیر مرئی ہی رہتا ہے۔ ہم اس سوفٹ وئیر کو دیکھ نہیں سکتے لیکن اس کی تصدیق کمپیوٹر کے کام کرنے سے ہو جاتی ہے یعنی "سوفٹ وئیر" ایک روح کی طرح کمپیوٹر کو زندہ کرتا ہے جب کہ ہم "سوفٹ وئیر" کو طبعی طور پر نہیں دیکھ سکتے کیونکہ یہ انسانی روح کی طرح abstract لیکن انسان کی تخلیق ہی ہے۔ زندگی کی حقیقت کے حوالے سے یہی وہ گم شدہ کڑی ہے جس کو سائنسدان نظر انداز کر رہے ہیں۔ روح کو تسلیم کیے بغیر سائنس زندگی کا معمہ حل نہیں کر سکتی بلکہ اس کی تگ ودو میں بھٹکتی ہی رہے گی۔

روح اور انسان کی تخلیق

قرآن: (سورۃ ۳۸، آیات ۷۱۔۷۲)

"جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا۔
میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں

پھر جب میں اسے پوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں
توتم اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤ۔"

یہ ایک انتہائی اہم اور معنی خیز مکالمہ ہے اسکے معانی کے تجزیے پر اختلافات بھی ہیں کہ کیا خالق کی روح واقعی انسان کے اندر ہے؟ دراصل یہ اختلافات اسی "وقت اور مادّے" کی اکائی میں مقیّد رہ کر مطالب اخذ کرنے کی سرشت کی وجہ سے ہیں کہ ہم مخصوص دائروں میں گردش کرتے خیالات کے حصار میں ہی سوچتے ہیں۔ وضاحت یہ کہ اگر خالق فرماتا ہے کہ میں نے اپنی روح پھونکی تو اب اگر ہم اس کو اپنے مروّجہ نظام حیات کے حوالے سے لیں گے تو یقیناً مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب انسان اپنی ہی روح کی حقیقت نہیں جان پایا تو خالق کی روح کا مطلب یا اس کی ماہیّت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ ہم اس کو یوں کیوں سمجھتے ہیں کہ ہماری روح کی طرح ہی اللہ یا خالق کی روح ہو گی۔ ایسا سوچنا بالکل ہی غلط ہو گا کیونکہ ہم تو اپنی روح کی ہی ماہیّت نہیں جانتے تو اس کا رب کی روح سے کیسے موازنہ کر سکتے ہیں۔ روح اسرار سے معمور کوئی مظہر ہے جس کی لاتعداد جہتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ خالق کا روح پھونکنا گویا اپنی لامحدود ہستی کے کسی گوشے یا پیرائے کا عکس one of infinit-dimensions ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے بہت سی صفات انسان کے اندر ودیعت کر گئیں اور انسان نائب اور خلیفہ بن گیا۔ (اس نکتے پر ہم آگے سائنسی نظر بھی ڈالیں گے) قرآن انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیتا ہی اس لئے ہے کہ اس میں خالق کی صفات کا عکس ہے۔ اسی لیے انسان کائنات میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تحقیقی جست لگانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ خالق کی عطا کی ہوئی صلاحیتیں ہی اسے ممتاز کر رہی ہیں اور خالق کی صفات کا عکس ہی انسان کو شرف بخشتا ہے۔ انسان پر اللہ کا انعام عظیم ہے کہ اسے عقل وخرد اور ارادہ عطا کیا اور ان کو بروئے کار لانے کے لیے اسباب مہیا کیے۔ تو ہم کیوں اس بحث میں الجھیں کہ روح پھونکنا کیا ہے۔ دراصل یہ طبعی ماحول کی سوچ کا اثر ہے کہ ہم مابعدالطبعیاتی (روحی) مظہر کو بھی طبعیات کی نظر سے دیکھتے مغالطہ کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ یہ نکتہ سطحی اور طبعی طور پر دیکھنے کا ہے ہی نہیں۔ یہ ماوراء العقل، ماوراء الوقت عدم سے منسلک اور انسانی ذہن کی سکت سے باہر ایک راز ہے اور بس! ہماری سوچ کا پیرایہ روح کے حوالے سے محدود ہے کیونکہ اس کا علم ہمیں کم دیا گیا ہے۔ آگے اس ضمن میں ہمارے تخیلات معطّل ہیں۔

انسان کی ساخت

قرآن (سورۃ ۹۵، آیت ۴)

"ہم نے انسان کو بہترین تقویم سے تخلیق کیا ہے"

قرآن (سورۃ ۲۳، آیت ۱۲)

"ہم نے انسان کو مٹی کے سَت سے بنایا"

قرآن (سورۃ ۳۲، آیت ۷)

"جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی اس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی"

ذرا انسانی جسم کی ساخت پر غور کریں قرآن دعوٰی کرتا ہے کہ انسان بہترین تقویم سے بنایا گیا ہے اور اس تقویم کی ماہیّت بھی بیان کی گئی ہے کہ مٹی سے ابتداء ہوئی۔ بظاہر "مٹی" کو ہم حقیر ہی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ہر طرف بکھری پڑی ہوتی ہے اور ہمارے قدموں تلے ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ 'مٹی' سے بنایا پھر مزید یہ کہ 'بہترین تقویم' سے بنایا، دراصل یہی خالق کی صناعی اور قدرت کا عظیم مظاہرہ ہے کہ یہ دونوں جملے جو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں درحقیقت بالکل درست ہیں اور اس کا ثبوت بھی کوئی اور نہیں جدید سائنس ہی فراہم کر رہی ہے۔ موجودہ سائنس نے یہ دریافت کیا ہے کہ انسانی جسم میں وہ تمام اجزاء شامل ہیں جو کہ زمین یا مٹی میں ہوتے ہیں۔ خالق نے مٹی سے ایسی تقویم تخلیق کی ہے کہ بے پناہ ترقی اور ہر چیز کی کیمسڑی معلوم ہونے کے باوجود جدید سائنس ابھی تک ہو بہو انسانی جسم کا کوئی حصّہ تو کیا ریشہ تک بنانے سے قاصر ہے۔

انسان کے بارے میں جدید انکشاف سے پتہ چلتا ہے کہ ایک اوسط 70 کلوگرام کے انسان کا جسم تقریباً 6.7x10^27 ایٹم سے بنا ہوتا ہے اور وہ ایٹم 60 کیمیکل عناصر کے ہوتے ہیں۔ یعنی ان عناصر کے اجزاء انسانی جسم میں پائے جاتے ہیں۔ مزید گہرائی میں جائیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان سمیت زمین پر موجودہ زیادہ تر چیزوں میں وہ تمام 88 عناصر کسی نہ کسی قابلِ پیائش تناسب میں موجود ہوتے ہیں جن سے کہ مٹی یا زمین بنی ہے۔ انسان اور جانوروں کی زندگی میں اہم مثبت کردار ادا کرنے والے عناصر 24 یا 25 ہیں۔"

یہ سائنسی انکشاف قرآن کی حقانیت کو مزید ثابت کرتا ہے جو ایک الہامی کتاب ہے۔ مندرجہ بالا قرآنی بیان جس کی اصلیت اور ماہیّت انسان ۱۴۰۰ سال قبل نہیں سمجھ سکتا تھا اسے اِس دور کے علوم نے سچ ثابت کیا۔

انسان کی پیدائش

قرآن:(سورۃ۷٦،آیات ۱۔۲)

"بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے
جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا۔ہم نے انسان کو ایک مخفوظ نطفے سے پیدا کیا،
تاکہ اس کا امتحان لیں۔اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

انسان کو یاددلایا گیا ہے کہ تم محض ایک بے نام چیز تھے یعنی تمہارا تذکرہ بھی نہ تھا لیکن تم کو نُطفے سے تخلیق کیا۔ یہاں پر ایک سپر سائنس کی طرف اشارہ ہے کہ کس طرح ایک نہ نظر آنے والا نظام مخصوص حالات میں حرکت پزیر ہوکر ایک انسان کو وجود میں لے آتا ہے اور اس سارے عمل میں جو کہ انتہائی جدید سائنس بھی نقل نہیں کرسکی ،دو اہم موڑ آتے ہیں وہ تو اپنا ثانی ہی نہیں رکھتے اور وہ یہ کہ ایک بچہ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت حاصل کرلیتا ہے۔کیونکہ یہ عمل ہمارے سامنے تسلسل سے ہوتا رہتا ہے لہٰذا ہم اس کو قدرتی سمجھ کر اس پر توجہ نہیں دیتے لیکن ذرا غور کریں کہ اس سارے عمل میں وہ کیا موڑ ہے جہاں پہ دونوں صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔یعنی گوشت کا بے جان لوتھڑا سننے لگتا ہے اور پھر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔کیا انسانی سائنس اس عظیم تر سائنس کا مقابلہ کرسکتی ہے؟ جدید سائنس پیدائش کے مراحل بہت تفصیل سے بتاسکتی ہے لیکن گوشت کے لوتھڑے میں جان اور شعور آنے کی وجہ جاننے سے قاصر ہے۔

انسانی پیدائش کے مدارج

قرآن:(سورۃ۳۹،آیت٦)

"وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد
ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔"

اب یہاں ایک اور فطری راز کا تذکرہ ہے۔راز اس لئے کہ یہ بات ۱۴۰۰سال قبل کہی گئی جب انسان اس قابل ہی نہ تھا کہ پیدائش کے مدراج کا ماں کے رحم میں مطالعہ کرسکے۔لیکن بظاہر یہ آیت اسی لیے شامل کی گئی کہ ایک وقت آئے گا جب انسان اس کی تصدیق کرے گا اور پھر یہ تصدیق قرآن کی حقّانیت کی بھی تصدیق کرجائے گی کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔سائنس کے مطابق رحم میں پیدائش کے تین تین ماہ کے تین مدراج ہیں۔ ہر مرحلے میں رحم میں قابل ذکر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جدید سائنس ان ادوار کو پیدائش کے تین مرحلے ----- Three

trimester period کا نام دیتی ہے۔

"حمل کے عمل کو تین ماہی دورانیئے کے بموجب بیان کیا جاسکتا ہے۔ ہر سہ ماہی دورانیہ بارہ سے تیرہ ہفتوں پر محیط ہوتا ہے۔ ہر دورانیہ میں حاملہ اور بچّے کے جسم میں قابل ذکر تبدیلیاں ہوتی ہیں"

http://www.livescience.com/44899-stages-of-pregnancy.html

زندگی سے موت تک

قرآن: (سورۃ ۴۰، آیات ۶۷_۶۸)

"وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر وہ تمہیں بچّے کی شکل میں نکالتا ہے۔ پھر تمہیں بڑھاتا ہے کہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ پھر اور بڑھاتا ہے کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ۔ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو، وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی ہے موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔"

قرآن انتہائی مختصراً لیکن بہت بلاغت سے انسان کو حقیقتِ زندگی سمجھاتا ہے کہ کس طرح ایک انسان وجود میں آتا ہے پھر پیدائش کے بعد رفتہ رفتہ وہ طاقت پکڑتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ قوّت والا جوان ہو جاتا ہے پھر وہ اور عمر رسیدہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بڑھاپا آجاتا ہے اور انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے یعنی موت آجاتی ہے۔ یہ بظاہر ایک عام سی بات نظر آتی ہے کیونکہ ہم اس پر غور نہیں کرتے کہ آخر عمر کیوں بڑھتی ہے آخر کیوں جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ آخر کیوں انسان ایک خاص عمر سے آگے نہیں بڑھ پاتا، یا انسان ہمیشہ زندہ کیوں نہیں رہتا؟ سائنسی تحقیق بتاتی ہے کہ انسانی خلیات جو ہر دم مرتے یا معدوم ہوتے رہتے ہیں، انکی جگہ نئے زندہ خلیات لیتے رہتے ہیں، لیکن پھر بھی انسان بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ انسانوں میں بڑھاپا ایک آفاقی امر ہے اور زمین کے تمام خطّوں میں یکساں طور پر ہر انسان ان مرحلوں سے گزرتا ہے۔ یہ زبردست نظامِ حیات ہر ذی حیات پر یکساں طور پر لاگو ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کی طرف سے انسان کو یاددہانی ہے کہ تم اپنی گزرتی عمر اور بڑھاپے کو روک نہیں سکتے۔ تم ایک عظیم قوت کے آگے بے بس ہو!

یہاں پر وجودِ خدا کے منکر سائنس دانوں سے چند سوالات ہیں۔

۱۔ وہ کیا ہے جو انسانی جسم کو زندہ رکھتا ہے لیکن خلیوں کو مارتا اور زندہ کرتا رہتا ہے۔

۲۔ فطرت ایسی زندگی کیوں نہ بنا سکی جسے فنا نہ ہو۔

۳۔ بڑھاپے کا عمل زندگی کو ایک مقام سے آگے کیوں نہیں جانے دیتا۔
۴۔ انسانی دماغ میں کچھ سیلز کیوں زیادہ عمر رکھتے ہیں۔
۵۔ دماغ کے غیر معمولی عمر والے زندہ cells کو کون بتاتا ہے کہ وہ مختلف عمر رکھیں۔

"امریکہ کا نیشنل انسٹیوٹ آف ہیلتھ کہتا ہے کہ بوڑھا ہونا فطرت کا سب سے کم سمجھا جانے والا عمل ہے۔"

http://longevity.about.com/od/whyweage/a/Understanding-The-Aging-Process.html

"سائنسدانوں نے کچھ ایسے پروٹین دریافت کیے ہیں جو طویل عرصہ زندہ رہتے ہیں۔ یہ نیورون نیو کلائی (Neuron Neucllii) کی سطح پر پائے جاتے ہیں۔ان کی زندگی دوسرے پروٹین کے مقابلے میں بہت طویل ہوتی ہے جو کہ زیادہ سے زیادہ 2 دن زندہ رہتے ہیں۔SALK انسٹی ٹیوٹ میں سائنسدانوں نے چوہوں کے دماغ میں ایسے پروٹین دیکھے جن کی زندگی اتنی ہی تھی جتنے وہ خود تھے"

http://www.sciencedaily.com/releases/2012/02/120203180905.html

بڑھاپا کی اصل وجہ ابھی تک واضح نہیں ہے اور اس کی تحقیق ابھی باقی ہے۔ یہ بہت ہی پیچیدہ عمل ہے جو مختلف نظام ہائے جسم کی وجہ سے ظہور میں ہوتا ہے اور بہت سی مختلف وجوہات کی بناء پر موجود ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ جب سیل فنا ہوتے وقت نئے سیل میں ڈھلتا ہے تو اس کی معلومات آگے منتقل ہونے میں الائنمنٹ کے فرق کی وجہ سے کچھ معلومات منتقل ہونے سے رہ جاتی ہیں جس سے صحت کی برقراری میں کمی آتی ہے یعنی نیا بننے والا سیل نامکمل معلومات کی وجہ سے کمزور ہوتا جاتا ہے۔قرآن کے مطابق خالق کائنات کی گرفت ہر طرح کی تخلیق پر ہے لہٰذا اس عظیم تر سائنس کے معمّے ہمارے سائنسدانوں کے لیے عجوبہ ہی ہیں یہاں پر قرآن کی برتری ثابت ہے۔

ضمیر

قرآن:(سورة ۷۵،آیات ۱۔۲)

"میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی،
میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی"

جب قرآن میں کسی چیز کی قسم کھائی جاتی ہے تو غور کرنے پر یا تو وہ انتہائی حیران کرنے والی ہوتی ہے یا انسان کے لیے انتہائی فائدہ مند۔ یہاں پر ضمیر یعنی ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھائی گئی ہے۔ یہ ہمارے ذہن کی ایک خصوصیت ہے جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط اور اس

دباؤ کے ساتھ کہ ہمیں درست کام ہی کرنا چاہیے، سائنس ہمارے اندر موجود اس خصوصیت کو واضح کرنے میں ناکام ہے کہ باہر کی دنیا سے دماغ کے ایک حصے کا وہ کیا تعلق ہے کہ وہ باہر کے اخلاقی معیار کے حوالے سے صحیح یا غلط پیدا ہونے والے خیال کو پرکھتا ہے پھر صحیح کو ترجیح دینے پر اصرار کرتا ہے۔

انسان اپنے اندر کس سے بات کرتا ہے؟

کون اس کو ترغیب دیتا ہے؟

آخر یہ آفاقی کیوں ہے؟

یعنی ہر انسان کے ذہن میں یہ خاصیت موجود ہوتی ہے جو اخلاق کے اچھے اور برے آفاقی رویوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ قرآن یاد دلاتا اور سمجھاتا ہے کہ انسان کے اندر یہ خصوصیت اس کے بچاؤ کے لیے خود حفاظتی نظام کے تحت تخلیق کی گئی ہے جو انسان کو ان منفی قوتوں کے مسلسل حملوں سے بچاتی ہے جو خیالات کی شکل میں ذہن میں ماحول کے مطابق وارد ہوتے ہیں۔ اس اہم موضوع پر جدید علوم یعنی ہماری سائنس بالکل خاموش ہے جبکہ قرآن نہایت مناسب توجیح پیش کرتا ہے کیونکہ قرآن وحی ہے اور ہر چیز کی غایت سمجھاتا ہے۔ یہاں بھی انسان پر ایک مغلوب کر دینے والی قوت کا اظہار ہوتا ہے جو انسان کے اندر ایک پر اسرار نظام اور اسکے خالق کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

جوڑے

قرآن: (سورۃ ۳۶، آیت ۳۶)

پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیئے، خواہ وہ
زمین کی نباتات میں سے ہو یا خود اِنکی اپنی جنس میں سے، یا اُن اشیاء
میں جن کو یہ جانتے تک نہیں۔

قرآن: (سورۃ ۴۲، آیت ۱۱)

"وہی آسمان اور زمین کا خالق ہے۔ جس نے جوڑے بنائے تمہارے اپنے اندر
اور مویشیوں کے تاکہ تمہاری تعداد میں اضافہ ہو۔ اس کی طرح کچھ بھی نہیں ہے
اس کائنات میں وہ سب کچھ سنتا ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔"

قرآن: (سورۃ ۵۱، آیت ۴۹)

"اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے کہ شاید تم اس سے کچھ سبق سیکھو۔"

یہ آیات اپنے مطالب کے حساب سے انتہائی عظیم الشان ہیں۔ان کی گہرائی کا اندازہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کا انسان لگا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس وقت طبعی دنیا کے علوم بہت ہی محدود تھے۔قرآن کی مذکورہ پہلی آیت انتہائی کثیرالجہتی ہے۔اس کا اطلاق کائنات کے ہر گوشے میں موجود چیزوں پر ہوتا ہے۔یعنی طبعی اور غیر طبعی عناصر پر۔یہ تخلیقی خصوصیت دراصل نظریہ ارتقاء Evolution ، جو یہ کہتا ہے کہ کائنات کا ارتقاء محض ایک خودکار نظام ہے، کے ماننے والوں کیلئے ایک تازیانہ ہے۔ آیئے ذرا پرکھیں کہ اس مبیّنہ خودکار نظام میں جو جو حیرتناکیاں اور پیچیدگی ہے کیا واقعی عقلی اور منطقی طور پر وہ خودبخود ممکن ہیں۔کسی بھی خودکار قدرتی نظام میں ہونے والی تخلیق کسی ضابطے کی محتاج تو ہو نہیں سکتی کیونکہ ضابطے کا تعلق انتظام سے ہے اور انتظام بغیر منتظم کے غیر منطقی اور غیر عقلی ہے۔ اگر ہم فرض کرتے ہیں کہ چلو یہ نظامِ زندگی اور کائنات خودکار ہی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں ہر نر male کے ساتھ مادہ female ہو۔ہر چیز کا تعلّق مثبت یا منفی طور پر کسی دوسری چیز سے ہو۔ایٹم سے لے کر فوٹون اور پارٹیکلز سے لے کر کہکشاؤں تک ہر جگہ یہ نظام حرکت میں نظر آتا ہے۔ایک ایسا نظام جس کو خود سائنس کھربوں سال کا قرار دیتی ہو اس میں بھلا تسلسل سے ایسا نظام کیسے چل رہا ہے کہ ہر جاندار اور بے جان کے اندر جوڑا نظر آتا ہے انسان، درند، چرند، پرند اور درخت وغیرہ میں جوڑے موجود ہیں۔کرنٹ میں مثبت اور منفی، یہاں تک کہ اخلاقیات میں ہر اچھے عمل کے ساتھ ایک غلط عمل منسلک ہے۔اگر ہم کائنات کے اہم ترین عناصر یعنی ایٹم اور فوٹون کے اندر جا کر دیکھیں تو وہاں پر بھی جوڑے نظر آتے ہیں۔DNA کے اندر بھی جوڑے کا تصّور عملی طور پر نظر آتا ہے۔عقل کیسے اس عظیم الشّان نظام کو محض اتفاق اور خودکار نظام تسلیم کرسکتی ہے؟ مزید یہ کہ اس نظام سے بظاہر استثناء بھی نظر آتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی خودکار نظام نہیں ہے ورنہ استثنائی صورتحال بھی نہ ہوتیں بلکہ یہ دلیل ہے کہ کسی خالق کا کنٹرول ہے۔آئیں کچھ جدید دریافتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کا یہ فرمان یا استدلال کہ (جوڑے) اُن اشیا میں جن کو یہ جانتے تک نہیں کس قدر گہرائی لئے ہوئے ہے!

ڈی۔این۔اے DNA: ڈی این اے نسلی معلومات کا منتقل ہوتا ہوا ذخیرہ ہوتا ہے جو ہر زندہ سیل یا نامیاتی جسم living organisms میں لونیہ یا کردموزوم کو بناتا ہے۔زندہ خلیوں میں DNA ایک اکائی کی شکل میں موجود نہیں ہوتا بلکہ جوڑے کی طرح موجود ہوتا ہے جو آپس میں سختی سے جڑے

ہوتے ہیں یہ دو لمبے دھاگوں کی مانند جو کہ اینٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ جڑے ہوئے ہوتے (helix) ۔DNA کے اندر معلومات کا کوڈ بھی دوہرا ہوتا ہے۔ایک اہم خاصیت اسکی جوڑے بنانے کی صلاحیت ہے، A-T اور C-G ، اے ٹی سے اور سی جی سے منسلک ہوتے ہیں۔

کروموزوم: ہر انسانی سیل میں چھیالیس کروموزوم ہوتے ہیں۔تیئس ماں اور تیئس باپ کی طرف سے۔ یہ تیئس جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں جس میں بائیس جوڑے یکساں اور ایک مختلف ہوتا ہے جو جنس کا تعیّن کرتا ہے اُس میں عورت کے دو ایکس جبکہ مرد کا ایک ایکس ایک وائی ہوتا ہے۔

https://ghr.nlm.nih.gov/primer/basics/howmanychromosomes

کوارک Quarks: ایٹم کے اندر کوارک ہوتے ہیں جو تین جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں مزید یہ ہے کہ ہر کوارک کا بھی ایک جوڑا Anti Quark یعنی منفی کوارک بھی ہوتا ہے ایٹم میں چھ کوارک ہوتے ہیں لیکن طبعیات کے ماہران کو تین جوڑے میں گردانتے ہیں یعنی اوپر / نیچے، چارم / اسٹرینج، چھت / فرش۔ .roof,floor up, down. charm, strange۔ پارٹیکل فزکس انہی کوارکس پر مبنی علم ہے۔

اینٹی کوارک Anti-Quark: ہر کوارک کا ایک منسلک اینٹی کوارک ہوتا ہے جسکا کوانٹم نمبر (Quantum Number) بھی مخالف ہوتا ہے۔ میسان Meson وہ پارٹیکل ہوتے ہیں جو کوارک اور اینٹی کوارک کے جوڑے سے بنتے ہیں۔ تیئس سال کی عرق ریزی کے بعد ایٹم کے اندر پروٹون کی جو جدید ترین اور صحیح ترین تصویر شائع کی گئی ہے اس میں جوڑے صاف نظر آتے ہیں۔ حوالہ درج ذیل ہے۔

https://phys.org/news/2015-07-hera-h1-zeus-publish-precise.html

ستاروں کے جوڑے: ایک دلچسپ حالیہ دریافت قرآن کے اس دعویٰ پر مہر تصدیق ہے۔حالیہ خلائی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ستاروں کے بھی جوڑے ہیں کیونکہ ان کی پیدائش بنیادی طور پر جڑواں ہوتی ہے۔اس تحقیق کے مطابق ہمارے سورج کا بھی جڑواں کائنات میں بہت دور موجود ہے۔

New evidence that stars are borne in pairs.

https://phys.org/news/2017-06-evidence-stars-born-pairs.html

کھال

قرآن: (سورۃ ۴، آیت ۵۶)

"جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا
انکو یقیناً ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو
ہم اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ عذاب کا خوب مزہ چکھیں۔
اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو
عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔"

اس قرآنی آیت میں ایک ایسی سائنسی حقیقت چودہ سو سال قبل آشکارا کر دی گئی جس کا پتہ سائنسدانوں نے حال ہی میں لگایا۔ یہ قرآن ہی میں کہا گیا ہے کہ انسان کی کھال ہی وہ ذریعہ ہے جو تکلیف کو محسوس کراتی ہے۔ عموماً تو یہی خیال تھا کہ یہ ہمارا دماغ ہے جس کو تکالیف کا احساس ہوتا ہے لیکن جدید سائنس کہتی ہے کہ کھال کے اندر درد محسوس کرنے والے ریسپٹر Receptor موجود ہوتے ہیں اگر کھال جل جائے تو درد محسوس نہیں ہوسکتا۔ اس طرح سائنس نے ایک زبردست سسٹم کی تصدیق کی جو خود نہیں بن سکتا۔

انگلیوں کی پور

قرآن: (سورۃ ۷۵، آیات ۳-۴)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے۔ کیوں نہیں؟
ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں"

قرآن کی حقانیت کا ایک اور بیّن ثبوت یہ سائنسی انکشاف ہے کہ ہر انسان کی انگلیوں کے نشانات مختلف ہوتے ہیں۔ یہ کیسی حیرتناک بات ہے کہ اربوں انسان جدا جدا انگلیوں کے نشان رکھتے ہیں لیکن اپنی بے ثباتی پر پردہ ڈالتے ہوئے سائنس اسکو جین gene کا کرشمہ قرار دیتی ہے یعنی ہمارے اندر جنّیاتی ڈائرکشن ہی اس بات کا ذمے دار ٹھہرتا ہے کہ انگلیوں کی پور کیسی ہو! یہ کتنا عقلی استدلال ہے آپ خود فیصلہ کرلیں۔ لیکن اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ انسان کے اندر عمل پذیر جنّیاتی نظم کو یہ علم کیسے ہوتا ہے کہ باقی اربوں انسانوں کے انگلیوں کے نشانات کیسے ہیں تبھی تو جدا پور بن سکتی ہے۔ گویا اس انوکھی تخلیق کے لیئے ایک عظیم ڈیٹا بیس کا موجود ہونا لازمی ہے جو کسی مرکزی نظم کے طابع ہو ورنہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ذرا دیکھیں کہ انٹرنیٹ کنکشن کے لیئے دستیاب

ایڈریس جسے انٹرنیٹ پروٹوکول کہتے ہیں کسی ایک مخصوص صارف کو دیا جاتا ہے جس سے اسکی شناخت ہوتی ہے لیکن اس آئی پی ایڈریس کا اجراء ایک سسٹم اور عظیم ڈیٹا بیس کے ذریعے ہی ہوتا ہے جس میں پہلے سے موجود تمام ایڈریس سے مختلف ایڈریس جاری کیا جاتا ہے گویا اس کے پیچھے ایک بڑا نظام ہے۔ پھر بھلا انسان کے اندر ایسا نظم کہاں ہے جس میں تمام انسانوں کی انگلیوں کا ریکارڈ ہو؟ یہ مضحکہ خیز اور غیر علمی تشریح اپنی کم علمی کو چھپانے یا حقیقت کو نظرانداز کرنے کی ناکام کوشش ہے۔ قرآن میں ۱۴۰۰ سال قبل یہ اشارہ دیا گیا کہ خالقِ حقیقی نہ صرف دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے بلکہ وہ ہر انسان کو اس کی انگلیوں کے نشان سمیت زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یہاں خالق کی خلاّقی انسانی فہم سے ماوراء ہو جاتی ہے کہ اتنی کثیر تعداد کے افراد کی انگلیوں کے نشان تک اللہ تعالیٰ کے علم میں کیونکر محفوظ ہیں۔ یہ اللہ کی لامحدود گرفت کا اظہار ہے اور اللہ کے علم کی وسعت کی ایک جھلک ہے جسکو جدید سائنس نے آشکارہ کیا۔ اس بات کے تذکرے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ خالق کو انسانی علوم کی ترقی کے مدارج کا علم ہے کہ کب انسان اس آیت کی اصل حقیقت کو سمجھ پائیگا۔

لباس

قرآن: (سورۃ ۷، آیت ۲۶)

"اے ابن آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم
کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت
اور زینت کا ذریعہ بھی ہو۔ بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی
نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔"

دیکھیئے کہ جب خالق کسی تخلیق کا خصوصی تذکرہ کرتا ہے تو وہ ایک غیر معمولی چیز ہوتی ہے۔ لباس کو خالق کی نشانی قرار دیا گیا تو اس پر غور ضرور ہونا چاہیے کہ آخر لباس درجہ بدرجہ کس طرح اتنی ترقی کر پایا، انسان نے روئی اور اون سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ یقیناً سوچ کے کئی مرحلوں پر خالق نے نئے نئے خیالات کو اجاگر کر کے انسان کی مدد کی۔ خالق نے لباس کی تخلیق کا شعور دیا اور قدرتی طور پر لباس کا بہترین کپڑا انوکھے طریقے سے مہیا بھی کیا۔ لباس کپڑے سے بنتا ہے اور سب سے قیمتی اور نفیس کپڑا ریشم ہوتا ہے یہ ریشم ایک کیڑا بناتا ہے مگر جس طرح ریشم کی تخلیق ہوتی ہے وہ بے مثال اور انوکھی ہے۔ ایک لاروا جس کی زندگی کا مقصد صرف ریشم بنانا ہوتا ہے وہ ریشم بنانے سے

پہلے انڈہ دیتا ہے پھر اپنی کھال یا جسم سے اپنے چاروں طرف ریشم کا جال بناتا جاتا ہے یہاں تک کہ اسمیں محصور ہو کر خود مر جاتا ہے۔ یہ نظام نظریۂ ارتقاء میں انوکھا طرز ہے جس میں زندگی اپنی قبر، جو کوکون Cocoon کہلاتی ہے، خود بناتی ہے اور اسی سے ریشم بنتا ہے۔ ایک کیڑا آخر انسان کی ضروریات کے لیئے اپنی جان کیوں دیتا ہے؟ اسکا جواب سائنس کے پاس نہیں مذہب کے پاس ہے۔ یہاں پر نظریۂ ارتقاء کے حمایتوں کے لیے بھی کچھ سوالات اُبھرتے ہیں یعنی اگر یہ فطرت اور قدرت کا خود کار نظام ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے تو پھر اس نے انسانی جلد کو ہی پرندوں اور جانوروں کی طرح کوئی لباس کیوں نہ بنایا؟ اس طرح تو فطرت نے انسانوں کو روئی اور اون کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جبکہ سائنس کے مطابق ارتقائی اُٹھان تو مزید آسانیوں کی ضامن ہوتی ہے! پھر مزید یہ کہ نظریہ ارتقاء میں وہ کون سا مرحلہ آیا کہ بن مانس یا انسان کو شرم و حیا آئی کہ اپنا ستر چھپائے؟

آخر وہ کون سا طبعی یا فطری قانون حرکت میں آیا جس نے حیا کے جذبات کو پیدا کیا؟

اور وہ فطری قانون اس سے پہلے کہاں تھا؟ اور یہ قانون پیدا ہی کیوں ہوا؟

نظریۂ ارتقاء بہت کمزور بنیاد پر قائم ہے اور لاتعداد سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ حیا یا شرم خالق کی تخلیق ہے جو اسلام کی بنیاد بھی ہے، اسی پر مہذّب معاشروں کی تعمیر ہوتی ہے اور یہی اخلاقیات اور شائستگی کا منبع ہے۔ یہ قرآن ہے جو بتاتا ہے کہ شرم و حیا اور لباس کیا ہے اور لباس کیوں پہننا چاہیے۔ قرآن کے ابتک کے تمام استدلال منطقی ہیں۔

غذا

قرآن: (سورۃ ۸۰، آیات ۲۴۔۳۲)

"پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے، ہم نے خوب پانی برسایا، پھر زمین کو
عجیب طرح سے پھاڑا، اور اس کے اندر اگائے، انگور اور ترکاریاں،
زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے،
تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے سامان زیست کے طور پر۔"

وہ بیرونی نظام جو انسانوں اور جانداروں کو غذا فراہم کرتا ہے دراصل بہت ہی منظّم ہے اور زندگی کو رواں رواں رکھنے میں بہت معاون ہے۔ انسان کا اس نظام سے کوئی براہِ راست تعلّق نہیں لیکن انسانی غذا کا انسان کے اندر کے نظام سے گہرا تعلّق ہے۔ غذا کا نظامِ ہضم سے تعلّق بہت معنی خیز

ہے یہاں پر نظریہ ارتقاء پر ایک اور ضرب پڑتی ہے کہ فطرت نے انسانی غذا کو سادہ کیوں نہ رکھا جیسے جانور اور پرندے خالص قدرتی غذا پر گزر کرتے ہیں۔

کیسے اور کیوں بیرونی دنیا سے ہم آہنگ نظامِ ہضم انسان کے اندر بنا؟

آخر اتنی پیچیدگیاں صرف انسانی زندگی کے لیے ہی کیوں درکار ہوئیں؟

کیا ارتقاء ایک آزاد انسان کی تخلیق میں ناکام ہوا؟

قرآن غذا کو انسان کی رگِ حیات قرار دیتا ہے تو بتاتا بھی ہے کہ اس کی زندگی کے لیے یہ نظام بھی خالق کی تخلیق ہے۔ دراصل طبعی قوانین اور فطری اِرتقاء ثابت شدہ حقیقتیں ہیں۔ لیکن یہ سائنسی نظریہ کہ یہ خود کار نظام کے تحت ظہور پزیر ہو رہی ہیں، غیر منطقی اور خود طبعی قانون (نظم اور ناظم) ہی کے حوالے سے غلط ہے۔

گفتگو

قرآن: (سورۃ ۵۵، آیات ۳۔۴)

"اس نے انسان کی تخلیق کی اور اسے بولنا سکھایا"

ذرا غور کریں کہ ہم کس طرح بولتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ہماری سانس، پھیپھڑے، آواز کی نالی، حلق، زبان، ہونٹ، وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ انسان ہزار ہا زبانیں بولتا ہے۔ آخر یہ کیسا نظام ہے جو محض چند حیاتیاتی پرزوں سے ہزاروں زبانیں ایجاد کر رہا ہے جس میں ہوا بنیادی عنصر ہے جو کہ انسان کے طابع نہیں ہے لیکن پھر بھی بولنے کے اندر اس کا کردار مرکزی ہے۔ ہم جو کچھ سنتے ہیں وہ بھی ایک زبردست نظام کے تحت ہے جس کے ردِّعمل میں ہم بولتے ہیں۔ دراصل قرآن انسان کو یاد دلاتا ہے کہ یہ صلاحیّت کسی فطرت کا عطیہ نہیں ہے بلکہ عظیم الشان تخلیق ہے کہ انسان ہزار طرح کی زبانیں بولتا ہے اور یہ کہ ہر انسان کی آواز بھی جدا ہوتی ہے اس میں مرد اور عورت، بچّے اور بچیوں کی تخصیص علیحدہ ہے یعنی ہر عمر کا انسان اپنی آواز سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ یہ خالق کی انتہائی عظیم عطا اور عظیم تر سائنس کی ایک جھلک ہے۔ بی بی سی کی رپورٹ ملاحظہ ہو۔

"اندازاً دنیا میں ۷۰۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں ۹۰٪ ایک لاکھ سے کم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ دس لاکھ سے زائد لوگ ۱۵۰ - ۲۰۰ زبانوں میں بات کرتے ہیں۔ ۴۶ زبانوں کے بولنے والے تنہا ہیں۔ ایشیا میں ۲۲۰۰ زبانیں جبکہ یورپ میں صرف ۲۶۰ زبانیں پائی جاتی ہیں۔ تقریباً تمام زبانوں کی گرامر ایک جیسی ہے۔"

http://www.bbc.co.uk/languages/guide/languages.shtml

سوال یہ ہے کہ کیا کسی نظریۂ ارتقا کی وجہ سے ۷۰۰۰ زبانیں ظاہر ہوتی گئیں یا کوئی ذہین تخلیق ہے؟ کیا چند حیاتیاتی عضو بغیر کسی کنٹرول کے اتنا بڑا اور منظّم کام کر سکتے ہیں؟

انتقالِ علوم

قرآن: (سورۃ ۲، آیت ۳۱)

"اس نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے"

یہاں پر قرآن انسانی علوم کے منبع کے حوالے سے مخاطب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آدم کو پوری کائنات میں موجود ہر چیز کا نام سکھایا، کیونکہ نام کا تعلق ہی علم سے ہے تو گویا ہر چیز کا علم عطا کیا گیا۔ پارٹیکلز سے لیکر کہکشاؤں کے نظام تک اس میں سب ہی شامل ہوئے جنکے نام سکھائے گئے یعنی پڑھا دیئے گئے۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانی ذہن میں معلومات منجمد ہیں اور ریسرچ اور غور و فکر ہی سے زندہ ہوتی ہیں یا یوں سمجھ لیں کے کائنات میں علوم پنہاں ہیں اور انسان ان کو کوشش سے حاصل کر سکتا ہے۔ تمام جدید تحقیقات اور مختلف شعبہ ہائے ریسرچ ان بے پناہ اور پنہاں علوم کو حاصل کرنے کی انسانی کاوشیں ہیں۔ قرآن بہت وضاحت سے بتاتا ہے کہ سارے کائناتی علوم انسان ہی کی میراث ہیں۔ اس سے بہتر توجیہہ کہ پوشیدہ علوم دراصل انسان کی گم شدہ متاع ہے اسلام کے علاوہ کس نے دی؟ قرآن ایک برتر رہنما کی طرح عیاں ہے!

لیکن جدیدیت کے حامیوں سے یہ سوال ضروری ہے کہ:

علوم کیسے تخلیق ہوئے؟ کیا کائنات لاتعداد علوم لیکر ظاہر ہوئی؟ حسابی اور الجبرا کے قوانین جن پر کائنات کی قوّتیں عمل پیرا ہیں آخر وہ کیوں اور کیسے بنے؟ کائنات کے ہر گوشے بلکہ ذرّے ذرّے کی وضاحت کے لیئے نو بہ نو علوم کہاں سے کائنات کے ساتھ وارد ہوئے؟

نائبِ خالق

قرآن: (سورۃ ۲: آیت ۳۰)

"اور جب خالق نے کہا فرشتوں سے کہ میں زمین میں اپنا
خلیفہ مقرر کرنے جا رہا ہوں۔"

قرآن: (سورۃ ۷، آیت ۱۰)

"ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لیے
سامانِ زیست فراہم کیا مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

اسلامی نظریہ حیات کی تشریح کرتے ہوئے قرآن انسان کو ایک بلند مقام عطا کرتا ہے۔ خالق نے اپنی بہت سی صفات کا عکس انسان پر ڈالا اور اس کو عقلِ سلیم سے نواز کر کائنات میں اعلیٰ ترین منصب عطا کیا۔ انسان کو خلیفہ خدا بنا کر نہ صرف اس میں خالق کی بہت سی صفات ودیعت کی گئیں بلکہ کائنات میں تصرّف کے وسیع اختیارات بھی تفویض کیئے۔ ایک نائب وہ تمام کام کرنے کا مکلّف ہوتا ہے جنکا اختیار مالک منتقل کرتا ہے اور موجودہ علوم کی ترقّی اس بات کا ثبوت ہے کہ جو کچھ قرآن میں بیان ہے وہ سچ ہے۔ اس کے مقابل جدید سائنس انسان کو جانور کا تسلسل قرار دیکر انسان کی توہین کرتی ہے۔ لیکن بندر کی نسل سے انسان بننے یعنی جانور کے اندر دانش کی آمد اور عقل حاصل کرنے کی سائنسی توجیہات عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر علمی موشگافیاں ہیں۔ سائنس نے انسان کو حقیر جانور جانا جبکہ اسلام نے مناسب مرتبہ عطا کیا۔ قرآن کی توجیہہ تاریخ اور علوم کے ترقّی سے ثابت ہے جبکہ سائنس کی وضاحت نہ عقل کے معیار پر پوری اترتی ہے نہ مکمل ثابت شدہ علم سے۔

گواہی

قرآن: (سورۃ ۷، آیات ۱۷۲۔۱۷۴)

"اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بَنی آدم
کی پُشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا، اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے
پوچھا تھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور آپ ہی
ہمارے رب ہیں اور ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ تم قیامت
کے روز یہ نہ کہو کہ ہم اس بات سے بے خبر تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ شرک کی ابتداء تو
ہمارے باپ داداؤں نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد میں ان کی نسل سے
پیدا ہوئے پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں
نے کیا تھا۔ دیکھو اس طرح ہم اپنی نشانیاں واضح طور پر دیتے ہیں۔
اور اس لیے کرتے ہیں تاکہ تم پلٹ آؤ۔"

یہ ایک عجیب پیرایۂ گفتگو ہے جس میں انسان سے ایک ایسا وقت یاد کرنے کو کہا جارہا ہے جس کا بظاہر کسی کو علم نہیں! لیکن بہر حال سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ انسان کے لاشعور میں یہ بات تو موجود ہی رہتی ہیں کہ خدا ہے۔ انسانوں میں اللہ یا خدا کے وجود پر مسلسل بحث دراصل وہی ذہن

میں پیوست ااعتراف ہے جومختلف شکلوں میں اپنا اظہار ہر دور میں کرر ہا ہوتا ہے یہانتک کہ ایک منکرِ خدا بھی خدا کا تذکرہ کرر ہا ہوتا ہے۔تو بھلا اگر خدا کا وجود ہے ہی نہیں تو پھر ہم اس پر بات ہی کیوں کرتے ہیں؟ یہ بار بار ہمارے خیالات میں کیوں آتا ہے؟ دراصل یہی وہ اعترافِ بندگی ہے جو ہرانسان کے ذہن میں، خواہ جاہل ہو یا پڑھالکھا زندہ رہتا ہے اور قرآن نے یہاں اس کی وجہ بھی بتادی ہے کہ یہ روح کا اقرار ہے۔دنیا میں بہت کم انسان خدا کے منکر ہیں شاید چند فیصد لہذٰا اکثریت کا خدا کو ماننا ہی اس اقرار کا اظہار ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرر ہا ہے۔انسان کا عمومی شعور خدا کے وجود کو آسانی سے مانتا ہے کیونکہ یہ فطری ہے جب کہ منکرین خدایا تو ضدّ اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا پھر انسان کو اُسکے علم کی زیادتی کا بوجھ بھٹکا دیتا ہے! یہاں یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ روزِ حساب انسان کا یہ عذر نہیں چلے گا کہ ہم تو باپ دادا کے نقش قدم پر چلتے رہے کیونکہ انسان کو اللہ کی حاکمیت کی بار بار مثالوں اور روحی اشاروں سے شعور و آگہی دی گئی ہے۔

تصوّر کی حدود

قرآن: (سورة 32، آیت 17)

"پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے
چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے۔"

انسان کی سوچ کی محدودیت کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ ان کا انعام ہے وہ مخفی ہے اور کسی سانس لینے والے کو اس کا پتہ نہیں۔ گویا وہ اشیاء یا انعام انسانی سوچ سے باہر ہیں۔اس طرح قرآن انسان کو سمجھاتا ہے کہ تمہاری فکر کی پرواز خواہ کتنی بلند ہو وہ بھی ایک حد رکھتی ہے اور خالق کے پاس نعمتیں اس حد سے باہر بھی ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جو پچھلے ابواب میں سمجھ چکے ہیں۔یہی طرزِ تکلم انسان کے جدید علوم کی محدودیت کو مزید آشکارہ کرتا ہے۔

انسان کا دشمن

قرآن: (سورة 7، آیات 17-11)

"ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا
آدم کو سجدہ کرو اس پر سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔
پوچھا کہ تجھ کو کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا،
بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے،

فرمایا اچھا تو یہاں سے نیچے اتر تجھے حق نہیں کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔
نکل جاؤ کہ درحقیقت تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی ذلت چاہتے ہیں۔
بولا مجھے اس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔"

یہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو ہر وقت کوئی نہ کوئی منفی خیال ستاتا رہتا ہے۔خیالات کی یہ جنگ دراصل اسی غیر معمولی صلاحیّت کے حامل اس منفی کردار کی وجہ سے ہے جو کہ زمین پر انسان کے خیالات اور قلب پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔انسان کے امتحان کے لیئے ایسے کردار کا ہونا ضروری بھی ہے۔ الحادی نقطۂ نظر سے یعنی کائنات کی اچانک خود تخلیقی اور نظریۂ ارتقاء کی رُو سے تو اچھائی اور برائی ہونی ہی نہیں چاہیئے تھی لہٰذا انسان کے اندر ہر لمحہ ابھرتے اچھے اور برے خیالات ان دونوں نظریوں کی نفی ہیں اور یہی سوال ابھرتا ہے کہ اگر کائنات ذہین تخلیق نہیں تو پھر اچھائی اور برائی کا تصوّر کیوں ہے اور برائی میں کشش کیوں ہے؟ جدید علوم اس بارے میں مُہر بلب ہیں اس لیئے یہاں پر عقلی اور منطقی بنیاد پر قرآن کی تصدیق ہوتی ہے کہ کوئی نادیدہ قوّت ہے جو انسانی خیالات میں رسائی رکھتی ہے۔قرآن کی یہ توجیہ ہماری اس پُراسرار اور پیچیدہ ذہنی کیفیت اور منفی خیالات کی آمد کی مناسب وضاحت ہے۔

نیند

قرآن: (سورۃ ۷۸ آیت ۹)
" اور نیند کو باعثِ راحت بنایا۔"
قرآن: (سورۃ ۲۵ آیت ۴۷)
" اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیئے لباس،
نیند کو سکون اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا۔"

قرآن تین چیزوں کا تذکرہ کر رہا ہے رات، نیند اور دن اور یہ کہ نیند کو انسان کی راحت اور سکون کے لیئے بنایا گیا۔ نیند انسان کی تخلیق میں اہم عنصر ہے جو انسان کو تازہ دم کر دیتا ہے۔اس نہایت مربوط نظامِ کائنات میں انسان محض ایک کَل پُرزہ نہیں بلکہ اس نظام کا محور ہے جسے ایک مقصد کے تحت یعنی ایک امتحان کے لیئے یہاں اُتارا گیا ہے۔انسان کو فعّال رکھنے لیئے دن بنائے گئے اور خواہشات کی تکمیل کے لیئے عمل کا خوگر بنایا جس کے لیئے روشن ماحول ترتیب دیا گیا، پھر تکان کا احساس دیا کہ انسان تھکتا ہے۔دوبارہ چاق و چوبند ہونے کے لیئے آرام کو ضرورت بنایا گیا اس

کے لیئے رات کومخلوق کے آرام کا وقت رکھا گیا۔ رات طاری ہوتی ہے تو لباس کی طرح ماحول کو ڈھک لیتی ہے جس سے نیند طاری ہوتی ہے اور انسان سکون کی کیفیت میں چلا جاتا ہے اور اسکی توانائی بحال ہوجاتی ہے پھر روشن دن آجاتا ہے۔ نیند شعور کا تبدیل ہوتا فطری مرحلہ ہے جس میں تمام حواس اور جسم کے عضلات اطراف کے ماحول سے لاتعلق ہوجاتے ہیں۔ نیند کی سائنسی توجیہہ یہی ہے کہ یہ ایک کیفیّت ہے جو کہ تھک کر طاری ہوتی ہے اور جدید سائنس اس بارے میں خاموش ہے کہ آخر ارتقاء میں نیند کی ضرورت کیوں پڑی، انسان اور جاندار اس کے محتاج کیوں ہوئے؟ ملاحظہ کریں۔

So why do we sleep? This is a question that has baffled scientists for centuries and the answer is, no one is really sure... Lack of sleep has serious effects on our brain's ability to function.

http://www.bbc.co.uk/science/humanbody/sleep/articles/whatissleep.shtml

"تو ہم کیوں سوتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس نے سائنسدانوں کو صدیوں سے چکرایا ہوا ہے اور جسکا جواب یہ ہے کہ کسی کو نہیں پتہ۔۔۔۔۔ نیند کی کمی دماغ کی صلاحیتوں پر برا اثر ڈالتی ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ کتنے اہم معاملے میں سائنسداں گومگو کا شکار ہیں اور اسے بھی غالبًا ارتقاء کے عمل کی کوئی کروٹ ہی سمجھتے ہیں۔ نظامِ زندگی میں نیند کا داخل ہونا محض اتفاق اسی وقت سمجھا جاتا جب نیند صرف انسان پر طاری ہوتی لیکن نیند عمومی طور پر زندگی کے ساتھ منسلک ہے خواہ انسان ہو یا چرند، پرند اور درند سب ہی اس کے اسیر ہیں۔ نیند نہ ہوتی تو جاندار کھوئی ہوئی دماغی اور جسمانی توانائی کیسے حاصل کرتے؟ سوال یہی اُٹھتا ہے کہ ایک آفاقی چیز کیسے بغیر کسی پلان اور کنٹرول کے ہر طرح کی زندگی کا لازم جزو بن سکتی ہے۔ دیکھیں جناب یہ تو سائنس کی ہی تحقیق ہے کہ نیند میں دماغی توانائی کا نظام طاقت حاصل کر کے بحال ہوتا ہے مگر نکتہ غور کرنے کا یہ ہے کہ نیند کے دوران توانائی کی بحالی کا عمل کسی پس پردہ نظم کو بھی تو ظاہر کرتا ہے! گویا جب انسان کا شعور معطّل ہوجاتا ہے اور انسان بظاہر نیم مردہ ہوجاتا ہے تو اس دوران بھی اندر کوئی نظام چل رہا ہوتا ہے۔ یہ چلنے والا سسٹم کس کے اشارے پر چل رہا ہوتا ہے؟ اس سسٹم کے کنٹرولنگ پیرامیٹرز کیا ہیں؟ کیا سائنسدان نیند کے دوران کسی پس پردہ سسٹم کو محض خودکار یا فطری چناؤ natural selection کا شاخسانہ کہہ کر جان چھڑا سکتے ہیں۔ نیچرل سلیکشن کا نظریہ وہ جادوئی چھڑی ہے جسے

سائنسدانوں نے ہر مصیبت کے وقت اپنے بچاؤ کے لیئے تخلیق کیا ہے یعنی فطرت خود ہی بہتر اور خوب تر زندگی کی تزئین کرتی رہتی ہے۔لیکن اگر انسان نیچرل سلیکشن کی جادوئی کرامت سے اپنے آپ کو حالات کے مطابق خود ہی ڈھالتا رہا ہے اور نیند بھی نیچرل سلیکشن کی کرامت ہے تو اگر ایسا ہے تو انسان نے نیند پر انحصار ہی کیوں کیا؟ ارتقاء کے سارے پراسس میں نیند کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی ؟ کیا واقعی ہم اب بھی اپنی حیات کی بقاء اور ارتقائی مرحلے خود تجویز کرتے ہیں؟

اگر نہیں تو پھر ماضی میں کیسے کر سکتے تھے؟

کیا آپ نے کبھی اپنے اندر کسی فطری چناؤ کو مچلتے محسوس کیا؟

حقیقت یہی ہے کہ جدید علوم یا سائنس اپنے ہی نظریئے یعنی ارتقاء میں نیند کا جواز نہیں دے پا رہی اس سے ثابت یہی ہوتا ہے کہ نیند ایک ذہین ارادتی تخلیق کے سوا اور کچھ نہیں۔گویا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کو حیات کی بقا survival اور اس کے ارتقائی پیرامیٹرز کے بارے میں ایک فیصلہ کرنا تھا کہ نینداس میں شامل ہو یا نہ ہو۔۔ تو وہ کون تھا یا کون ہو سکتا ہے؟

قرآن دن رات اور نیند کا حوالہ دے رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طرف انسان ہے تو دوسری طرف نظام شمسی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں میں ایک گہرا تعلّق بھی ہے جو کہ انسانی جسم میں موجود ایک حیاتی و کیمیائی یعنی بائیو کیمیکل گھڑی کی شکل میں موجود ہے۔سائنسدان اس کو سرَکیڈیَن کلاک circadian-clock یعنی شبانہ روز گھڑی کا نام دیتے ہیں۔ یہ جسمانی گھڑی بایو کیمیکل سرکٹ کے تیئں اندرونی حیاتی نظام کے پیرایوں کو باہر کے دن اور رات کے نظام اور ماحول کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنا ممکن بناتی ہے۔ circadian-rhythm یا روز و شب کی تال ہی ہمارے جسم کو سونے، جاگنے اور کھانے پینے کے اوقات بتاتی ہے۔یہ گھڑی بھی چوبیس گھنٹے کا دورانیہ رکھتی ہے یعنی ایک دن اور رات کے برابر۔اسی اندرونی نظام کے بموجب ہمارا سونا جاگنا عموماً باہر کے روشن و تاریک ماحول سے ہم آہنگ رہتا ہے۔اس کی عام مثال امریکہ سے آنے والے مسافر کے نیند کے اوقات کا ڈسٹرب ہونا بھی ہے جسے جیٹ لیگ jet-lag کہا جاتا ہے جسکا چند دن میں درست ہو جانا تو ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ مسلسل روشنی یا اندھیرا رکھ کر انسان کی جسمانی گھڑی کو آگے پیچھے کیا جا سکتا ہے۔کچھ جاندار رات کو جاگتے اور دن میں سوتے ہیں۔غور طلب یہی نکتہ ہے کہ نظام شمسی اور جانداروں کی اجسامی گھڑیوں کا تعلّق بغیر کسی پلاننگ کے کیسے

ہوسکتا ہے؟ یہاں پھر منکرین سے سوال کہ ہمارے جسم کی گھڑی کو کیسے معلوم ہوا کہ زمین چوبیس گھنٹے میں سورج کے گرد گھومتی ہے؟ یہ گھڑی جسم میں کیوں بنی؟

لیکن نیند کے اس معمّے کے اندر ایک اور معمّہ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے خواب؟

کیا سائنس بتا پائی کہ ارتقاء میں نینداور پھر اس کے اندر خواب کا کیا جواز ہے؟

جانور

قرآن: (سورة ۲۴، آیت ۴۵)

"اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے ہے، کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر اور جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

یہ تو جدید علوم کی ترقّی سے معلوم ہوا کہ ہر حیات کی ابتداء پانی میں ہوئی اس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل کی جانے والے اس بیان کی تصدیق سائنس سے ہوتی ہے کہ قرآنی بات کس قدر سچّی ہے۔ یہ ہے عظیم الشان خالق کی صنّاعی کہ پانی سے طرح طرح کے جانوروں کی تخلیق کی۔ ٹانگ کسی ذی حیات کو زمین میں حرکت کی چابی ہے جس سے جاندار اپنی غذا کی تلاش میں حرکت کرتا ہے۔ پھر کسی کی دو ٹانگیں ہیں تو کسی کی چار اور کسی کی ہیں ہی نہیں پھر بھی حرکت کی صلاحیت ہونا غیر معمولی مظاہر ہیں لیکن کم لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ تین ٹانگ کے جانور کیوں نہ ہوئے اور جو رینگتے ہیں انکی ٹانگیں کیوں نہیں نکلیں؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج سائنس انہی خطوط پر یعنی کائنات میں پہلے پانی اور پھر اس میں ہی زندگی تلاش کر رہی ہے، تو رہبر کون ہوا؟ ملاحظہ ہو۔

"ایک گائیڈ لائن کے طور پر ناسا NASA کائنات میں زندگی کی تلاش میں صرف پانی کا پیچھا کرتی ہے، کائنات میں پانی برف کی شکل میں تو موجود ہے یعنی ٹھوس صورت میں لیکن سیّال حالت میں نہیں، ٹھوس پانی زندگی کے مولیکیولر عمل میں سازگار نہیں۔ "Life's Matrix: A Biography of Water" کا مصنف فلپ بال لکھتا ہے کہ زندگی کے احیاء کے لیے جس طرح کے پیچیدہ کیمیائی عمل کی ضرورت ہوتی ہے اُسکے لیے پانی ایک لازمی عنصر ہے۔ سیّال پانی زندگی کا واحد آفاقی محلول ہے جسکی طرح کوئی اور نہیں جو زندگی کے کیمیائی عمل کی مدد کرے۔"

http://www.astrobio.net/interview/water-the-molecule-of-life/

۱۴۰۰ سال قبل ایسا آفاقی راز کون کہہ سکتا تھا، سوائے اُسکے کہ جو خود ہی خالق ہو! یہ ہے قرآن جو برتر علوم کی نوید دیتا ہے۔

پرندے

قرآن: (سورۃ ۶۷، آیت ۱۹)

" کیا وہ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے
اور سکیڑتے نہیں دیکھتے، رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں
جو تھامے ہوئے ہو، وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

اب یہ ایک اور سائنس کو لاجواب کر دینے والا سوال۔ پرندے آخر کیوں کر ظہور پذیر ہوئے؟ نظریہ ارتقاء میں آخر پرندوں کی شاخ کیونکر نکلی پھر وہی نکتہ کہ اگر ارتقائی عمل پزیری لاکھوں کروڑوں سال میں ہوئی تو ہر پرندے کے بیچ کے مدراج کہاں ہیں۔ مزید یہ کہ بہت سے حشرات الارض پروں کے ساتھ کیوں موجود ہیں جبکہ انکو معدوم ہو جانا تھا یعنی اگر پرندے لاکھوں سال قبل ایک اڑتا کیڑا تھے تو پرندہ بننے کے بعد پھر ہر طرح کے کیڑے کیوں موجود ہیں! قرآن میں انسان کو پرندوں کی اڑان کی طرف توجہ دلا کر ان کو اُکسایا بھی گیا ہے کہ کائنات کے راز معلوم کرنے ہیں تو ان پرندوں کی اڑان کو دیکھو اور معلوم کرو کہ یہ کیسے پر پھیلائے اڑتے ہیں۔ رحمٰن کے تھامنے سے مراد یہی ہے کہ خالق کے بنائے ہوئے طبعی قوانین کا کھوج لگاؤ اور انکو سمجھو تا کہ تم بھی ان کی طرح اڑو اور کائنات کے دور دراز گوشوں تک پہنچ سکو۔

رنگ

قرآن: (سورۃ ۳۵، آیت ۲۷۔۲۸)

" کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے
پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکالتے ہیں
جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔
اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس
سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔"

یہاں پر قرآن ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن انتہائی پیچیدہ مظہر Complex Phenomenon کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ ہم سب کی نظروں کے سامنے ہونے کے باوجود ہماری توجہ سے محروم رہتا ہے کیونکہ انسان بہت سی باتوں پر غور نہیں کرتا اور زندگی کا حصّہ اور معمول سمجھ کر قبول کر لیتا ہے انہیں میں ایک مظہر یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک رنگ رکھتی ہے۔ یہ رنگ دنیا کو خوبصورت

بناتے ہیں۔ پھول، پھل، درخت، مویشی، فصلیں، سبزیاں، پہاڑ، دریا، سمندر، انسان وغیرہ سب مختلف رنگ رکھتے ہیں۔ قرآن اس کا تذکرہ کر کے اس پر غور کی دعوت دیتا ہے۔ سائنسی تحقیق تو یہ ہے کہ ہر چیز اصلاً بے رنگ ہی ہے کیونکہ ایٹم سے بنی ہے جو بے رنگ ہے۔ پھر اشیاء رنگین کیوں نظر آتی ہیں؟ اب دوسری طرف دیکھیں تو روشنی بذاتِ خود ایک اور عجیب چیز ہے۔ یہ سات رنگوں کا مجموعہ ہے لیکن کرشمہ یہ ہے کہ وہ سات رنگوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود بے رنگ ہے اور نظر نہیں آتی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ شیشے کا ایک منشور prism لیکر اس پر روشنی ڈالیں تو یہ دوسری طرف سات رنگوں یا قوس و قزح کی شکل میں بکھر کر نکلتی ہے۔ اس کی یہ جبلّت یعنی رنگوں کا جدا ہو جانا حیران کن ہے لیکن اسی کی وجہ سے وہ جس چیز پر پڑتی ہے اُس کو کسی رنگ میں دِکھلاتی ہے۔ دنیا کی ہر شئے ان ہی سات رنگوں میں سے کچھ کے ملاپ سے اپنا رنگ بناتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر چیز میں اپنی ایٹمی ساخت کے حوالے سے ایسی خصوصیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ روشنی کے سات رنگ مختلف نسبتوں سے جذب کر کے باقی کو منعکس کرتی ہے اور وہ منعکس شدہ روشنی کی لہریں ایک خاص رنگ لیئے ہماری آنکھ کے نظام کے ذریعے دماغ تک جا کر اس چیز کا وہ رنگ دکھاتی ہیں۔ یہ کتنا زبردست نظام ہے جس کا تعلق محض روشنی اور کسی شئے کی مخصوص صلاحیت سے ہے۔ روشنی کے اسپکٹرم اور انسانی آنکھ میں موجود روشنی کے ریسپٹر receptor کے درمیان ملاپ کا نتیجے میں کوئی رنگ بنتا ہے یعنی رنگوں کی کیٹگری کا تعلق روشنی کے مآخز اور کسی چیز کے طبعئی خواص سے ہوتا ہے جو کہ روشنی کے جذب کرنے اور انعکاس کرنے سے تعلّق رکھتا ہے۔ گویا رنگ بصر کی ایک صلاحیت ہے جو کہ سرخ، نیلا، پیلا، سبز اور دوسرے رنگوں کے حوالے سے انسان میں ہے۔ گلاب ہمیں سرخ اس لیے نظر آتا ہے کہ وہ باقی تمام رنگ جذب کر کے صرف سرخ کو لوٹاتا ہے۔ اب یہاں پر منکرینِ خدا اور مادہ پرستوں سے استفسار ہے کہ:

۱۔ ایٹموں کے کسی جتّھے کو روشنی کے مخصوص رنگ جذب کرنا اور لوٹانا کون سکھاتا ہے۔

۲۔ اور وہ کیا ہے جس کی وجہ سے ایٹم کا کوئی مجموعہ اپنے لیے کوئی رنگ پسند کرتا ہے۔

۳۔ رنگ کی خصوصیت آفاقی کیوں ہے، کیوں ہر انسان سرخ کو سرخ دیکھتا ہے؟

۴۔ انسان کے اندر کے بصری نظام اور بیرونی نظام میں یہ آفاقی رابطہ اتنا منظّم کیسے؟

دنیا کا رنگین ہونا سپر سائنس کا ایک اچھوتا مظہر ہے جو نہایت پیچیدہ تو ہے مگر انسانی تجسّس اس

پیچیدگی کا کھوج لگاتا ہے اور اس طرح اسکی علمی وضاحت ہوتی ہے جسے انسان فخر سے سائنس کہتا ہے۔

خزانے

قرآن: (سورۃ ۱۵، آیت ۲۱)

" کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں جس چیز کو بھی
ہم نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔"

قرآن انسان کو خالق کی عظمت اور اس کی عظیم الشّان قوّت کا مشاہدہ کرنے کی دعوت اس طرح دیتا ہے کہ دیکھو انسان کی ابتداء ایک جوڑے سے ہوئی جو بڑھتے بڑھتے کھربوں تک جا پہنچا ہے لیکن پھر بھی انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات قدرتی نظام کے تحت پوری ہو رہی ہیں نہ آکسیجن کی کمی نہ پانی کی نہ غذا کی۔ گویا ایک عظیم الشّان غیر مرئی نظام جاری و ساری ہے جو انسان کی ہر دور کی ضروریات کو ایک معیّن مقدار سے پورا کرتا رہتا ہے۔

قلم

قرآن: (سورۃ ۶۸، آیت ۱)

"قسم ہے قلم کی اور انکے لکھنے کی"

قرآن: (سورۃ ۹۶، آیات ۴۔۵)

"جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔
انسان کو وہ علم دیا جیسے وہ نہ جانتا تھا"۔

انسانی ترقّی کا دارو مدار معلومات اور علوم کی منتقلی پر ہے جتنی ہم کوشش کرتے ہیں اتنی ہی زیادہ معلومات کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ علوم کو محفوظ کرنا قلم ہی سے ممکن ہے قلم وہ اہم چیز ہے جس کی وجہ سے علوم ایک نسل سے دوسری نسلوں میں منتقل ہوتے آرہے ہیں۔ گویا قلم ایک ایسا ذریعہ ہے جو کہ خالق کی طرف سے انسانوں کو تحفہ ہی ہے جو علوم کو محفوظ کرنے اور آگے بھیجنے میں استعمال ہوتا ہے۔ خالق جب کسی چیز کا قسمیہ تذکرہ کرتا ہے تو وہ چیز بذاتِ خود انسانوں کے لیے عطیہ ہی ہوتی ہے۔

لامحدود علوم

قرآن: (سورۃ ۱۸، آیت ۱۰۹)

" کہہ کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے گا
مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی اور لے آئیں تو بھی۔"

قرآن: (سورۃ ۳۱، آیت ۲۷)

"زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر جیسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہونگی۔"

قرآن ہم کو قرب و جوار میں اور پوری کائنات میں پھیلے عظیم الشان علوم کے انبار کا حوالہ دے کر کہتا ہے کہ یہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے خواہ سات سمندر روشنائی بن جائیں اور تمام درخت قلم! یہ انسان کی سوچ کے حوالے سے دی گئی عظیم الشان مثال ہے۔ اگر قرآن کسی انسان کی تصنیف ہوتا تو علوم کی مذکورہ لامحدود وسعت کا دعویٰ وہ انسان نہیں کرتا کیونکہ یہ مثال بڑی عظیم ہے اور یہ خالقِ علوم ہی ہے جو ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کائنات کے علوم بے پایاں ہیں اور ان کو رب کی باتیں یعنی تخلیق اور خلق کے علوم کہا گیا ہے۔ ہم کسی بھی علم کا کوئی بھی گوشہ لیں یا ہونیوالی ریسرچ کے زاویوں کی گہرائی کا طائرانہ جائزہ لیں تو ظاہر ہوگا کہ علم کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہر شعبہ میں علوم کی خیرہ کُن ضوفشانیاں ہیں کہ جتنی زیادہ ریسرچ ہوتی ہے اتنی ہی نئی معلومات سامنے آتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو اور زیادہ پیچیدہ مظہر Phenomenon سامنے آتا ہے۔ نئی دریافتوں کا تعلق انسانی کاوشوں سے ہے، انسان کائنات کی بلندیوں میں چلا جائے یا سمندر کی گہرائیوں میں اسے ہر جگہ معلومات کا دفینہ نظر آئے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکا کہ انسان یہ کہے کہ اب ہماری کاوشوں کی ضرورت نہیں کیونکہ سارے علوم حاصل ہو گئے۔ مختصراً، انسان جتنا علم حاصل کرتا ہے اتنا ہی احساس ہوتا ہے کہ انسان اب بھی کس قدر کم علم ہے۔

کوشش اور نتائج

قرآن: (سورۃ ۵۳، آیت ۳۹۔۴۲)

"اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی اور اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔"

کائنات میں انسانی ترقّی کے لیے قرآن کا معیار ہے، کام! خواہ آسائشات کا حصول ہو یا ترقّی واقتدار کا، جتنی کوشش انسان کرے گا اس کا ویسا ہی نتیجہ حاصل کرے گا۔ گویا یہ انسانی ترقّی کا بنیادی جزو ہے۔ لیکن انسان کو تسلّی اور تنبیہہ بھی کی جا رہی ہے کہ ہر عمل کی جزا لازماً ملنی ہے۔ قیامت میں ہر شخص کے اعمال کی جانچ ہوگی اور جن کو ان کے عمل کا پورا فائدہ دنیا میں حاصل نہ ہوا ان کو قیامت میں اس کا صلہ عطا کیا جائے گا۔ اور یہ کہ انسان نے ضروریاتِ زندگی کے حصول

میں خالق کے نمائندے کے بتائے ہوئے جائز طریقوں کی کتنی پاسداری کی اسی پر سزا اور جزا کا انحصار ہوگا۔

انتقالِ علم

قرآن: (سورۃ ۹۶،آیات ۴۔۵)
"جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔
انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہیں تھا۔"

انسان بنیادی طور پر لاعلم ہی ہے۔ نئے علوم کا ظہور خالق کی مدد کا مرہونِ منت ہے۔ ریسرچ اور مسلسل غور سے پوشیدہ علوم کی گرہیں کھلنا تفکّر کا یک طرفہ کمال نہیں بلکہ مخصوص مواقع پر اللہ کی مدد ہیں۔ یعنی جیسے ایک آٹومیٹک کھلونا گاڑی کا رخ ہم ہلکے سے اشارے سے بدل دیتے ہیں۔ اسکی مثال ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے بائینری نمبر (Bianary Numbers 1,0)، اور کرنٹ کی مثبت اور منفی لہروں کی دریافت جو انسان کو کمپیوٹر تک لے گئیں، گویا اللہ تعالیٰ انسان کے لیے معلومات کی صرف کوئی بند کھڑکی کھول دیتا ہے جس کے اندر داخل ہوکر انسان معلومات کی ایک کائنات میں پہنچ جاتا ہے۔ ہمیں پتہ نہیں کہ انسان کو حیرت زدہ کرنے والے کتنے علوم ابھی پوشیدہ ہیں۔ کائنات میں پھیلے ہوئے علوم اتنے عمیق ہیں کہ انسان ان سب کو یکدم نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا قلم کے ذریعے انسان اپنی کاوشوں کو محفوظ کرتا رہا ہے اس طرح ایک دور کے علوم رفتہ رفتہ اگلی نسلوں تک منتقل ہوتے آرہے ہیں۔

نگرانی

قرآن: (سورۃ ۸۲،آیات ۹۔۱۲)
"ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جزا اور سزا کو جھٹلاتے ہو، حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں۔
ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔"
قرآن: (سورۃ 50،آیات ۱۷۔۱۸)
"دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔
کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے
کے لیے حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔"

یہاں پر قرآن ایک نہایت مضبوط نظام کا حوالہ دیتا ہے جو انسان کی نگرانی پر معمور ہے یہ نظام نظر تو نہیں آتا لیکن منطقی طور پر جزا و سزا کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ انسان نے

خلاء میں جاسوسی سیارے چھوڑے ہوئے ہیں جو ہر لحظہ فلم بناتے رہتے ہین جس کی ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی، اطراف میں ایسے غیر مرئی سینسر موجود ہوتے ہیں جو انسان کی گفتگو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ایسے سسٹم بنانے کے باوجود انسان خالق کی زبردست عظیم تر سائنس کی کرشمہ سازیاں سمجھنے سے قاصر ہے۔لیکن یہ بات انسان کو یاد رکھنے کی ہے کہ قیامت کے روز انسان ان اعمال کی نفی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔ ہر لمحے کی ویڈیو سامنے ہوگی۔اپنی بے پناہ ترقی کے باوجود سائنس اس عظیم اور پیچیدہ نظام کی گرد کو بھی نہیں پا سکی۔یہ میٹافزکس کا راز ہے!

یاددہانی

قرآن:(سورۃ ۸۲،آیات ٦_۸)

"اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا

جس نے تجھے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھیک بنایا، پھر تجھے متناسب بنایا اور

جس صوت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔"

انسان کی توجہ اس کے متناسب، مکمل اور خوبصورت سراپے کی طرف دلائی گئی ہے کہ انسان غور کیوں نہیں کرتا کہ کیسی نفاست خوبصورتی اور مناسبت سے اس کی تخلیق ہوئی اور اس کے اعضاء کس طرح ایک دوسرے سے منسلک ہوکر کام کرتے ہیں۔بڑے پیچیدہ خودکار نظام جسم کے اندر بے آواز چل رہے ہوتے ہیں۔ اسکی ٹانگیں جو اسکو زمین پر لیکر چلتی ہیں اور ہاتھ کہ خوبصورت انگلیوں سے مزیّن کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز تھام لیتا ہے! آنکھیں جو نظارہ کراتی ہیں اور ہونٹ وغیرہ۔ تو بھلا اپنے خالق کی طرف انسان کیوں نہیں متوجہ ہوتا۔اگر وہ چاہتا تو انسان کو بدصورت ہی بنادیتا یا اس کا شعور ہی ایسا بناتا کہ وہ اپنے آپ کو بدصورت دیکھتا۔خالق نے نہ صرف حسن تخلیق کیا بلکہ حسن کا شعور بھی تخلیق کیا۔یہاں پر عقل سے ماوراء خالق کی سائنس کی عظمت کا احساس دلایا گیا ہے! کیا انسان سوچے گا؟ اب قرآن میں درج تناسب کے حوالے سے ایک اور پہلو بھی دیکھیں کہ تحقیقات سے یہ عیاں ہوا کہ انسان کے اعضاء کی ساخت میں ایک تناسب ہے جسے خوبصورتی کا تناسب golden ratio کہا جاتا ہے،اسے فائی یا فی phi کہا جاتا ہے اور یہ 1:1.618 ہے۔ جدید ریسرچ بتاتی ہے کہ انسان کے اعضاء اور چہرے کی ساخت میں یہی تناسب موجود ہے۔کیا ارتقاء میں نیچرل سلیکشن حساب داں بھی ہے؟

تفصیل کے لیئے ملاحظہ کر سکتے ہیں یہ لنک:

https://www.phimatrix.com/face-beauty-golden-ratio/
https://www.youtube.com/watch?v=Wy6cqVUloJQ

انسان کا خسارہ

قرآن: (سورۃ ۱۰۳، آیات ۱-۳)
"زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے
سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک اعمال کرتے رہے اور
ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

زمانے یعنی وقت کی ایک بڑی قسم کے ساتھ قرآن بہت صاف لفظوں میں حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان نقصان سے اسی صورت میں بچ سکتا ہے جب کہ وہ خالق کو مانے، اچھے اعمال کرے اور ایک دوسرے کو بھی خالق کی یاد دلائے اور ناموافق حالات کا صبر سے مقابلہ کرے کیونکہ ہر چیز کا اجر آگے موجود ہے۔

تنبیہ

قرآن: (سورۃ ۷۷، آیات ۱۵)
"تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی"

قرآن: (سورۃ ۷۸، آیات ۴۰)
جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے
آگے بھیجا ہے، اور کافر پکار اُٹھے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا۔

قرآن: (سورۃ ۸۸، آیات ۲۵-۲۶)
"ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہے اور پھر ان کا
حساب لینا ہمارے ذمّے ہے۔"

یہ حاکمانہ انداز خالق کی لامحدود قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ انسان اپنی موت کے آگے بے بس ہے اور خالق کا زبردست نظامِ نگرانی جو ہر لمحے کی روداد قلمبند اور فلم بند کر رہا ہے وہ انسان کو آخر لاچار بنا دے گا۔ اسی لئے خالق کی طرف سے ایک شانِ بے نیازی کا مظاہرہ ہے کہ انسان اگر نہیں مانتا تو نہ مانے آخر کو اس کو جواب دینا ہی ہے اور خالق کے آگے حاضر ہونا ہے۔ یہ ایک وارننگ ہے، ایک بے نیاز اور قوّت والی ہستی کی طرف سے۔

انسان سے قربت

قرآن: (سورۃ ۵۰، آیت ۱۶)

"ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم اس کے دل میں ابھرنے والے
وسوسوں تک کو جانتے ہیں، ہم رگِ جاں سے زیادہ قریب ہیں۔"

قرآن: (سورۃ ۶۷، آیات ۱۳۔۱۴)

" وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے۔
بھلا وہ ہی نہ جانے جس نے پیدا کیا؟"

قرآن کا تمام انسانوں کے لیے یہ پیغام ہے کہ وہ شفیق ہستی جس کی رحمت بے پایاں ہے۔ اپنے بندوں سے اور تمام مخلوق سے لاتعلّق نہیں ہے بلکہ اس کا اپنی ہر انسان سے ایسا قریبی تعلّق ہے کہ اسے انسان کے دل کے اندر اُبھرنے والے وسوسوں تک کا علم ہے۔ پھر خالق کا فرمان ہے کہ ہم ہر بشر کی رگ جان سے زیادہ قریب ہیں۔ یہاں قرآن نے اچھوتا انکشاف کیا کہ قلب میں خیال اُٹھتے ہیں۔ بھلا دل کیسے سوچتا ہے! آیئے جدید سائنس کی ایک تحقیق پر نظر ڈالتے ہیں۔

http://appliedconsciousnessintl.com/thinking-from-the-heart-heart-brain-science

"نیوروکارڈیالوجی کی نئی فیلڈ میں حالیہ تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دل ایک حواسی آلہ اور معلومات کی چھان بین کرنے والا ایک مرکز ہے۔ اس کے اندر اچھا خاصا پیچیدہ اعصابی نظام موجود ہے جو اسکو دماغی دل Heart Brain بناتا ہے۔ اسکے اندر ایسے سرکٹ موجود ہیں جس سے یہ آزادی سے سیکھنے، جانچنے اور فیصلہ کرنے کا عمل بغیر دماغ کی مدد کے کرتا ہے۔ سب کی حیرانی کے لیئے، کہ یہ دریافت کامیاب تجربات سے ظاہر کرتی ہے کہ دل کے اندر موجود انتہائی منظم خودکار اعصابی نظام دوہرے یعنی قلیل اور طویل رابطے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

عام طور پر سب ہی جذبات کو قلب سے موسوم کرتے ہیں جس کا اظہار ہماری روزمرّہ کی گفتگو میں بھی ہوتا ہے لیکن سائنس نے اسکو مسترد کیا اور تمام خیالات و جذبات کا منبع دماغ ہی کو قرار دیا۔ قرآن دماغ کے بجائے دل میں آنے والے وسوسوں کا تذکرہ کرتا ہے یعنی قرآن قلب کو ایک آزاد اور مرکزی فیصلہ کرنے والا کہتا ہے جو موجودہ تحقیق سے ثابت بھی ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ ارتقائی نظریئے میں قلب اور دماغ دونوں میں کیونکر اعصابی نظام پیدا ہوئے؟ اس کی ضرورت کس کو اور کیوں محسوس ہوئی؟ اور قلب کے نیورون الگ تشخص لیئے کیوں ہوتے ہیں؟ دماغ اور دل کے اندر ایک طرح کی ہم آہنگی ہوتی ہے جو خودکار نہیں ہوسکتی بلکہ ایک ذہین تخلیق ہی ہوسکتی ہے۔

تفکّر کی دعوت

قرآن: (سورۃ ۳۰، آیت ۸)

" کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور وفکر نہیں کیا۔ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے برحق اور ایک مقررّہ مدّت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

قرآن: (سورۃ ۱۲، آیت ۱۰۵)

"زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں دیتے۔"

قرآن: (سورۃ ۴۷، آیت ۲۴)

" کیا یہ لوگ تدبّر نہیں کرتے قرآن میں، یا لگ گئے ہیں انکے دلوں پہ قفل"

قرآن دینِ فطرت کا نمائندہ ہے اور انسان کے ہر سوال کا جواب رکھتا ہے۔ اسی لئے انسان کو کائنات میں غور کی دعوت دیتا ہے یعنی ریسرچ کرو اور دیکھو کہ کیسے کیسے علوم کے خزانے خالق نے کائنات کے گوشے گوشے میں چھپائے ہیں۔ قرآن کی دعوتِ فکر اس بات کی غمّاز ہے کہ خالق انسان کو منطقی اور عقلی بنیادوں پر ایمان کی طرف بلاتا ہے۔ یہاں کوئی اندھا یقین نہیں ہے بلکہ علم پر مبنی اور عقلی طور پر مضبوط دلائل سے لیس ایمان ویقین ہے۔ غیب پر ایمان صرف بغیر دلیل کے ہی نہیں بلکہ علوم کی گواہی سے بھی ہے کیونکہ انسان کی فطرت ہی خالق نے ایسی بنائی ہے کہ وہ عقل کی کسوٹی پر معاملات کو پرکھتا ہے۔ قرآن کی بار بار تفکّر کی دعوت دراصل اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جدید دور کا انسان بالآخر حاصل کردہ جدید علوم کی ناقابلِ تردید گواہیوں سے ہی کائنات کے خالق کو تسلیم کرے گا۔ سائنس خواہ کتنی ہی دریافتیں کرتی چلی جائے علوم کی وسعت اور گہرائی ایک وقت پر سائنس کو عقلی بنیادوں پر خدا کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیگی اس کے پاس اللہ کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں بچے گا۔ کیونکہ کائنات کی خودکار یا اچانک Spontaneous تخلیق کے حوالے سے اس کے طبعئی دلائل بہت کمزور ہیں۔

موجودہ دور کی زبردست ترقّی اور پیچیدہ تر علوم کی دریافتیں ایک لامحدود خالق کی نشانیاں ہی تو ہیں لیکن انسان اس طرف سے غافل ہے۔ قلوب پہ تالے سے یہ مراد ہوسکتی ہے کہ مادّہ پرست اپنی کج فہمی یا علم کے تکبّر کی وجہ سے غیب پر ایمان نہیں لاتا اور بند گلی میں قید رہتا ہے۔ بے تعصب تدبّر کا اطلاق اور علوم کا مسلسل حصول ہی قلب کے بند تالوں کو کھولتا ہے۔ یہاں بھی قرآن قلب کو دماغ پر غالب بتاتا ہے! قلب کی ماہیت ہی دماغی خیالات کی رو اور بہاؤ متعیّن کرتی ہے۔

دنیا کا مسخّر نظام

قرآن: (سورۃ ۳۱، آیت ۲۰)

" کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں
تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں؟
اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں
بغیر اسکے انکے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب"۔

قرآن: (سورۃ ۴۵، آیات ۱۳۔۱۴)

"ہم نے تمہارے لیئے جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے مُسخر کر دیا ہے۔
بیشک اس میں غور کرنے والوں کے لیئے نشانیاں ہیں"

یہ ہے وہ طرزِ تخاطب جو ایک مہربان حکمران کا ہوتا ہے جو سخی ہوتا ہے اور بے حساب عطا کرتا ہے۔ اتنی عظیم کائنات انسان کے حوالے کر دی کہ ہر چیز تمہارے لیئے ہے۔ اس کائنات میں علوم کے خزانے دفن ہیں اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق ہے ہی نہیں جو کائنات میں موجود ہر چیز پر غلبہ حاصل کر رہی ہے۔ اگر یہ کائنات بغیر آرڈر یا نظم کے ہوتی تو انسان کی مخالف زندگی بھی موجود ہوتی۔ جدید سائنسی دریافتیں اسی آیت کی تعبیر ہیں۔ یہ آیت یہ پیش گوئی کر رہی ہے کہ انسان ہر علم کی تہہ تک پہنچ کر رہے گا کیونکہ ہر چیز یعنی طبعی اور غیر طبعی مسخر ہونی ہے اور یہی غور و فکر کی قرآنی دعوت انسان کو خالق کا ادراک دیگی۔ قرآن انسانوں کی توجہ مبذول کراتا ہے کہ دیکھو آسمان اور زمین میں موجود تمام نظام انسانوں کی مدد کے لیئے کام کر رہے ہیں انسان کے اطراف کام کرتے ہوئے بے شمار نظام حیات و عناصر اس عظیم الشان قوت والے خالق کے کنٹرول کا اظہار ہیں جیسا کہ زندگی کے لئے ضروری آکسیجن کا چکّر، کاربن کا چکّر، پانی کا نظام، پھل، سبزی و مویشی پھر دن اور رات اور موسم وغیرہ سب ہی کچھ انسان کی خدمت میں لگے ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے جسم کے اندر بے شمار نظام کارفرما ہیں جن میں سے کچھ پر اسکا مُطلق کنٹرول نہیں ہے اور کچھ اس کی نیم دسترس میں ہیں جیسے نظام تنفّس وغیرہ۔ نظامِ دوران خون اور حرکتِ قلب انسان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اگر صرف پرندے ہی انسان کے دشمن ہو جائیں اور اسپر ہر طرف سے ہر وقت حملہ آور ہوتے رہیں تو کیا انسان چین سے رہ سکے گا؟ اسی طرح جانور اور حشرات الارض انسان سے لاتعلق رہتے ہیں۔ پھل اور سبزیاں زہریلے اور کڑوے نہیں ہوتے وغیرہ وغیرہ۔ گویا تمام نظام

ایک مربوط سلسلے اور کمانڈ کا حصہ ہیں۔تو پھر خدا کے بارے میں کیا شک رہتا ہے کہ انسان اسے قبول نہیں کرتا۔ جوں جوں انسان غور کرتا ہے اسے اپنی بے ثباتی کا اتنا ہی پتہ چلتا ہے۔قرآن انسان کو حقیقت سے آگاہی عطا کرتا ہے کہ اسکے اطراف پھیلی نہ ختم ہونے والی نعمتیں اور ضروریاتِ زندگی اگر اسکو مسلسل ملتی ہیں تو یہ انسان کا کمال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک منظّم سپلائی ہے جس پہ انسان کا زور نہیں۔مگر اس پر غور کم ہی لوگ کرتے ہیں اور اللہ کے انکار پہ کمر بستہ رہتے ہیں۔دوسری طرف خدا کے منکرین کائنات میں انسان کی عظمت کے قائل نہیں بلکہ جدید سائنس دان تو اس بات کے قائل ہو رہے ہیں کہ انسان سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور مخلوق کائنات میں ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی بغیر ثبوت کی قیاس آرائی ہی ہے۔لنک یہ ہے۔

https://www.theguardian.com/science/2010/apr/30/stephen-hawking-right-aliens

ہمہ جہت تخلیق

قرآن:(سورۃ ۱۶،آیت ۸)

"اس نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کیئے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور
وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔وہ اور بھی بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے
جن کا تمہیں علم نہیں۔"

قرآن:(سورۃ ۳۶ ،آیات ۷۹۔۸۰)

"وہ ہر طرح کی تخلیق جانتا ہے۔وہی ہے جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے
درخت سے آگ پیدا کی۔تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو۔"

یہ آیات خدا کی لامحدود خلاّقی کا اظہار ہیں۔ہم اپنے اطراف ہی ہزاروں لاکھوں طرح کی تخلیق کا مظاہرہ دیکھتے ہیں جیسا کہ لاکھوں حشرات الارض اور ہزار ہا سمندری مخلوق، طرح طرح کے جانور اور پرندے۔پھر تخلیق کی جہتیں ایسی کہ کہیں انڈے سے بچے نکلتے ہیں تو کہیں کسی اور طرح سے پیدائش ہوتی ہے۔کوئی پرندہ انڈے دیتا ہے تو کوئی بچے! کہیں کوئی رینگنے والا انڈے دیتا ہے تو اُڑنے اور چلنے والا بچے! پھلوں کی ساخت، سبزیوں کی ساخت اور ان کی نسل بڑھنے کے انتظامات کہ ہر چیز میں اس کا بیج ہے۔غرض اس عظیم الشان کائنات کے ہر پہلو میں کوئی نہ کوئی نئی اور مختلف طرز کی تخلیق نظر آتی ہے۔سبز درخت سے آگ حاصل ہونا بھی اچھوتی تخلیق ہے۔ کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی معلوم تخلیق مثلاً کوارک Quark پارٹیکل وغیرہ سے لے کر انسان

اور کہکشاؤں تک حیرت زدہ کرنے والے حرکت پذیر اور ساکت عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔
جو نکتہ سمجھنے کا ہے وہ یہ کہ ہمارے اطراف موجود تخلیقات کیونکہ ہمارے دائرۂ شعور میں آجاتی ہیں لہٰذا وہ ہمارے لیئے ایک عام سی چیز بن جاتی ہیں اگر وہ ہمارے شعور میں نہیں آتیں تو وہ شاید تصور میں بھی نہ آتیں۔ اسکو اسطرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر ہر جاندار صرف بچّہ ہی جن رہا ہوتا تو انسان کبھی بھی انڈے سے پیدائش کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا! اگر پھول نہیں ہوتے تو ہم اس طرح کی خوبصورتی کا ادراک نہ کرسکتے۔ اگر مویشی اور کوئی جانور ہی نہیں ہوتے تو کیا انسان اُس طرز کی زندگی جان سکتا؟ ایسی بے شمار تخلیقات کو انسان عام واقعات کی طرح قبول کرتا ہے لیکن حقیقتاً یہ اللہ کی بے شمار جہت والی خلاّقی کا مظہر ہیں۔ گویا جو عدم سے ظاہر کردیا گیا وہی دائرہ شعور میں مقیّد ہوا اور وہی انسان کے لیئے وجود بنا! غور کرنے والوں کے لیئے اشارہ ہے کہ کون جانے زندگی، شعور اور احساسات کی اور کتنی پنہاں جہتیں dimensions ہمارے شعور سے پرے بھی موجود ہوں! اس دور کے مخاطب انسان کو ٹرانسپورٹ کے اور ذرائع کا علم نہیں تھا لیکن اس ضمن میں قرآن بتاتا ہے کہ اور بھی تخلیقات اللہ کرتا ہے جس کا انہیں علم نہیں اور تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ اللہ کی عطا عقل سے انسان نے نئے تیز رفتار متبادل تلاش اور تخلیق کیئے۔

رات، دن اور چاند

قرآن: (سورۃ ۱۰ آیت ۵)

"وہی ہے جس نے سُورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کردیں تاکہ تم اُس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو اللہ نے یہ سب کچھ با مقصد ہی بنایا ہے وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"

قرآن: (سورۃ ۱۷، آیت ۱۲)

"دیکھو ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا۔ اور دن کی نشانی کو روشن کردیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرسکو اور ماہ وسال کا حساب معلوم کرسکو۔ اس طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ مُمیّز کر کے رکھا ہے۔"

دن، رات اور چاند کی منزلیں دراصل اللہ کی عظیم ترین اور عام فہم نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں صاف کہا گیا ہے کہ علم رکھنے والوں کے لیئے اس میں رب کا حوالہ ہے۔ قرآن کا یہ اشارہ بہت

زبردست ہے کیونکہ انسانی زندگی کی ہر کاوش اور منصوبہ بندی "وقت کے بہاؤ" کی مرہونِ منّت ہے جو کہ انسانی پہنچ سے باہر ہے۔ ہر انسان کی روزمرّہ زندگی اس ہر لحظہ بدلتے ہوئے وقت ہی سے منسلک ہے۔ کیا ہمارے پاس اس پر غور کا وقت ہے؟ کیا جدید سائنس کل کو آنے سے روک سکتی ہے؟ کیا کوئی نظامِ شمسی کا دورانیہ روک سکتا ہے؟

چاند کی منزلیں: قرآن میں چاند کی منزلوں پر غور کی دعوت واقعیٔ بہت فکر انگیز ہے کیونکہ جب قرآن اترا تو اس وقت انسانی علوم چاند کی اپنے محور پر گردش سے نابلد تھے۔ قرآن میں انسانوں کی توجہ چاند کی منزلوں کی طرف مبذول کرائی جا رہی ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ چاند کی اپنے محور پر بھی گردش ہے لیکن اس میں ایک انتہائی منفرد پہلو یہ ہے کہ چاند کی زمین کے گرد گردش اور اپنے محور پر گردش بالکل یکساں وقت میں مکمل ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک حیرتناک منظر بنتا ہے کہ چاند کا ایک ہی حصّہ زمین کے سامنے رہتا ہے۔ چاند اپنے مدار پر ایک مکمّل چکر ستائیس اعشاریہ تین 27.3 دن میں پورا کرتا ہے جیسا کہ زمین سے مشاہدہ ہوتا ہے جسے سائڈریل sidreal مہینہ کہتے ہیں۔ چاند، زمین کی سورج کے گرد گردش کی وجہ سے، اُنتیس اعشاریہ پانچ 29.5 دن میں خلاء میں سورج کے حوالے سے اپنے مقام پہ واپس پہنچتا ہے۔ چاند اپنے محور پر گردش معمولی فرق کے ساتھ ستائیس اعشاریہ تین 27.3 دن میں مکمّل کرتا ہے جو کہ زمین کے گرد مداری گردش کے بالکل مساوی ہوتی ہے۔ یہ اتفاق نہیں ہے بلکہ زمین اور چاند کے درمیان مدّ وجزر کا ایک قفل ہے اس قفل کی وجہ سے چاند کی محوری اور مداری گردشی برابر رہتی ہے جسکی وجہ سے لازمی طور پہ چاند کا ایک ہی چہرہ ہمیشہ زمین کی طرف رہتا ہے۔ اس معمولی فرق کی وجہ سے چاند کا ۵۵ فیصد حصّہ زمین کے سامنے رہتا ہے۔ مدّ وجزر کا یہ قفل ایک باریک بیں نظام ہے جس میں اس کی ابتداء سے اب تک کوئی فرق نہیں پڑا۔ ان دو مختلف طرح کی گردش یعنی محوری اور مداری کے یکساں وقت کے لئے دونوں اجرامِ فلکی کا وزن اور کششِ ثقل کی درست ترین پیمائشی قوّت کے ساتھ علم کی اعلیٰ ترین گرفت کی ضرورت ہے کیونکہ یہاں پر کائنات کی عام گردشوں سے جُدا نظام کارفرما ہے! سوال یہ ہے کہ کیا کوئی خلائی گردشی نظام اپنے آپ انجینئرنگ کا منفرد اور انوکھا نظام بھی بنا سکتا ہے؟ اتنی عظیم کمیّت والے اجسام کی گردش پر قفل کیا خودکار فطری تماشا ہی ہے یا کچھ اور؟ سائنسدان اسے فطرت کی کارگزاری ہی کہیں گے جبکہ سینکڑوں سال قبل اس طرف متوجّہ کر کے

قرآن ثابت کرتا ہے کہ قرآن خالق کائنات کا خطاب ہے اور یہ نظم خالق کی تخلیق ہے۔

موت

قرآن: (سورۃ ۵۶، آیات ۸۳-۸۵)

"جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔ اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے خیال میں سچّے ہو تو اس وقت اس کی نکلتی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟"

منکرینِ خالق کے لیئے قرآن کا ایک چیلنج ہے کہ اگر انسان کسی کا محکوم نہیں بلکہ خود مختار ہے تو جب انسان مرنے لگتا ہے اور اس کی جان ختم ہونے کو ہوتی ہے تو اس وقت تم اس جاتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں کر لیتے! سائنس کے پاس اس چیلنج کا کیا جواب ہے؟ ہر طرح کی میڈیکل ترقّی کے باوجود دنیا میں ہر پانچ سیکنڈ میں نو افراد انتقال کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا انسان محض ایک محکوم مخلوق ہے اور حاکمِ مُطلق کی منشا کے آگے کسی برتر سائنس کی گرفت میں موت کے آگے بے بس۔ پھر مزید ایک ایسی بات کا بھی تذکرہ ہے جس کا تجربہ صرف مرنے والے کو ہی ہوتا ہے وہ یہ کہ مرنے والا خود خالق کی غیر مرئی دنیا کا مشاہدہ کر لیتا ہے لیکن اس کے پاس نہ کسی کو بتانے کا وقت ہوتا ہے اور نہ دکھانے کا کیونکہ اُسکی زندگی اور اُسکی ایمان لانے کی مہلت ختم ہو چکی ہوتی ہے اس کیفیّت کا کوئی سائنسداں کسی بھی جدید سائنسی آلہ سے اندازہ نہیں لگا پایا۔ یہاں پر یہ حقیقت بتا دی گئی ہے کہ انسانی زندگی کو ہر حال میں ختم ہونا ہے اسی لیئے موت کتابِ زندگی کا آخری صفحہ ہے جسے بند ہونے سے کوئی علم نہیں روک پا رہا۔ یہ اللہ کے بے مثال اور لا محدود اختیار کا اظہار ہے۔

انسانی اقرار

قرآن: (سورۃ ۴۱، آیت ۵۳)

"عنقریب ہم اِن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے اندر بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔"

قرآن کی یہ پیش گوئی ہے کہ کائنات اور انسان کے اندر موجود نشانیاں ایسی وضاحت سے سامنے

آئیں گی کہ منکرین بھی قائل ہو جائیں گے۔ یہ تو سب کے سامنے ہے کہ انسانی ترقی جدید علوم کی مرہونِ منت ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں بے پناہ ترقی ہو رہی ہے۔ اور نئی نئی معلومات سامنے آ رہی ہیں اور یہ بات زیادہ دور نظر نہیں آتی جب سائنس غیر مرئی اور مابعد الطبعیاتی دنیا سے کوئی ایسا طبعی رابطہ ڈھونڈ لے گی کہ اس کے پاس قرآن کی تصدیق کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ مستقبل میں قرآن کی یہ پیش گوئی حقیقت کا روپ دھارتی نظر آ رہی ہے کیونکہ سائنس اپنے بے شمار مخصوص Confusions کے ساتھ بہر حال آگے بڑھ رہی ہے اور حقیقت کی کھوج میں لگی ہوئی ہے۔

وقتِ بے کراں

قرآن: (سورۃ ۲۲، آیت ۴۷)

"تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہے۔"

قرآن: (سورۃ ۹۸، آیت ۸)

"ان کی جزا اُن کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنّتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی
وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔
یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔"

یہاں پر قرآن ایک غیر مانوس ماحول یا مظہر Phenomenon کا تذکرہ کرتا ہے جو کہ فی الحال انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ یعنی ہمیشہ ہمیشہ، دائمی قیام یا ایک مسلسل حال کی کیا جہت ہوگی؟ سائنس خود اس کی قائل ہے کہ خلا میں مختلف قسم کے "وقت" ہو سکتے ہیں۔ کیا سائنس بالائے شعور وقت کے آثار کو سمجھ اور سمجھا سکتی ہے؟ شعوری وقت کا تعلّق صرف اس طبعی دنیا سے ہے جبکہ مابعد الطبعیّات یا موجودہ آثارِ دنیا سے پرے وقت کی جہتیں بے کراں اور نا معلوم ہونگی جیسا کہ قرآن وہاں کے ایک دن کو ہمارے ہزار سال کے برابر بتاتا ہے! جنّت میں جا کر ہر انسان کو ایک مقام پر قیام کرنا ہوگا جس کے وقت کے اوزان کا کچھ پتہ نہیں مگر یہ ضرور بتایا جا رہا ہے کہ جو بھی جگہ تمہارا مقدّر رہو خواہ وہ لذّتوں سے بھر پور ہو یا آگ کی طرح گرم، رہنا وہاں ہمیشہ ہی ہوگا کیونکہ وہاں پر ایک مسلسل "حال" constant Present ہوگا کوئی ماضی اور مستقبل نہیں۔ قرآن وقت کے مختلف پیمانوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ہمیں وقت کی ان پیمائشوں کا ادارک نہیں ہو سکتا کہ حقیقتاً ان کی ہمارے وقت سے کیا نسبت ہے۔ جن جہتوں کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے وہ اس طرح بھی واضح ہے کہ قرآن نے اور سائنس نے یہ بتایا ہے کہ مختلف کائناتوں یا آسمانوں میں مختلف قوانینِ طبعی

ہیں۔واضح رہے کہ ابد میں نظام شمسی نہیں ہوگا بلکہ وقت کی پیمائش ہی کسی اجنبی پیرائے میں ہوگی۔مابعدالطبعیاتی ماحول میں جوبھی وقت کی جہتیں ہیں یا رہیں ہیں اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہم زمین یا اس کائنات کے طبعی ماحول سے ہی مانوس ہیں۔سائنسی علوم بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وقت کے ادوار مختلف ہوسکتے ہیں کیونکہ ایک قسم کا وقت کا پھیلاؤ اس وقت بھی دیکھا گیا جب ایٹمی گھڑیوں کو زمین پر اور خلا میں رکھا گیا جب کہ دونوں گھڑیاں بہترین حالت میں تھیں گویا قانون قدرت یہ ہے کہ کہ جب کشش ثقل اور رفتار میں تبدیلی ہوگی تو وقت خود ہی نیا رخ اختیار کرے گا۔اب اگر جہاں ثقل اور رفتار بھی نہ ہوتو وہاں وقت کیسے گزرتا محسوس ہوگا؟ غور کرنے کا نکتہ یہی ہے۔اس سے بڑھ کر قرآن کی حقّانیت کا اور کیا ثبوت ہوگا کہ خود سائنس قرآن میں مذکورہ باتوں کو ثابت کررہی ہے۔

ستاروں کے مقام کی قسم

قرآن: (سورۃ ۵۶،آیات ۷۵۔۷۶)

"سومیں ستاروں کی مقام کی قسم کھاتا ہوں اور یہ ایک عظیم قسم ہے اگر تم سمجھوتو۔"

قابل غور یہ بات ہے کہ ستاروں کے مقام کی قسم کو اس وقت عظیم قرار دیا جارہا تھا جب انسان کائنات میں معلّق اور حرکت کرتے اربوں کھربوں ستاروں کی مداری اور محوری گردش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔لیکن خالقِ کائنات اس طرف توجّہ اس لیے دلا رہے ہیں کہ یہ تذکرہ ریکارڈ پر آجائے تاکہ آئندہ آنے والی اُن نسلوں کے لیے اسے نشانی بنایا جائے جو علوم حاصل کرکے اور کائنات کے نظام کا مطالعہ کرکے اس قَسم کو عظیم اور قرآن کو برحق قرار دینے پر مجبور ہونگی۔یہی آج کل جدید فلکیاتی سائنس کررہی ہے۔جدید معلومات حیرت زدہ کرنے والی ہیں کہ کھربوں ستارے کس طرح اپنے اپنے مدار پر قائم ہیں اور کسی نہ کسی سورج کے گرد گردش بھی کرتے ہیں۔ گویا قرآن محض ایک کتاب نہیں بلکہ انسان کو کائناتی حقائق واسرار سے باخبر کرتا علم کا ذخیرہ بھی ہے۔

باب ۱۰

غیر معمولی مظاہر اور قرآن

قرآن وہ کتاب ہے جس کے بارے میں اسلام کا یہی دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کے آخری نبی ﷺ کے ذریعے انسانوں کو اللہ کا آخری تحریری پیغام ہے یوں یہ بات بھی طے ہوئی کہ اس میں درج امور ہر آنے والے دور کے لیئے بھی ہیں۔ اللہ نے اسی لیئے عربی زبان میں ایسی بلاغت رکھ دی کہ اس کے ہر ہر لفظ کے بہت سے معنی ہیں یعنی ہر دور کے انسان کے لیئے اُس کا بیانیہ۔ اب اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو محض قصہ کہانی لگتی ہیں جیسے جانور سے باتیں، جنّات کا وجود، ملکۂ سبا بلقیس کے تخت کی منتقلی اور وقت میں سفر یا روشنی سے تیز سفر وغیرہ۔ ہم ان مظاہر کی جانچ جدید سائنسی دریافتوں اور پیش رفت کی روشنی میں کریں گے کہ یہ حقیقت سے قریب ہیں یا محض افسانہ۔

جانوروں کی بولیاں

قرآن: (سورۃ ۲۷، آیات ۱۵۔۱۶)

"ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے
ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔
اور اس نے کہا "لوگو، ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں
ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں، بے شک یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے۔"

قرآن: (سورۃ ۲۷، آیات ۱۸۔۱۹)

"یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیوں
اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں
اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔" سلیمانؑ اس پر مسکرا کر ہنس پڑا اور بولا 'اے میرے رب
مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کرتا رہوں۔۔۔۔'"

قرآن: (سورۃ ۲۷، آیات ۲۲)

" کچھ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے (ہدہد نے) آ کر کہا،
'میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں

نہیں ہیں، میں سبا کے بارے میں یقینی اطلاع لیکر آیا ہوں"۱۱

انسان اور جانوروں میں گفتگو ایک انہونی اور کہانیوں والی بات لگتی ہے کیونکہ ایسی بات محض مذاق ہی سمجھی جاتی رہی ہے لیکن ایک پیغمبر کو یہ صلاحیت دیکر، اس کا عملی اظہار کر کے اور تذکرہ کر کے بتایا گیا کہ انسان ایسا کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ انسان میں زبردست صلاحیتیں پوشیدہ ہیں جو حصول علم سے ہی مسخر ہو رہی ہیں۔ موجودہ دور میں جس طرح ہر شعبے میں تحقیقات ہو رہی ہیں اسی طرح جانوروں کی زبان کو سمجھنے کی کوشش بھی جاری ہے کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ جانوروں میں بھی کوئی مواصلاتی نظام موجود ہے جس کے کے پیچھے ضرور کوئی زبان ہے جو انسان کو ابھی نہیں معلوم لیکن جدید تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان اس کو جان لے گا۔ ذیل میں اس ضمن میں ہونے والی تحقیقات میں سے محض ایک کی جھلک مستقبل کی ممکنہ کامیابیوں کی نوید ہے۔

"جانوروں کے طرزِ عمل کے ماہر کا کہنا ہے کہ جلد ہی ایسے آلات دریافت ہو جائیں گے کہ ہم اپنے پالتو جانوروں سے بات کر سکیں گے۔ اس ماہر کا کہنا ہے کہ، ہم تیزی سے اُس طرف بڑھ رہے ہیں جہاں کمپیوٹر کے ذریعے جانوروں سے رابطہ ممکن ہو جائے گا۔ ہمارے پاس ایسی تکنیکی مہارت آ چکی ہے کہ ایسے آلات بنائے جا سکتے ہیں جو سیل فون کی طرح ہوں اور کتّوں اور بلّی سے گفتگو کرائیں، یعنی کتا بھونکے تو آلہ بتائے کہ، مجھے آج مرغی کھانی ہے! یا بلّی میاؤں کرے تو پتہ چلے کہ، آپ نے میرے کوڑے دان کو صاف نہیں کیا!! وہ کہتا ہے کہ اس تکنیک کے لیئے ریسرچ کرنی ہوگی جو عرصہ پانچ سے دس سال میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم اس مقام تک ضرور پہنچ سکتے ہیں جہاں کون جانے کہ کتے، بلّی اور شائد شیر اور شیر ببر سے انکی زبان میں دوطرفہ گفتگو ہو سکے!"

http://www.theatlantic.com/technology/archive/2013/06/animal-behaviorist-well-soon-have-devices-that-let-us-talk-with-our-pets/276532/

ملکۂ سبا بلقیس کے تخت کی پرواز

(تخیّل کی قوّت اور مادّے کی توانائی پھر مادّے میں تبدیلی)

کیا کسی انسان کے پاس اتنی طاقت آ سکتی ہے کہ ہزاروں میل دور سے کسی چیز کو لمحہ موجود میں ہی حاضر کر دے؟ کیا قرآن میں درج ایسی ہی بات محض ایک دیومالائی کہانی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں؟ مسلمان اسے درست مانتے ہیں تو اس کا تعلق عقیدے سے ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ ایمان اور عقیدہ بغیر عقلی تشریح کے ہے لیکن کیا خالق کائنات کسی بات کا تذکرہ بغیر علمی یا عقلی بنیاد کے کرے گا؟ اس کی ایک مثال یہ ہے، دیکھیئے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔

قرآن: (سورۃ ۲۷، آیت ۳۹۔۴۰)

"ایک بڑے جن نے کہا کہ میں آپ کے اپنی جگہ سے اُٹھنے سے قبل لاسکتا ہوں،
میں طاقتور اور قابل بھروسہ ہوں۔ جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بولا
''میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں'' جونہی سلیمان نے
وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اُٹھا یہ میرے ربّ کا فضل ہے۔"

روداد اس کی یہ ہے کہ ایک پیغمبر نے ملکہ سَبا بلقیس کو ایمان کی طرف راغب کرنے کے لیئے ایک انہونی خواہش کا اظہار کیا کہ کون اس کا تخت اس کے آنے سے قبل یہاں لاسکتا ہے۔ تو ایک طاقتور جنّ نے کہا کہ میں اس کو آپ کے یہاں سے اُٹھنے سے قبل لاسکتا ہوں جبکہ ایسے میں ایک علم والے نے اسے پلک جھپکنے سے قبل لا ڈالا! قرآن میں ملکہ سَبا بلقیس کے تخت کے حوالے سے ایک پیغمبر کے سامنے ایک علم والے کی قوّت کا مظاہرہ اور تذکرہ اپنے اندر بے بہا معلومات لیئے ہوئے ہے۔ یہ معجزہ کہلاتا اگر پیغمبر کی وساطت سے ہوتا لیکن اس کا ایک عام مخلوق کی کارگزاری کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں کتاب کے "ایک علم One-Knowledge" کا نہایت واضح اشارہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ میٹا فزکس میں اجنبی علوم موجود ہیں جو موجودہ طبعیاتی سائنس سے بہت زیادہ ترقّی یافتہ ہیں لیکن اپنے اچھوتے پیرامیٹرز یا پیراؤں کے ساتھ ہمارے شعور سے فی الوقت اوجھل ہیں۔ یہاں قرآن انسان کی آئندہ ممکنہ علمی اور تکنیکی ترقّی کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔ یہ محض کوئی دیومالائی قصّہ نہیں بلکہ انسان میں موجود نادیدہ قوّتوں کی طرف اشارہ ہے کہ انسان بھی یہ سب کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے خواہ طبعیات کے ذریعے کرے یا روحانیت کی قوّت سے کرے! ہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ کی کوئی علمی تشریح کی جاسکتی ہے؟ موجودہ علوم کی روشنی میں اس واقعہ کی ممکنہ علمی تشریح یہی ہوسکتی ہے کہ تخت مادّے سے توانائی میں تبدیل ہوا پھر روشنی یا اس بھی زیادہ رفتار سے منتقل ہو کر دوبارہ مادّے میں تبدیل ہوا۔ گویا یہ کسی مخفی سپر سائنس کا ایک مظاہرہ ہے جس میں انسانی تخیل کی طاقت کا اہم کردار ہے۔ یہ بات تکنیکی طور پر درست ہوسکتی ہے کیونکہ یہ ہمارے موجودہ علوم کی ترقّی کرتی سمت کے بموجب بعید از قیاس بھی نہیں! اس کے دو پہلو ہیں ایک خیال کی طاقت اور دوسرے مادّے کی ہیئت کی تبدیلی، پھر ان دونوں کا بیک وقت ایکشن میں آنا۔ بس سوال انسان کی ذہنی، علمی اور مادّی صلاحیّت کا ہے کہ کیا انسان ایسی قوّتوں اور

علوم کو مسخر کر سکتا ہے؟ ہمارا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کا بڑھتا علم مابعد الطبعیات یا میٹافزکس کے کچھ گوشوں کو طبعیات یا فزکس میں بھی ڈھالتا جا رہا ہے۔ اب ایک رخ یہ بھی دیکھیئے کہ ہمارے خیالات بھی غیر طبعی ہیں اور اپنی ساخت اور منبع کے حوالے سے جدید محقق کے لیئے ایک راز ہی ہیں۔ خیال کی رفتار لامحدود ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ: کیا انسان کا تخّیل کوئی مخفی طاقتیں بھی رکھتا ہے؟ اور یہ بھی کہ کیا جدید مائنڈ سائنس mind-sciences انسان کے اندر موجود کسی خوابیدہ اور بلاخیز غیر مرئی طاقت کا کھوج لگا کر اسے مسخر کر سکتی ہے؟ آج کی جدید دریافتیں کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ موجودہ دور میں ایک طرف ذہنی و دماغی سائنس Mind-Sciences کے شعبے انسان کے دماغ کی انہی چھپی قوّتوں پر تحقیق کر رہے ہیں تو دوسری طرف جدید سائنس بھی روشنی کو مادّے میں طبعیٔ طور پہ تبدیل کرنے کی ابتدائی منزل پر پہنچ چکی ہے۔ ملاحظہ کریں!

"امپیریل کالج لندن کے فزکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر اسٹیو روز کا کہنا ہے کہ سائنسدانوں نے اسّی سال کی کوششوں کے بعد روشنی کو مادّے میں تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جب بریٹ اور ویلر نے اسّی برس قبل یہ تھیوری پیش کی تھی تو انکو یقین نہیں تھا کہ یہ کبھی لیبارٹری میں تجربے میں دکھائی جا سکے گی۔ لیکن آج اسّی سال بعد ہم نے انہیں غلط ثابت کر دیا۔ جس چیز نے ہمیں حیران کیا وہ دریافت تھی کہ ہم برطانیہ میں موجود ٹیکنالوجی سے کس طرح روشنی کو مادّے میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اب ہم بات کر رہے ہیں ان لوگوں سے جو ہمارے ان نظریات کو استعمال کر کے سنگِ میل تجربات کر سکتے ہوں۔"

imperialcollege/newssummary/news_16-5-2014-15-32-44#

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اب ان امکانات پر نہ صرف سائنسدان غور کر رہے ہیں بلکہ اس سمت میں قابل ذکر ابتدائی عملی پیش رفت بھی ہو چکی ہے۔ یہ بات مدنظر رہے کہ علم اور دریافتوں کا ہر نیا روزن دراصل کسی وسیع علوم سے لبریز کائنات میں کھلنے والی کھڑکی بھی ہو سکتی ہے جو اپنے اندر مستقبل کے بے شمار ممکنات لیئے ہوتی ہے، اس کی ایک مثال بجلی یا برق کی دریافت تھی۔ مثبت اور منفی کرنٹ کی یہ چھوٹی سی دریافت آج ہمیں بائنری نمبر binary-number (صفر اور ایک) کے تئیں انتہائی پیچیدہ سوفٹ ویئر کی تخلیق سے سپر کمپیوٹر، روبوٹ اور خلائی تحقیقات تک لے آئی ہے اور کون جانے مادّے سے توانائی اور توانائی سے مادّے کی تبدیلی کی جدید دریافتیں مستقبل میں انسانوں کو نہ جانے کیسے کیسے محیر العقول کارناموں کا خوگر بنا دے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسان جو سوچتا ہے اکثر وہ چیزیں حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ بہت عرصہ قبل بچوں

کی کہانیوں میں انسان کو راکٹ کے ذریعے چانداور مریخ پر جاتے بتایا جاتا تھا، وہ سب حقیقت بن گیا۔اسی طرح ٹیلی وژن کی مشہور سیریز اسٹار ٹریک star trek بہت سوں نے دیکھی ہوگی اس میں انسان جہاز سے سیاروں پر توانائی بن کر منتقل ہوتا تھا۔کیا یہ اب ممکن ہوسکتا ہے۔ موجودہ دور کے ایک مشہور امریکی سائنسدان کاکو ، جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ کو حیران کرسکتا ہے۔

"نیویارک یونیورسٹی کے پروفیسر میچیو کاکو Michio Kaku کہتے ہیں کہ: وہ ٹیکنالوجی جو انسان کو زمین پر کہیں یا خلا میں ٹیلی پورٹ کرسکے گی اگلے دس سال تک ورنہ آئندہ صدی تک دستیاب ہوجائے گی! پروفیسر جو اپنے مستقبل کے امکانات کے بموجب مسٹر متوازی کائنات بھی کہلاتے ہیں، انہوں نے ریئل ٹائم ٹریول اور غائب ہوجانے کی ٹیکنیک کا مطالعہ کیا ہے اور انکا خیال ہے کہ ان میں اکثر وقوع پذیر ہوسکتی ہیں۔مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ جو کچھ آپ اسٹار ٹریک فلم میں دیکھتے رہے ہیں وہ سب درحقیقت ممکن ہوجائیں گی۔"

http://www.express.co.uk/news/science/602529/Human-teleportation-is-possible-and-your-great-GRANDCHILDREN-will-do-it-claims-scientist

ٹائم ٹریول یا وقت میں سفر کی حقیقت

ٹائم ٹریولز کا تذکرہ بہت ہوتا ہے۔اس موضوع پر فلمیں بھی بنی ہیں اور عام لوگوں کے لیئے یہ سائنس فکشن ہی ہوتی ہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا وقت میں سفر ممکن ہے؟ آئیں پہلے آسان لفظوں میں سمجھیں کہ وقت میں سفر Time travel کیا ہے۔

ہمیں جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ روشنی کا کسی چیز پر ٹکرا کر اس کا عکس ہماری آنکھ کے ذریعے اعصاب تک لیجانے کی وجہ سے ہے۔روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل یا تقریباً تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے اسی لیئے ہمیں اطراف کے مناظر فوراً نظر آجاتے ہیں۔اگر کوئی چیز زمین سے تین لاکھ کلو میٹر دور ہے تو اس سے ٹکرا کے آنے والی روشنی کی کرن ہماری آنکھوں تک ایک سیکنڈ میں پہنچے گی اور ہمیں وہ چیز ایک سیکنڈ پہلے والی نظر آئے گی۔سورج کا فاصلہ زمین سے 150 ملین کلومیٹر ہے اور اسکی کرن ہم تک تقریباً آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہمیں جو سورج نظر آتا ہے وہ آٹھ منٹ پہلے کا ہوتا ہے۔ٹائم ٹریول کو سمجھنے کے لیئے فرض کریں اگر ہم روشنی کی دگنی رفتار سے سورج جتنے فاصلے پر موجود کسی ستارے یا سیارے پر جا کر پلٹ آئیں تو ہمارا جانا چار منٹ میں اور واپسی بھی چار منٹ میں ہوگی اور کُل سفر آٹھ منٹ میں ہوگا۔لیکن دلچسپ بات یہ ہوگی کہ زمین پر پہنچ کر ہم خود اپنے آپ کو واپسی کا سفر کرتے دیکھیں گے کیونکہ روشنی کی وہ کرنیں جو ہم سے

ٹکرا کر اور ہماری متحرّک تصاویر images لیکر زمین کی طرف آ رہی تھیں اُن کو تو ہماری آنکھ تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لگنے ہیں جبکہ ہم اُن سے پہلے (چار منٹ میں) روشنی سے دگنی رفتار کی وجہ سے زمین پر آ گئے اسطرح ہمارا متحرّک عکس بعد میں ہماری آنکھوں میں داخل ہوتا رہے گا جس کی وجہ سے ہم خود کو دیکھ رہے ہونگے۔ یہی مستقبل یا وقت میں سفر ہے اسی کو ٹائم ٹریول Time Travel کہا جاتا ہے یعنی روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار سفر۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ دیکھیں سائنسدان ہاکنگ کیا کہتے ہیں۔

"میں وقت میں، مستقبل میں سفر پر یقین رکھتا ہوں۔ وقت ہم سب کو ساتھ میں لئے دریا کی طرح بہتا ہے، لیکن یہ ایک اور طرح سے دریا کی طرح بہتا ہے، یہ مختلف جگہوں پہ مختلف رفتار سے بہتا ہے اور یہی وقت میں سفر کی کلید ہے۔ یہ تصوّر ۱۰۰ سال پہلے آئن اسٹائن نے دیا۔" (اسٹیون ہاکنگ)

http://www.dailygalaxy.com/my_weblog/2010/07/stephen-hawking-time-travel-to-the-future-is-possible.html

وقت میں سفر کے لیئے سائنسداں ایک تصوّرر پر ریسرچ کرر ہے ہیں جس میں ایک تصوّراتی خلائی راستہ ہے جو کسی پُر پیچ راستے یا پگڈنڈی پر شارٹ کٹ ہوگا۔ اس مختصر راستے کو Wormhole وورم ہول کا نام دیا گیا ہے۔

"**وورم ہول**: یہ اسپیس ٹائم ٹیوب Space-Time Tube ہے جو کائنات کے دور دراز علاقوں کو ملانے والا ایک چھوٹا راستہ یعنی شارٹ کٹ ہے۔ اس میں سفر کرتے ہوئے آپ روشنی کی اُس بیم سے زیادہ رفتار سے سفر کریں گے جو اسپیس ٹائم میں سفر کرتی ہے۔ کسی بھی پیرائے میں وورم ہول میں روشنی سے زیادہ رفتار سے سفر کا مطلب وقت میں ممکنہ سفر ہوسکتا ہے۔"

http://www.pbs.org/wnet/hawking/strange/html/wormhole.html

سائنس دانوں کے مطابق نظریاتی طور پر روشنی سے تیز سفر ممکن نہیں لیکن یہ نظریہ اب تک کے حاصل علم کے مطابق ہی ہے۔ کائنات کے ہر لحظہ پھیلنے میں ایک نئے عامل اندھیری توانائی Dark Energy کی ممکنہ موجودگی سے یہ بات بھی ثابت ہوسکتی ہے کہ روشنی سے بھی تیز حرکت ممکن ہے۔ ایک سائنسی نظریہ یہ بھی ہے کہ کائنات روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار سے ہر لحظہ پھیل رہی ہے جس کے بموجب رفتار کا لامحدود ہونا بھی ممکنات میں ہے یعنی ہم منطقی طور پر رفتار کو روشنی تک محدود نہیں کرسکتے۔ مندرجہ بالا حوالے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وقت میں سفر یعنی وقت کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھنا تھیوری میں قابل عمل جدید سائنسی نظریہ ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں بس انسان کا

مسئلہ اس کی علمی اور عملی استعداد ہے جو کہ فی الوقت محدود ہے۔ اب اس طرف توجہ دیں کہ اس کائنات کے خالق نے اس کی نہ صرف عملی مثال قائم کی بلکہ اپنے کلام میں اس کا تذکرہ بھی کر دیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک برتر اور سپر سائنس ہمیشہ سے کائنات میں کارفرما ہے جس کی علمی اور عملی استعداد لامحدود ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ ۱۴۰۰ سال قبل سفر معراج میں عملاً دکھایا گیا۔

قرآن: (سورۃ ۱۷، آیت ۱)

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گئی مسجد حرام سے
مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے۔ تاکہ اسے اپنی نشانیوں
کا مشاہدہ کرائے۔ وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔"

غور کریں کہ قرآن انسان کو ایک بظاہر انہونی اور انوکھی بات سے آگاہ کر رہا ہے جو سمجھ میں تو نہیں آتی لیکن جدید سائنسی نظریات آج اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے ایک رات مکّہ سے بیت المقدس کا سفر کیا جس کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے پھر اس کے بعد آپ ﷺ وہاں سے آسمان پر ایک انوکھی انتہائی برق رفتار سواری پر تشریف لے گئے ہے اور مزید یہ تذکرہ بھی اس آیت میں ہے کہ کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرایا۔ اس کو سفرِ معراج کہا جاتا ہے جو آج بذات خود بھی ایک نشانی بن کر سامنے آ رہا ہے۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ یہ بات مرقوم ہے کہ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو زمین پر وقت وہی تھا روایت ہے کہ غالباً دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی حالانکہ آپ بہت طویل وقت یہاں سے غیر حاضر رہے تھے۔ عام علم والے کے لیئے یہ ایک ناقابل یقین بات ہے لیکن اس کو ایمان اور معجزے کی ضمن میں لوگوں نے قبول کیا۔ اب اس دور میں علوم کی ترقّی سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے روشنی کی رفتار سے بھی بہت زیادہ رفتار سے سفر کیا غالباً روشنی سے درجنوں گنا زیادہ رفتار سے اسی لیئے زمین پر وقت نہیں گزرا اور آپ کی واپسی ہو گئی، اوپر بیان کی ہوئی ستارے کی طرف سفر اور واپسی کی مثال سے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن میں اس کا تذکرہ اس کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ گویا سفرِ معراج میں کائنات میں رواں عظیم تر اور غالب سائنس کی قوّت کا ایک مظاہرہ ہوا جسکو جدید انسانی سائنس ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک نکتہ قابل غور یہ ہے کہ اگر قرآن کسی انسان کی تحریر ہوتا تو وہ شخص ایسی انہونی بات جس کو عام انسان قبول نہ کرے کیوں لکھتا۔

خلائی مخلوق اور جنّات

قرآن: (سورۃ ۲۷، آیت ۳۹)

"ایک بڑے جن نے کہا کہ میں آپ کے اپنی جگہ سے اُٹھنے سے قبل لاسکتا ہوں،
میں طاقتور اور قابل بھروسہ ہوں۔"

جیسا کہ پہلے یہ بحث ہوچکی ہے کہ سائنسی طور پہ کوئی بھی خیال دراصل فطرت میں موجود کیمیائی اور طبعی یا فزیکل قانون کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آیئے ذرا غور کریں کہ جن، بھوت اور چڑیل جنکا تذکرہ بہت عام ہے وہ آخر ہمارے خیالات میں کیوں آتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو اس حوالے سے شعوری تجربات کیوں ہوتے ہیں اور ایسے مافوق الفطرت یا پیرافزیکل وجود حقیقتاً کیا ہو سکتے ہیں۔

خیال کا طبعی شکنجہ

ہم اپنے حواس کو ایک ناقابلِ تبدیل an invariable جہت سمجھتے ہوئے زندگی کو حواسِ خمسہ کی اکائی کے حوالے ہی سے پہچانتے ہیں۔ ہم ماحول سے جو بھی اخذ کرتے ہیں وہ ہمارے شعور، حواس اور دماغ کا مربوط فیصلہ ہوتا ہے جبکہ ہمارے خیالات محدودیت کے ایک غیر محسوس شکنجے میں کسے ہوئے ہوتے ہیں یعنی ہماری سوچ اکثر غیر معمولی حالات کا ادراک بھی مخصوص دائرۂ کار میں کرتی ہے۔ ہمارے اخذ کردہ اکثر شعوری نتائج دراصل پہلے سے مرتّب ذہنی رو میں ہی گردش کرتے ہیں اسی لیئے کسی بھی قسم کی زندگی ہمارے لیئے تب ہی قابلِ قبول ہوگی جب وہ ہمارے مروّجہ معیارِ حواس کے حوالے سے قابلِ شناخت ہو۔ ہمارے مضبوط ذہنی تاثّر کے مطابق خلیاتی زندگی Cellular Life یعنی مادّے کی اساس پر قائم زندگی ہی اصل اور کُلی حیات ہے اور یہی خیال کا وہ شکنجہ ہے جسکو ایک صاحب علم بھی نظر انداز کر جاتا ہے۔ یعنی انسانی ذہن میں حیات کا تصوّر ایک جامد خلوی پیرائے cell-based-parameters کے اندر مقیّد ہے۔ جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ سائنس کا دائرۂ کار طبعی ہے لٰہذا وہ غیر طبعی عوامل کا ادراک اسی وقت کرے گی جب اسکی علمی سکت اور قوّت مابعد الطبعیات کو سمجھنا شروع کرے گی۔

ہمارے اب تک کے علم کے مطابق کائنات عناصر اور توانائی Matter & Energies کا مجموعہ ہے۔ زندگی موجودہ شکل میں حیاتیاتی خلیوں کی وجہ سے ہے جو کہ مادّہ ہی ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر

مادّے سے زندگی کا ظہور ہے تو پھر توانائی سے کیوں نہیں؟ دورِ جدید کے تسلیم شدہ بڑے سائنسداں اسٹیون ہاکنگ نے جب اعلان کیا کہ دُور کائنات میں انسان سے بلین سالہ قدیم اور ترقّی یافتہ اجنبی مخلوق موجود ہوسکتی ہے جس سے رابطہ کیا جائے گا تو کسی نے مذاق نہیں اُڑایا کیونکہ یہ عقل اور حاصل کردہ علوم کا نتیجہ ہے۔

"A civilization reading one of our messages could be billions of years ahead of us. If so, they will be vastly more powerful, and may not see us as any more valuable than we see bacteria."

http://time.com/3967126/stephen-hawking-seti-extraterrestrial-life-breakthrough

"ایک تہذیب جو ہمارا پیغام پڑھے گی ہم سے اربوں سال آگے ہوسکتی ہے وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہوسکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں اتنی بھی اہمیت نہ دیں جتنی ہم ایک بکٹیریا کو دیتے ہیں!"

ممکنہ خلائی مخلوق کا اعتراف درحقیقت ایک بڑا یوٹرن ہے جس نے جدید سائنس کے خالص طبعی افکار میں ایک دراڑ ڈالدی ہے اور اس سے پے در پے اٹھنے والے سوالات مستقبل میں سائنس کے اس حقیقی کردار کی وضاحت کریں گے جس میں سائنس پیرافزکس کو اپنے دائرہ کار میں لانے پر مجبور ہوجائیگی۔ پارٹیکل فزکس ایک بے پایاں سمندر ہے جس میں جدید سائنس غرق ہے یہ علوم کی نئی دنیا ہے جس کی وسعتیں بے پایاں ہیں اور کل ظاہر ہونے والی معلومات کا ادراک مشکل ہے۔ یہ بھی سائنسدانوں کا مضبوط یقین ہے کہ کائنات میں جہاں بھی زندگی ہوگی وہ لازماً پانی کی اساس پر ہوگی۔ کیا ہمارا یہ سمجھ لینا کہ زندگی ویسی ہی ہوسکتی ہے جیسی کہ ہمیں معلوم ہے ایک غیر علمی نقطۂ نظر نہ ہوگا؟

کیا کوئی انوکھی زندگی پانی کے بجائے کائناتی توانائیوں سے نہیں پھوٹ سکتی ہے؟

اگر ایسا ہے تو پھر وہ زندگی ویسی ہی کیوں ہو جیسی ہم پہچانتے ہیں؟

ویسے ہی حواس اور شعور کی حامل کیوں ہو جو ہم جانتے ہوں؟

سائنسی علوم کے مطابق شروع میں کائنات شدید گرم تھی جو رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوئی اور اربوں سال کے بعد سازگار حالات میں پانی بنا اور پھر پانی سے زندگی کا ظہور شروع ہوا۔ یہاں ایک فطری اور منطقی سوال سامنے آتا ہے کہ کائنات میں اگر زندگی پانی سے شروع ہوئی تو اس سے قبل آگ سے بھی کیوں نہ ہوئی ہوگی۔ پانی میں اگر کسی فزیکل قانون کی موجودگی کی وجہ سے زندگی شروع ہوئی

تو آگ کی زندگی کے قوانین کیوں نہ ہوئے؟
کوئی اجنبی زندگی نامیاتی نابینا یا خلوی اندھی مخلوق Cellular Blind Creature بھی تو ہو سکتی ہے یعنی انسان و جاندار کے وجود سے لاعلم، صرف اپنے اچھوتے حواس اور شعور میں مگن۔ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارا یہ تصوّر کہ زندگی صرف پانی یا مادّے سے ہی ممکن ہے ایک غیر منطقی بات اور تنگ نظری ہے۔

توانائی کی زندگی

یہاں اس بحث سے یہی سمجھنا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ فطری طور پر کوئی زندگی آگ سے بھی اُبھری ہو جسکے پیرامیٹرز یا اسکی ساخت، شعور اور حواس پانی کی زندگی سے بالکل جدا نوعیت کے ہوں! اس ضمن میں اُس فطری ارتقاء کو مدِّ نظر رکھیں کہ کائنات ابتداء میں انتہائی گرم تھی اور آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوئی یہاں تک کہ زمین پر خلیاتی زندگی ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایسی زندگی جس کا مآخذ تپش اور آگ ہو تو وہ زمینی زندگی سے پہلے وجود میں آئی ہوگی۔ اگر دہکتے ستارے میں توانائی کے کسی منبع سے کوئی زندگی پھوٹ سکتی ہے تو وہ ویسے ہی لطیف خواص کی حامل ہوگی جیسا کہ توانائی! کیا ہم اسے تھرمل لائف Thermal Life کا نام دے سکتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ پانی سے ابھرنے والی زندگی توانائی اندھی Energy-Blind ہے یعنی انسان اپنے بصری حواس سے کششِ ثقل اور نیوکلر فورسز کو نہیں دیکھ سکتا لہٰذا وہ کسی ایسی زندگی کو بھی نہیں دیکھ سکتا جسکا منبع origin توانائی سے منسلک ہو۔ یہ بھی مدّ نظر رہے کہ ہماری مذکورہ توانائی والی زندگی Thermal life بھی اپنے ارتقاء سے گزری ہوگی اور عجب نہیں کہ اس نے توانائی سے مادّے میں ڈھل جانے اور واپس جانے کی صلاحیت بھی پالی ہو۔ آئیں اور حیرت زدہ ہو کر دیکھیں کہ قرآن کیا کہتا ہے!

قرآن: سورۃ الحجر (۱۵) آیات ۲۶۔۲۷

وَالْجَآنَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ

اور ہم نے انسان کو سڑی مٹّی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اس سے
پہلے ہم جنوں کو آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے۔

یہاں قرآن وضاحت کر دیتا ہے کہ انسان سے پہلے جنّات کی آگ سے تخلیق کی گئی گویا ایسی حیات

جو توانائی یا آگ سے ابھری اسکا کائناتی ارتقاء میں انسان سے پہلے ہی ظاہر ہونا منطقی ہے اور جسکا انکشاف قرآن نے یہاں کیا۔ اب یہ سائنسی ماہرین کی کاوشوں پر منحصر ہے کہ کب ایسی حیات کی تصدیق کرتی ہے۔ رہا سوال یہ کہ اس کائنات میں کسی اجنبی زندگی کا مقام اور دائرہ کار کیا ہوسکتا ہے، تو جیسا کہ ہم پیچھے جان چکے ہیں کہ قرآن وضاحت کرتا ہے کہ انسان ایک برتر حیثیت کا حامل اشرف المخلوقات اور خالق کا نائب ہے۔ کیونکہ اللہ ہر طرح کی تخلیق پر قادر ہے اس لیئے آگ سے پیدا ہونے والی زندگی بھی اللہ کی تخلیق ہے لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ کوئی بھی زندگی اپنے پیرافزیکل وجود کے باوجود انسان سے کمتر ہی رہے گی کیونکہ فزیکل دنیا میں انسان طبعی برتری رکھتا ہے۔ گویا جس اجنبی مخلوق کا یہ سائنسدان انتظار کر رہے ہیں کیا عجب کہ وہ ہمارے درمیان ہی موجود ہو اور اس وقت سے یہاں ہو جب زمین آتش کا گولہ ہو!

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا یہ نظریہ کوئی تصوّراتی نہیں بلکہ جدید تحقیق بھی اس طرف اشارے کر رہی ہے کہ اجنبی طرزِ حیات تو خود زمین پر بھی موجود ہیں جسکا تذکرہ ہم ایک باب میں کر چکے ہیں کہ زمین پر ہی سمندر کی اتھاہ گہرائی میں بحرالکاہل میں آتش فشانی اخراج کے راستوں پر موجود ایک اجنبی طرزِ زندگی ہے جو مکمل طور پر کیمیکل پر زندہ ہے، جبکہ بغیر آنکھوں والے جھینگے بحراوقیانوس میں پائے گئے۔ اسطرح یہ بات تو عیاں ہوئی کہ خود زندگی کی جہتیں dimensions بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔ اب جبکہ یہ سائنسی طور پہ ثابت ہوا کہ ہمارے مخصوص ذہنی معیار سے بہت ہٹ کر بھی زندگیاں ہوسکتی ہیں تو آگ یا مخفی توانائی سے جنات کیوں نہیں ہوسکتے؟ اس دنیا میں انسان کو خالق نے اشرف المخلوق قرار دیکر فوقیت عطا کی ہے لہٰذا جن یا کوئی بھی خلائی مخلوق بہت سی اجنبی مافوق الفطرت خصائص کی حامل ہوتے ہوئے بھی انسان کے مقابلے میں طبعیٔ ماحول Physical Parameters میں کمزور ہی رہے گی۔

باب ۱۱

حقیقتِ کبریٰ اور انسانی عقل

قرآن کے مختصر مطالعے سے ہمیں خالق کے علم اور گرفت کی قوّت کی ہمہ گیریت کا اندازہ ہوا اور یہ بھی کہ انسان کے لیئے انفس و آفاق میں خالق کے وجود کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ اب ہم اپنے فہم سے عدم، تخلیق اور وجود کے حوالے سے سب سے بڑی سچائی یعنی حقیقت کُبریٰ کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیا یہ کائنات کسی تسلسل کا حصّہ ہے؟ اگر ہاں، تو قبل کائنات یعنی عدم کی ماہیّت کیا ہے؟

شئے، عدم یا لاشئے

عدم ایک پراسرار مظہر ہے۔ یہ کائنات مادّہ پر مبنی ہے جسے ہم شئے یا Matter کہتے ہیں، اشیاء کا مجموعہ ہی کائنات ہے۔ شئے کے حوالے سے جب ہم کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ہے یا "لاشئے" یا عدم، تو درحقیقت ہم صرف شئے کے حوالے سے with reference to matter ہی گفتگو کر رہے ہوتے ہیں اور مزید یہ کہ ہم صرف اور صرف وجود کے پیرائے میں ہی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ (only within the parameters of *existence*) کیونکہ وجود کا تعلّق اشیاء اور مادّے ہی سے ہے تو جب کچھ نہیں تھا تو وجود کا تصوّر بھی نہیں۔ یعنی مادّے کے ظاہر ہونے سے پہلے عدم میں خود وجودیت عیاں ہوئی یا تخلیق کی گئی۔ یہ نکتہ توجہ چاہتا ہے کہ وجودیت عدم سے جدا بذاتِ خود ایک مظہر Phenomenon ہے کہ جس کے مخصوص اور محدود طبعی پیرائے ہو سکتے ہیں اسی لیئے انسان کائنات اور خالق کو وجود کے حوالے سے ہی سمجھنے کا مکلّف ہے! یعنی انسان اور وجودیت ایسے ہیں جیسے کہ مچھلی اور سمندر، گویا انسان وجودیت کے سمندر میں تیرتی مخلوق۔ وجودیت کے پیرائے میں لا وجودیت nonexistence کے بارے میں ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے ایک خلا یا لامحدود سناٹا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ابتدائے کائنات سے پہلے کچھ نہیں تھا تو یہ صرف وجود کے حوالے سے درست مقولہ ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے عدم میں وجود سے بالا کچھ اجنبی مظہر phenomenon ہو۔ گویا "بالائے وجود "Meta-existence میں جو کچھ بھی ہو وہ ہمارے

لیے" کچھ نہیں "ہی کہلائے گا حالانکہ ہوسکتا ہے کہ وہاں پہ انسانی شعور سے بالا کچھ اور غیر طبعی یا اجنبی حقائق ہوں! گویا یہاں ہم صرف اپنی لُغت اور علم تک ہی باشعور ہیں۔ایک بات بہرحال عقل قبول کرتی ہے کہ اُس عظیم تخلیقی ابتدا سے قبل یقیناً کوئی ایسا ماحول موجود تھا جو کہ بالائے وجود تھا یعنی عدم بھی کوئی ماحول یا مظہر تھا جو ہمارے شعور وعقل سے ماوراء ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اجنبی اِرتعاشات Alien Frequencies ہوں جو شاید ابھی ہم سمجھ نہ پارہے ہوں یا ہم سے اوجھل ہوں۔لیکن اس کا ایک اثر تو ہمارے خیالات میں جاگزیں ہے تبھی تو ہم اسکے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔اگر ہماری لغت یا Vocabulary کے حوالے سے کوئی مافوق التصوّر ذہانت , لامحدود ارادہ یا لامحدود زندگی موجود ہوسکتی ہے تو پھر اس مفروضے hypothesis پر غور کرنا عین منطقی ہوگا کہ اس لامحدود قوتِ تخیّل یا اِرادے نے اس کائنات کی تخلیق وجودیت کے پیرائے میں کی اور انسانوں کو اس میں ایک خاص مقصد کے تحت داخل کردیا تاکہ وقت، مادّہ اور حیات یعنی کُل وجودیت کو ایک کائناتی ماحول میں مقیّد کرکے انسان کا امتحان لیا جائے۔ اس نکتے کی تفصیلی وضاحت آگے بھی آئیگی۔مختصراً انسان وجودیت (وقت، مادّہ وحیات) کے مدار میں گردش کرتا ہوا ذی شعور ہے جسکی عمومی سوچ اور عمل کا محور صرف وجود اور مادّہ ہے۔انسان ہر لمحہ اور لگاتار ابھرتے واقعات ومعاملات وجذبات کے عمل اور ردّعمل کے دائرے میں مصروف، منہمک اور اُلجھا رہتا ہے۔اُسکا شعور، حواس، تجسّس، علم، تجربات ونتائج اور جذبات ایک طرح کا خوشی، غم، دکھ سکھ کا ایک مصنوعی ماحول یا طبعی دھوکہ Physical Illusion تخلیق کیئے رہتے ہیں کہ انسان اُسکو ہی حقیقت Reality گردانئے میں مجبور ہوتا ہے کیونکہ اُسکے حواس کا پیغام یہی ہوتا ہے جبکہ برتر حقیقت انسانی حواسِ خمسہ پر مبنی شعور کی پہنچ سے باہر ہے۔ دیکھیں جب انسان کسی مشین کو مصنوعی ذہانت Artficial Intelligence دیتا ہے تو وہ ایک روبوٹ بن جاتی ہے جسکے پاس ادنیٰ درجے کی سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔اگر کسی طرح اسمیں "ذات کا شعور" ڈال دیا جائے تو پھر وہ روبوٹ ایک درجہ اوپر ہوکر مصنوعی ذہانت Artificial Intellegence نہیں بلکہ عقل کا خوگر ہو جائے گا کیونکہ انسان نے اُسے کسی اعلیٰ تر الیکٹرانک ماحول یا کسی برقی دھوکے Electronic Illusion میں محصور اور مقیم کردیا! بڑے کینوس پر یہی حال انسان کا ہے جو ایک عظیم تر نظام میں مقیم ہے جہاں وقت کی طنابیں انسان کو جکڑے ہوئے ہیں۔

وقت کی جہتیں

وقت انسان کو گھیرے ہوئے ایک حرکت پذیر غیر مرئی ہیولا ہے جس میں خیالات اور ان سے جڑے ہوئے واقعات انسانی زندگی پر محیط اور مسلّط رہتے ہیں۔ اس کے رُخوں Dimensions کی گرفت اتنی مضبوط اور سحر انگیز ہیں کہ قابل سے قابل محقق بھی اس غیر مرئی گرفت کی نزاکتیں سمجھے بغیر اسی کے اندر سوچتا، تحقیق کرتا اور نتائج اخذ کرتا ہے۔ کائنات اور زندگی سے متعلق تمام فلسفۂ حیات جو کہ طبعی زندگی کی اصلیت کی کھوج میں متعیّن کیے گئے ہے وہ سب اسی وقت کے صندوق یا کیپسول میں بند ہیں یعنی دنیا کے تمام امور خواہ ذاتی ہوں یا آفاقی وہ سب وقت کے بہاؤ میں رواں ہیں۔ وقت کا یہ مسلسل بہاؤ ہر لحظہ ایک بدلتا ہوا ماحول اور اس سے منسلک عوامل پیدا کرتا رہتا ہے اور انسان اپنے حواس senses کی وجہ سے مجبور ہے کہ ان کو قبول کرے اور ردِّعمل دے۔ جذبات، خواہشات اور عمل و ردِّعمل ایسا بھنور تخلیق کرتے ہیں کہ مخلوق اس میں گھومتی رہتی ہے۔ بدلتا ہوا وقت اور ابھرتے ہوئے خیالات انسان کو کسی نہ کسی طرح دنیا میں منہمک رکھتے ہیں۔ یہی روزمرّہ کے حالات و واقعات کی بدلتی ہوئی جہتیں Ever Changing Dimensions ہیں جو انسان کو اس کے حواس اور شعور کے تئیں مصروف کار رکھتی ہیں۔

شعور کی قسمیں

شعور ہماری ذہنی حیات کا وہ طبعیٔ اظہار ہے جو کہ روح کے توسّط سے ہوتا ہے۔ حقیقی سچائی کو مزید سمجھنے کے لیے ہمیں حیوانی شعور اور اس کی متوقّع قسمیں اور انسانی شعور کا فرق سمجھنا ہوگا۔ مختلف حیوانات میں شعور مختلف پیمانوں میں موجود ہوتا ہے جیسا کہ حشرات الارض، پرندے، جانور اور سمندری مخلوقات وغیرہ۔ ان تمام مخلوقات کے شعور کا تعلق اپنے ماحول اور اس میں حرکیات Movements سے ہے۔ ایک جرثومے سے لے کر ہاتھی یا اونٹ ہو، یا ایک لاروے سے لے کر وھیل مچھلی ہو سب کے پاس اپنے ماحول کے حوالے سے ایک خاص درجہ کا شعور ہوتا ہے جو ان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کا ان حیوانات سے کوئی شعوری رابطہ communication نہیں ہے لہٰذا انسان ان کے شعور کی تنگی یا وسعت کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہاں ہم یہ ضرور ہے کہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے شعور کی سطح وہ نہیں ہے جو کہ انسان کی ہے۔ انسان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جو شعور کی حد کو ناپ سکے یا اُسکا تعیّن کر سکے لہٰذا انسانی شعور بھی

لامحدود تو نہیں ہوسکتا لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے پاس مخلوق میں برتر طبعی شعور ہے جبکہ کوئی اجنبی یا غیر مرئی شعور Unseen/Abstract Alien Conciousness بھی کہیں موجود ہوسکتا ہے! ہماری سوچ کی راہیں لامتناہی اس لئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لامتناہی ہیں۔ ہم حقیقت کا تعین اپنے شعور اور حواس سے کرتے ہیں۔ انسان اسی علم کو مکمّل حقیقت سمجھے گا جہاں پر اس کا شعور مزید آگہی سے قاصر ہوگا۔ ہم حیوانات کو باشعور اور نباتات کو نامعلوم شعور کا حامل سمجھتے ہیں اور جمادات کو مردہ قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ ہمیں بے جان نظر آتے ہیں لیکن ایٹم کے بارے میں ہم کیا کہیں گے؟ اس میں حرکت، توانائی اور تنظیم کی حقیقت کیا ہے؟

کیا ایٹم باشعور ہوسکتا ہے؟

مندرجہ بالا بحث کا صرف یہ مقصد ہے کہ انسان کے مقام اور صلاحیتّوں کی حد کو سمجھا جائے اور موجودہ ماحول میں اس کا دائرہ کار سمجھا جائے۔ اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کسی اجنبی شعور اور اجنبی مظہر کو سمجھنے کی ایک محدود عقلی صلاحیت ہی رکھتا ہے۔

عدم اور تخلیق

سوال یہ ہے کہ ہم حقیقتِ کبریٰ کو اپنی محدود عقل سے کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ کائناتی تخلیق کی ایک طبعی تصویر ہم پر واضح ہو جائے؟ جیسا کہ قبل میں وقت اور منفی وقت Anti-Tme کا تذکرہ کیا گیا، اب ایک بار پھر اس بہت پُراسرار، حساس اور نازک موضوع کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر مابعدالوقت Paratime یا وقتِ منفی Anti-Time یا عدم کیا ہوسکتا ہے اور تخلیق کے عمل کی ہمارے شعور کے مطابق کیا شکل ہوسکتی ہے۔ یہ محض ایک مفروضہ یا ذہنی کاوش ہے تاکہ انسان کا ذہن ہر قسم کے شکوک سے پاک رہے اور جان لے کہ غیب اور غیر مرئی دنیا شعور سے بلند ہونے کے باوجود کسی حد تک طبعی دنیا کے انسان کے خیالات کی پہنچ میں بھی ہے یعنی اپنے قلب کو مطمئن کرنے کے لئے ہم اس کو طبعی طور پر سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

آئیں انسانی شعور سے ماوراء اُس غیبی ماحول کو ایک مفروضے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عدم کی ماہیت

اُس ماوراء الوقت ماحول Paratime یا عدم کی ماہیت کچھ ایسی ہوسکتی ہے کہ وہاں پر کسی لامحدود ہستی کے ارادے سے جو اس ماحول میں وقوع پزیر ہوتا ہو طبعی اور غیر طبعی عناصر کا ظہور ایک معمول

ہو یعنی ارادے کی قوّت تخلیق کے عمل کو "وجود" دے کر اس دنیا میں ظاہر کرتی ہے یہ وجود طبعی اور غیر طبعی دونوں ہوتے ہیں۔ ہماری دنیا یا اِس ماحول میں ظاہر ہونا ہی دراصل لاشئے سے شئے Thing from Nothing بننا ہوتا ہے۔ ہماری دنیا میں موجود تمام طبعی و غیر طبعی اکائیاں یعنی پارٹیکلز اور غیر مرئی قوّتیں اُس ماوراء الوقت یا عدم میں موجود لامحدود زندگی سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہوں گے یہی تعلق دراصل ان میں کسی غیر مرئی اجنبی شعور Unknown Conciousness کا پتہ دیتا ہے جو ان پارٹیکلز اور فطری قوّتوں Particles & Natural Forces کا خاصہ Property ہوگا۔ وہ لامحدود زندگی کیونکہ انسان کے علم سے باہر ہے لہٰذا انسان اُس باہمی تعلّق کو نہیں سمجھ پا رہا جو کائناتی قوّتوں اور مادّے کی ہر اکائی کا اس ماوراء الوقت ماحول یعنی عدم سے ہے۔ یعنی انسان کے علم میں آئے بغیر ایک ایسا متوازی تعلق جو اجنبی غیر مرئی شعور کے حامل مادّے کو خالق کا عیاں ادراک دیتا ہے۔ انسان کو ایک مصلحت سے اس سسٹم سے الگ رکھا گیا ہے اور عقل دی گئی کیونکہ اسکا تو امتحان مقصود ہے! اسکو سمجھنا اس طور پر آسان ہے کہ جس طرح ایک سپر کمپیوٹر لاکھوں کروڑوں کمپیوٹر کنٹرول میں رکھ سکتا ہے تو یہی نظام اگر لامحدودیت پر مبنی ہو تو وہ اس کائنات کے ذرے ذرے پر حاوی ہوگا۔ ارادے کی قوّت کائنات کے نظام کو ترتیب بھی دیتی ہے اور قائم اور دائم بھی رکھتی ہے۔ وہ ارادہ ایک عظیم ترین زندہ ہستی کا ہی ہوسکتا ہے جس کی جہت عقل سے ماوراء ہے لیکن ہمارا جدید علم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عقلی طور پر یہ ممکن ہے کیونکہ خود انسان ایسے ماحول کی تخلیق پر اب قادر ہوتا جا رہا ہے جو حالانکہ بہت محدود ہوتے ہیں لیکن یہ تو ثابت کرتے ہیں کہ وہی عمل لامحدودیت میں لامحدود ہوسکتا ہے۔ اس دنیا کے مظاہر بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک انتہائی زبردست اور انسانی عقل کو مبہوت کر دینے والا عظیم الشان نظام برسرِکار ہے اور پھر اس کی طرف وہ خاص آسمانی اشارہ بھی بہت اہم ہے جو الہامی کتاب قرآن میں ہے کہ ہر چیز عبادت بھی کرتی ہے اور سجدہ بھی گویا انسان اُن مخفی واسطوں اور پیرایوں Parameters سے ابھی ناآشنا ہے لیکن علوم کی ہوتی زبردست ترقّی ضرور انسان کو فطرت کے ان مخفی رازوں سے آشنا کریگی۔

یہاں پر قرآن کی درج ذیل آیت بڑی رہنما ہے۔

قرآن: (سورۃ 22، آیت 18)

" کیا تم دیکھتے نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ کے آگے جھکتی ہے؟

اسی طرح سورج، چاند اور ستارے اور درخت اور جانور اور پہاڑ اور آدمیوں
میں سے کثیر اور وہ بھی جن پر عذاب متعیّن ہو گیا ہے اور جس کو اللہ ہی
ذلیل کرے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

دراصل یہاں پر اللہ انسان کو مخاطب کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ سب جاندار اور بے جان اسے جانتے ہیں اور انسانوں میں کچھ کے علاوہ کائنات کی ہر شئے اسے سجدہ کرتی ہے۔ تو یہاں پر ظاہر ہوا کہ ایٹم سے بنی ہر چیز کوئی شعور بھی رکھتی ہے اور انکا عبادت کا کوئی غیر مرئی انداز ہے جو انسان کے شعور سے بالاتر ہے۔ یعنی ایٹم کے اندر موجود گردش اور اس کے اندر موجود قوّتیں کسی نہ کسی طرح کے معیّن افعال میں مشغول ہیں اور ان احکام کی پابند ہیں جو طبعی اور غیر طبعی قوانین کی شکل میں کل کائنات میں کارفرما ہیں یعنی کشش ثقل، ایٹمی قوت اور دوسرے مظاہر اپنے اپنے قوانین کے تحت برسرِ کار ہیں۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اس حقیقی سچائی کو سمجھنے کے لیے ان عوامل پر بھی تحقیق کرے کہ آیا ان غیر مرئی شعوروں کی ماہیت کیا ہو سکتی جو ایٹم (پارٹیکلز) اور کائناتی قوّتوں کے اندر موجود ہیں۔ انسان کا اس راز کو پالینے کا امکان اس لیئے ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ انسان آخر کار یہ دیکھ لے گا، کیونکہ کہا گیا،

" کیا تم دیکھتے نہیں "!

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت سے انسان سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اسکی وجہ ہم آگے جاننے کی کوشش کرتے ہیں

باب ۱۲

دہریت کی سائنسی تشریح

انسان خدا کا انکار کیوں کرتا ہے؟

اس کی ٹھوس وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

کبھی آپنے غور کیا کہ خدا سے پہلے جو چیز جاننے کی ہے وہ یہ کہ یہ سوال ہی کیوں اٹھا کہ خدا کوئی ہستی ہے؟ انسان یہ کیوں سوچتا ہے کہ کوئی خدا بھی ہونا چاہیئے؟ چلیں اس سوال کو چھوڑ کر ایک اور بات پر غور کرتے ہیں کہ ہمارا سوچنا ہی تو ہم کو خدا اور خالق کے سوال تک لے جاتا ہے مگر ہم سوچتے ہی کیوں ہیں؟ اس سوال کا مناسب جواب بھی کسی کے پاس نہیں۔ ہمارا علم یہ بتا سکتا ہے کہ ہم کیسے یا کس سسٹم کے تحت سوچتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ انسان کیوں سوچتا ہے یا اس جاندار نے سوچنا ہی کیوں شروع کیا۔ تو مختصراً بات یہیں پر آ کر رکے گی کہ انسان کیونکہ سوچ رہا ہے لہٰذا سوچتا ہے اور بس! یہی ہمارا شعور کہلاتا ہے۔ لیکن تجسّس ہی انسان کو خالق تک لے گیا جس کا اقرار اور انکار ہوتا ہے۔ تو تجسّس کیا ہے؟ ایک خیال!

کیا اپنے خیال، سوچ و تفکر کے تئیں انسان خدا کو جان سکتا ہے؟

انسان نے سب سے زیادہ خدا کی پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کی کہ خدا کیا ہے، لیکن آج تک بوجھ نہ سکا۔ اس کے دو ہی مطلب نکل سکتے ہیں، ایک یہ کہ یہ بحث ہی لا حاصل ہے کیونکہ خدا ہوگا ہی نہیں، دوسرا یہ کہ اگر خدا ہے تو اتنے پردوں میں ہے کہ اس کو جاننا مشکل ہے۔ پہلی بات کی تردید میں وجود کے بارے میں کیوں در کیوں کے اتنے سوال ہیں کہ ہر اسکالر بے بس ہو جاتا ہے۔ اگر دوسری بات درست ہے تو پھر انسانوں کی عظیم اکثریت کیوں خدا پر یقین رکھتی ہے؟

اتنی بڑی تعداد میں انسانوں کے ذہن میں خدا کا تصوّر ہے ہی کیوں؟

کیا اس کی کوئی سائنسی تشریح ہے؟

لیکن ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ ایک عظیم خالق جو ہر طرح کی تخلیق اور ہر طرح کی سائنس پر قادر ہو وہ

انسان کو اپنے بارے میں بھٹکتا چھوڑ دے گویا انسان کسی نہ کسی طور اسکو طبعی بنیادوں پر بھی پہچان سکتا ہوگا۔ کیا اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے؟

خدا کو جاننے میں تو انسان اب تک بے بس ہی رہا ہے اس لیئے کیوں نہ اس سوال کو نظر انداز کر کے ہم ایک دوسرے نسبتاً آسان سوال کا جواب نہ تلاش کریں وہ یہ کہ:

کیا ہم علمی یا سائنسی طور پر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم خدا کو کیوں نہیں جان سکتے؟

یہ متبادل سوال ہے جس کا مناسب عقلی، علمی اور منطقی جواب مل جاتا ہے تو ہمارے تجسس کو کچھ تسکین مل جائے گی۔ گویا اب ہمارا سوال کہ خدا کیا ہے یا اس کو کس نے بنایا کہ بجائے یہ ہوا کہ ہم خدا کو کیوں نہیں سمجھ سکتے؟ اس سوال کا مناسب علمی اور منطقی جواب ہمیں خدا، کائنات، زندگی اور انسان کا صحیح فہم understanding دے سکتا ہے اور خدا کے بارے میں تشکیک کا عنصر بھی ختم ہو سکتا ہے۔ آیئے اس کا جواب تلاش کرتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ کچھ سوالات جب کیوں پر آ کر اٹکے تو ہمارا علم بھی وہیں تھم گیا۔ یہ ابھرتے سوالات ایک معقول جواز رکھنے کے باوجود سائنسی طور پر لاینحل ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ سوال ہی کیوں کرتے ہیں کہ کائنات کیوں بنی، انسان کیوں بنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات انسان کے شعور اور ذہن میں کس قانون کے تحت آئے جن کے جواب ندارد ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جوابات ہوں لیکن ہمیں انکا علم نہ ہو! گویا ہمیں اپنی کاوش کی ابتدا بالکل بنیاد سے کرنی ہوگی یعنی پہلے زندگی اور پھر خیال کی اساس کی چھان بین کرنی ہوگی۔

مادّے میں زندگی کیوں آجاتی ہے اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں لیکن مذہب اس کا سبب روح کو بتاتا ہے۔ اس کو مختصراً یوں سمجھ لیں کہ روح جسم کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ بیرونی ماحول سے منسلک لوازمات سے روح کی عطا کردہ زندگی کو برقرار رکھے جیسے انسان آکسیجن اور غذا حاصل کرتا ہے۔ ہمارا یہ تاثر یا ادراک کہ ہم سوچ رہے ہیں ہمارے شعور کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ شعور ہی ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ہم سوچ رہے ہیں۔ گویا ہمارے افکار اور خیالات کا ادراک ہمارے شعور کی وجہ سے ہے۔ یہاں ہمارے لیئے یہ جاننا منطقی ہے کہ:

ہمارا شعوری ادراک کس طبعی واسطے سے ہم سے رابطے میں رہتا ہے؟

اس کا سادہ سا جواب یہی ہے کہ یہ ہمارا دماغ ہی ہے جو بظاہر تمام خیالات اور شعور کا منبع ہے۔ اب

یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی چیز کی کارکردگی کا انحصار اسکی ساخت کی ماہیت پر ہوتا ہے جیسے لکڑی کی بنی سائیکل اور لوہے کی بنی سائیکل کی کارکردگی کا فرق۔ گویا انسانی شعور کی وسعت دماغ کی ساخت کی ماہیت پر منحصر ہوگی گویا دماغ کا ساختی بُو ہر شعور کی کارکردگی کی حدودِ کار کی تشریح کرے گا۔ انسانی دماغ کی ساخت خلیاتی ہے یعنی یہ خلیوں سے مل کر بنا ہے اور ہر خلیہ کی ایک سرشت intrinsic ہوتی ہے جو جامد یا متعیّن ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی مرکب یا آمیزے کی جبلّت اسکے بنیادی خلیات کی جبلّتوں کے برخلاف کسی نئی جبلّت پر جامد ہوگی۔ اس کو یوں سمجھیں کہ آکسیجن آگ بھڑکاتی ہے لیکن ہائیڈروجن سے مل کر جب پانی بنتی ہے تو ان دونوں کی سرشت بدل جاتی ہے۔ اسی طرح پانی میں پیدا ہونے والے خلیات سے جنم لینے والی زندگی کا شعور ایک خاص دائرے میں عمل پزیر ہوگا برعکس اس شعور کے جو کسی طرح حرارتی یا نوری light بنیاد رکھتا ہو۔ یہ اہم نکتہ ہے جو کسی حیات کے تخیّلات اور اعمال کے پیرائے ڈیفائن کرتا ہوگا۔ اب ہم انسانی شعور اور خیال کی طرف آتے ہیں۔ انسانی خیال کی بنیاد اس مادّے کے تیئں ہے کہ جس سے دماغ بنا۔ دماغ جیلی کی طرح ایک گودے کا عضو ہے جو ستّر فیصد پانی ہے اسکی ساخت خلیاتی ہے اور اس کے اندر ایک سو بلین نیورون یا اعصاب ہیں جو کھربوں کنکشن کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہاں تک واضح یہی ہوا کہ انسان اپنے دماغ کے بموجب ایک مادّی شعور کا حامل ہے۔

ہمارا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ درخت اور پھول بھی خلیاتی بنیاد رکھتے ہیں مگر کوئی انہونا شعور رکھتے ہیں جس کا ہمیں علم نہیں کیونکہ ہم انکے دماغ کو نہیں ڈھونڈ پائے۔ چھوئی موئی کا درخت جو ہمارے لمس کا شعور رکھتا ہے اور چھونے پر فوری ردِّعمل میں سکڑ جانا انکے شعور کی زندہ مثال ہے۔ سورج مکھی کا پھول اپنا رخ سورج کی طرف رکھتا ہے تو یہ بھی شعوری حرکت ہے۔ ہمیں انکے اندر کسی مرکزی اعصابی عضو یا نظام کا پتہ نہیں لیکن ان کے شعوری طرزِ عمل کے پیچھے کسی ٹیکنیک کا ہونا تو منطقی ہے۔ اسی طرح کوئی حیات خلیے اور توانائی کے مرکّب سے بھی تو ظہور پذیر ہوسکتی ہے تو اسکے اعصاب اور شعور مخفی بھی ہوسکتے ہیں۔ اگر ایٹم میں کوئی محدود شعور ہے بھی تو ہمیں اس کا پتہ نہیں۔ یہاں ہمارا علم فی الوقت رکا ہوا ہے۔ اتنا جان کر ہم بھی یہاں رک جاتے ہیں کیونکہ ہمارے سامنے اب ہماری سوچ ، خیال اور شعور کی طبعی بنیاد آشکارہ ہوگئی ہے کہ انسانی شعور دماغ

کا پروڈکٹ ہے اور دماغ خلیات کا مجموعہ ہے اور اسی سے منسلک ہوئی ہمارے شعور کی حدود کار۔ انسانی شعور میں دانش ہے جو حیوانات اور نباتات میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے انسانی شعور بقیہ معلوم شعوروں سے برتر ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اگر حیات روح سے متعلق ہے تو شعور کی کارکردگی بھی روح کی ماہیت پر منحصر ہوئی گویا روح بھی مختلف پیرائے کی حامل ہوئی۔ اب آتے ہیں جدید علوم کی طرف کیونکہ اس کی مدد سے ہم اپنے مرکزی سوال کا جواب ڈھونڈیں گے۔

کیا انسان کسی طرح کی ذہانت اور شعور کو بنا پایا ہے؟

جواب یہی ہے کہ اپنے جیسا تو نہیں مگر ہاں انسان نے نہ صرف مصنوعی ذہانت تخلیق کر لی ہے بلکہ اپنے جیسا مشینی انسان بھی بنا لیا ہے۔ انسانی روبوٹ مصنوعی ذہانت رکھتے ہیں اور انسان کے مقرر کردہ پیرائے میں عمل کرتے ہیں۔ انسانی ہیئت کے روبوٹ جنہیں humanoid-robot کہا جاتا ہے فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے قریب پہنچ چکے ہیں

کچھ حوالا جات:

1. کچھ مستقبل کے ماہرین یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ اگلے سولہ سال میں روبوٹ انسانی ذہانت کا معیار پا چکے ہونگے اور اسمارٹ انسان کو پیچھے چھوڑ دیں گے کچھ کا خیال ہے 2100 تک (ایسا ہو جائے گا)، کچھ بھی ہو یہ نزدیک ہے۔ (خلاصہ)

http://www.livescience.com/29379-intelligent-robots-will-overtake-humans.html

2. آئی بی ایم نے ڈاک کے ٹکٹ کے برابر ایک سپر چپ بنائی ہے جو انسانی دماغ کی طرح سوچ سکتی ہے۔ اس میں 5.4 بلین ٹرانسسٹر کنکشن ہیں جو انسانی دماغ کے ایک ملین نیورون اور 256 ملین نیورل کنکشن کے برابر کارکردگی کے حامل ہیں۔ یہ نہ صرف انسانی دماغ کی کارکردگی کی نقل کرتا ہے بلکہ انکو آپس میں ٹائلز کی طرح جوڑا بھی جا سکتا ہے۔ (خلاصہ)

This Computer Chip Can Think Like a Human Brain

(http://www.livescience.com/47240-ibm-computer-chip-simulates-brain.html)

3. ----

---مشینیں جو جو محسوس کر سکتی ہیں، استدلال اور فیصلہ کر سکتی ہیں، بڑے پیمانے کے مسائل کے حل میں تیزی لائیں گی۔

https://www.intel.com/content/www/us/en/analytics/artificial-intelligence/overview.html

ان معلومات کے تذکرے سے جو بات اخذ کرنی تھی وہ یہ کہ غیر معمولی شعور کا مالک انسان اس

دور میں علیت کے ارفع مقام پر پہنچ کر خود بھی ایک طرح کی مصنوعی زندگی کا خالق بنتا جارہا ہے۔
لیکن جو سوال سامنے آرہا ہے اس کا جواب وہ ہمارے مخمصوں کو ختم کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ:
کیا جدید اور ذہین ترین سپر روبوٹ جو مصنوعی ذہانت کا حامل ہوگا اور محدود شعور سے فیصلہ کرنے کے قابل بھی ہوگا کیا اپنے خالق کو جان پائے گا کہ انسان کیا ہے؟ اسکا سادہ سا جواب یہی ہوگا کہ وہ انسان کے بارے میں اتنا ہی جان پائے گا کہ جتنی معلومات انسان اسکے پروگرام میں مہیّا کریگا۔ اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا انسان روبوٹ کو ایسا "شعور" سوفٹویئر پروگرام کے ذریعے ٹرانسفر کرسکتا ہے کہ وہ انسان کو ہو بہو جان سکے؟
یہاں پر کامن سینس سے ہی غور کیا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب جاننے کے لیئے ہم سپر روبوٹ کی برین چپ کی طبعی "جبلّت" کی طرف آتے ہیں جسکی ساخت میں دھات اہم عنصر ہے جبکہ اسکا خالق انسان سیل یا خَلیات سے بنا ہے جس کی وجہ سے دونوں کی وجودی جبلّت میں تضاد diverse-intrinsic ہے۔ اب اس تضاد کے باعث انسان اپنے متعلق لاکھ ڈیٹا سوفٹویئر یا پروگرام میں ڈال دے وہ ڈیٹا حسابی تشریح تو ہوگا لیکن کسی طرح بھی خلیاتی جبلّت کا کوئی عکس یا پیرایہ نہیں ہوسکتا کیونکہ سُپر روبوٹ یا سپر کمپیوٹر اپنے "دھاتی شعور" کی محدودیت میں ہی اس کا تجزیہ کرے گا۔ سپر ذہین روبوٹ کبھی نہیں جان سکتا کہ انسان کا دیکھنا اور سننا کیا ہے یا اسکے پیرائے کیا ہیں کیونکہ اس جانکاری کا انحصار روبوٹ کے " شعور" کی "فطری ساخت" پر ہونا تھا کہ روبوٹ کی مصنوعی فکری سرشت انسان کی سرشت سے کتنی ہم آہنگ ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ انسان اسی وقت روبوٹ کو اپنی ذات کا حقیقی شعور یا ادراک دے سکے گا جب روبوٹ کی ساخت میں کسی طرح خلیاتی منطقی وصف cell-bound-lojic بھی منتقل کردے۔ ہمارا علم اور استدلال اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صرف مذکورہ طریقے سے ہی انسان اپنی ذات کے کسی حصّے کا عکس یا شعور ربوبٹ کے سوفٹویئر پروگرام میں منتقل کر کے اپنی ذات کا ادراک کسی نہ کسی پیرائے میں منتقل کر پائے گا۔ یعنی روبوٹ کی ایسی برین چپ جو دھات اور حیاتیاتی ریشوں کا مرکّب ہو وہی شاید اس کو انسانی وجود کی کوئی طبعی ڈائمنشن سمجھا سکے اسکے بغیر انسان سپر روبوٹ کے لیئے ایک عدد یا الجبرا کی ایکویشن یا پروگرام کی ایک لائن ہی رہے گا۔
کیا انسان کسی دھات اور زندہ خلیے کی اکائی کو مجتمع کرسکتا ہے؟

کیا انسان ان دونوں کو ملا کر ایک نئی جبلّت تخلیق کر سکے گا؟

جواب یہی ہوگا کہ شاید ہاں! کیونکہ اس ضمن میں تحقیقات اور تجربات جاری ہیں۔

اب ایک اہم سوال اٹھتا ہے کہ انسان میں خدا کا تجسّس کیوں ہے؟

پہلی بات تو یہ طے ہوئی کہ خالق کی مرضی کے بغیر مخلوق اس کو نہیں سمجھ سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو سمجھوانے کے لیئے خالق میں یہ قوت اور صلاحیت ہونی لازمی ہے کہ تخلیق میں اپنی ذات کا شعور یا کوئی عکس منتقل کر سکے یہی ذات کا عکس اپنی کسی جہت میں خالق اور مخلوق میں رابطے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک روبوٹ کو کبھی خود تجسّس نہیں ہوگا کہ اس کو کس نے بنایا لیکن انسان اس سوال میں پریشان اور غلطاں ہے۔ اپنی ذات سے متعلق تجسّس اور سوال انسانی جبلّت میں ڈال دینا ہی کامل خالق کا کام ہے۔ یہی حق تعالیٰ کی عظیم خلاّقی ہے کہ خدا کا خیال خواہ مثبت پیرائے میں ہو یا منفی ہر انسان کے ذہن اور لاشعور میں کلبلاتا ضرور رہتا ہے۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ:

ہم خدا کے بارے میں کیوں سوچتے ہیں؟

دیکھیں جناب، انسانی علوم روح کی سائنس نہیں سمجھ پائے تو اس کا انکار کیا لیکن شعور کو جھٹلانا تو مشکل تھا اسکو مائنڈ mind کہہ کر قبول کیا لیکن اس کی تعریف اور وضاحت کرنی پھر بھی مشکل ہی رہی۔ فلسفی آج بھی مائنڈ۔ باڈی مسئلے mind-body-problem میں اُلجھا ہی ہوا ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ عناصر elements میں روح soul کی آمیزش انہیں حیاتیاتی اکائی living-unit یعنی سیل بناتی ہے۔ اس طرح انسان کی ساخت دو رُخوں پر ہے ایک خالص طبعی یعنی جسم لیکن دوسرا رخ اس سے ماورا اور جدا ہے جیسے ہماری روح، خیالات، شعور اور لاشعور وغیرہ۔ اساس کی یہی جوہری ساخت انسانی دماغ کی تخیّل کی جبلّت یا سرشت کو دو رخا کر دیتی ہے۔ اس طرح خیالات کی بیک وقت دو پیرامیٹرز میں عمل پزیری ہوتی ہے ایک خالص طبعی جبکہ دوسرا ما بعد الطبعی۔ اب سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ انسانی دماغ میں طبعی physical اور غیر طبعی metaphysical ہر دو جبلّت کے حوالے سے دلائل ابھرتے ہیں جس کی وجہ ہم جان چکے ہیں۔ اب کیوں کہ دماغ کا طبعی رُخ اپنی خلیاتی جبلّت کے پرتو اپنے خالق کی ہستی کے پیرائے نہیں جان سکتا لہذا ہمارے طبعی اعصاب اور حواس خُدا کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن دوسری طرف دماغ کا روحی رُخ اپنی کسی انجانی وپر

اسرار جبلّت کے تئیں ہمیں خالق کے حوالے سے مطّلع کرتا رہتا ہے جو خانہ لاشعور میں دستک دیتا رہتا ہے۔گویا ہم خدا کے بارے میں سوچتے ہیں کیونکہ روح کے حوالے سے یہ ایک فطری سوچ ہوتی ہے۔اسی سلسلے میں اہم ترین سوال یہ ابھرتا ہے کہ:

اگر روح ہے بھی تو اس کی جبلّت میں خدا کہاں سے آ گیا؟

یہ ایک مناسب اور مضبوط valid سوال ہے۔اس کا جواب عقل میں نہیں وجدان میں ہے لیکن یہ وجدان طبعی بنیاد بھی رکھتا ہے یعنی ایک کتاب! یہاں قرآن کی اس آیت کا تذکرہ برمحل ہوگا جس میں تمام ارواح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق ہونے کا اعتراف کرایا تھا۔

" کیا میں تمہارا رب نہیں؟ " ــــــــ "ضرور، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں" (قرآن: اعراف: 172)

خالق نے کسی انجانے طریقے سے اپنی ذات کا شعور منتقل کیا تو ارواح نے خالق کو پہچانا اور اللہ کا بطور خالق اقرار کیا۔یہی اقرار انسانی روح کی جبلّت بن کر خیالات کے منبع میں پیوست ہوا اور ایک لازوال غنائی وِجدان کی طرح ہر ذی نفس کے لاشعور میں سرسراتا اور مترنّم رہتا ہے۔یہاں ایک بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ اس نے آدم میں اپنی روح پھونکی اب یہاں عموماً لوگ گمان کرتے ہیں انسان ہی کی طرح اللہ کی بھی کوئی روح ہے لیکن ہم یہاں ایک دوسرے زیادہ منطقی نکتے سے غور کرتے ہیں وہ یہ کہ اللہ انسانی شعور سے بالا لامحدود پیرایوں کی ایک ہستی life-with-infinite-dimensions ہے جس کا کوئی پیرایہ یا گوشہ روح بھی ہے۔ اس طرح ہمارے خالق نے اپنی ذات کا شعور اس پیرائے کے ذریعے انسان میں منتقل کیا اسی بنیاد پر ہم یہاں غور کر رہے ہیں۔اس طرح ہمیں اس سوال کا مناسب اور منطقی جواب بھی مل گیا کہ ہم خدا کے بارے میں کیوں سوچتے ہیں!

ایمان، عقیدہ، مادّیت

اب ایک اہم فیکٹر آتا ہے وہ ہے یقین کا جس میں عقیدے کا اہم کردار ہے۔ ہمارا یقین بھی اپنی ایک بنیاد رکھتا ہے اور اسکا تعلق بھی ہمارے شعور کے دو رخوں سے ہے۔جو انسان صرف فزکس یعنی مادّیت پر ایمان و یقین رکھتا ہے اس کے شعور کا طبعی رُخ بہ نسبت روحی رُخ کے زیادہ فعّال ہوتا ہے اس لیئے وہ کسی خیال کو طبعی شواہد کے تئیں رد اور قبول کرنے کی سرشت رکھتا ہے۔اس کے

مقابل ایک متوازن عقیدہ مادّی اور روحی دونوں رخوں سے ہم آہنگ ہوگا۔
اب ایک قدم آگے بڑھتے ہیں کہ:
انسان خدا کو کیوں نہیں سمجھ پاتا؟
اور کیوں جان بھی لیتا ہے؟
اب تک کی بحث سے ہمیں یہ جواب ملا کہ ہم خدا کو اس لیئے نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا خلیاتی شعور cell-bound-consciouness بظاہر لامحدود پرواز رکھنے کے باوجود عدم کے پیرامیٹر سے "نیم ہم آہنگ" partly-compatible ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ فی الوقت انسان کی طبعی ساخت کے بجائے اسکی مابعدالطبعی ساخت یا روح اپنی آفرینش کی بنیاد یعنی عدم سے ہم آہنگ ہے اس لیئے جو انسان اس رخ کو قبول کرتا ہے اس کا شعور اُس طرف کھنچتا ہے اور وہ خدا کو مان اور جان لیتا ہے اور جو صرف طبعی پیمانوں اور شواہد میں کائنات اور انسان کا جواز تلاش کرتا ہے وہ خدا کو نہیں جان پاتا اور مخمصوں اور فلسفوں میں اُلجھ کر منکر بنا رہتا ہے۔ اب دیکھیئے کہ ایک منکرِ خدا سائنسداں یا اسکالر کسی بھی انسان کو محض ایک طبعی جسم سمجھتا ہے مگر اس میں حیات کی توجیہہ نہیں دے پاتا جبکہ جو خدا کو مانتا ہے وہ روح کو بھی مانتا ہے اور حیات کی بنیاد بھی روح کو مانتا ہے اس کا یہ بھی عقیدہ ہوگا کہ اس کی روح کا خالق سے کوئی خصوصی تعلّق ہے۔ اس طرح اول الذکر روحی سگنلز کو نظرانداز اور مسترد کر کے خدا کا منکر تو بن جاتا ہے لیکن کائنات کے بے شمار سوالات کے جواب کے بارے میں مستقل مخمصوں میں گرفتار رہتا ہے جبکہ اس کے برخلاف مذہب پر ایمان رکھنے والا انہی روحی اشارات کو قبول کرتا اور اس راہ پر بڑھ کر ایک متوازن فطری دورُخی سوچ کا حامل ہو جاتا ہے جس میں اس کو ہر سوال کا منطقی جواب ملتا ہے۔ گویا مذہب انسان کو اس کے دونوں رخوں سے متعارف کرا کے ایک مطمئن شعور عطا کرتا ہے۔ دوسری طرف دہریت صرف مادّی نظریات کی پروردہ ہوکر انسان کو بھٹکائے رکھتی ہے اور انسان مابعدالطبعیات سے متعلق سوالات کے جواب کے بارے میں مخمصوں میں ہی اُلجھا رہتا ہے نئے نئے مفروضے hypothesis بناتا توڑتا رہتا ہے لیکن پھر بھی آج کل کے جدید لادینی فلسفے اور سائنسی نظریات یہ اقرار کرتے ہیں کہ حیات، انسان کی ابتدا، اس کا شعور اور خیالات thoughts راز mysteries ہیں۔

فلسفے، نظریات اور ازم

روح کو کُلّی مسترد کرنے والے اپنی وجود کی روحی سمت کا دروازہ بہت سختی سے بند کر کے ایک شعوری قفل mind-lock لگا دیتے ہیں جس کے نتیجے میں مادیت پرست ہو کر ملحد بن جاتے ہیں جبکہ کچھ ایسے اصحاب بھی ہیں جو اس غنائی وِجدان کی سرسراہٹ سے کبھی کبھی بے خود بھی ہو جاتے ہیں اس لیئے خدا کا انکار بھی نہیں کر پاتے۔ یہ لوگ ہر چیز کا جواز اور منطق ڈھونڈتے ہوئے طبعیات اور مادّیت کے خوگر تو ہو جاتے ہیں لیکن اندر روح کی طرف سے آنیوالے فطری اشاروں کو بھی نظر انداز نہیں کر پاتے۔ ایسے انسانی گروہ اس مخمصے کی صورتحال میں ایک درمیانہ راستہ نکال کر اپنے آپ کو اس طرح مطمئن کر لیتے ہیں کہ مذہب اور خدا کو ذاتی مسئلہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن مغرب میں خدا کو نظر انداز کرتے ہوئے جدید نظریات کی ترویج بھی حقیقت ہے۔ اس سلسلے میں اب ہمارا یہ جاننا ضروری ہے کہ ترقّی یافتہ دنیا میں انسان کی سوچ اور جدیدیت پر مبنی مستعمل نظریات کی بنیاد کیا ہے کیونکہ اتنی کثیر تعداد میں انسانوں کا کسی نظریئے کو اپنانا بذات خود اس کی فعّالیت اور عملیت کی دلیل تو ہے۔ لہٰذا مغرب میں مقبول معاشرتی فلسفے کی چھان بین ہماری مجبوری ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن اس کے لیئے ہم اپنے ایک بنیادی اور اہم سوال کی طرف پلٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سوال میں کون ہوں؟ کا جواب جدید مغرب کے پاس کیا ہے۔

باب ۱۳

کیونکہ میں سوچتا ہوں، لہٰذا میں ہوں

مغربی فلسفے کا سائنسی اور عقلی تجزیہ

حقیقت تو یہی ہے کہ بنیادی سوال، میں کون ہوں، کا کوئی معقول اور مستند جواب کسی بھی منکر خدا کے پاس نہیں لیکن اپنی انا کو جواز دینے کے لیئے فلسفیوں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی بہت کوششیں کیں اور آخر کار ایک فلسفے نے ان کی مصیبت کو ٹالا اور یہی فلسفہ اس وقت جدید مغرب کے نظریۂ حیات کی بنیاد ہے جس نے خدا کو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا۔

فلاسفر ڈیکارٹ کہتا ہے کہ:

I think therefore I am.

میں سوچتا ہوں لہٰذا میں ہوں۔

یہ ایک گہرا اور ہمہ گیر فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کی گہرائی کو سمجھنا ضروری ہے۔

آیئے اسے سمجھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

اس فلسفے کی بنیاد یا محور انسان کی ذات ہے۔ اس فلسفے نے پہلے انسان کو اطراف سے بیگانہ کر کے اس کو اپنی ذات کے اندر اتارا یعنی فطرت و کائنات کو صفر کیا اور انسان کو ایک سوچتا ذی نفس قرار دیا۔ اس نظریئے نے انسان کو بنیادی طور پر صرف اسکی اپنی ذات کا بہت قوی اور مستحکم شعور دیا جس کے بموجب انسان نے اپنے آپ کو عاقل ترین اور کائنات کا محور قرار دیا۔ اس آگہی کے حصول کے بعد انسان کی بقاء survival کے لیئے منطقی طور پر اس فلسفے کی کوکھ سے عملیت کا درس نکلا جس نے اطراف اور کائنات کو عقل اور شعور سے سمجھنے اور برتنے کا عزم دیا۔ اس طرح انسان اپنی فلاح اور آسائش کی خاطر خدا سے لاتعلق ہو کر ریسرچ اور علوم کے حصول میں غرق ہو گیا اور ہر قدم پر اسی فلسفے کی بنیاد پر پرانے عقائد، روایات اور رسومات کو عقل اور شعور کے تناظر میں روندتا آگے بڑھنا شروع ہوا۔

اس فلسفے کا بنیادی نکتہ، میری ذات اور میری سوچ ہے۔
اس طرزِ فکر میں انسان کا بنیادی سوال کہ، "میں کون ہوں" اس طرح حل کر دیا گیا کہ میں وہ ہوں جو سوچتا ہے۔ اب آگے کے مرحلے شعور اور تجربات سے کائنات کو سمجھنا ہیں اور بس یعنی ریسرچ اور حصولِ علم۔ اس طرح اس فلسفے نے جدید انسان اور فلسفی کو اپنے دائرے میں کھینچ کر مقید کر لیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ہم کو بھی اسی عفریت کا سامنا ہے جو آج نہیں تو کل یہاں کھل کر وارد ہوگا۔ یہ ہمارے درمیان آہستگی سے آ کر نوجوان ذہنوں کو مسموم کر رہا ہے لہٰذا اس فلسفے کی عقلی اور سائنسی بنیاد پر مضبوطی کا جائزہ ہمارے لیئے بہت اہم ہے تاکہ اس کی کمزوریوں کو طشت از بام کیا جا سکے۔ یہ فلسفہ جدیدیت کا بیج ہے جس میں اسکا درخت اور پھل چھپے ہیں۔ اس بیج کی تفصیلی جانکاری ہی بتائے گی کہ یہ کتنا سائنسی اور منطقی ہے۔ ہم اس فلسفے کو پرکھنے کی کاوش سائنس اور سادہ استدلال سے کریں گے۔ اس جائزے میں ہم بھی خدا کو اپنی بحث سے الگ کر کے اسی فلسفے اور سائنس کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے تاکہ دقیانوسیت یا غیر سائنسی اُسلوب کا کوئی الزام ہمارے سر نہ پڑے۔

فلسفے کی پرکھ

اس فلسفے کی فکری ساخت میں انسان اور اسکی سوچ ایک اکائی کی حیثیت سے ہیں گویا انسان میں سوچ ہے اور سوچ سے انسان۔ اس کی علمی اور منطقی قوّت کی جانچ کے لیئے ہمیں سوچ کی ماہیت جاننی ہے اور یہاں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا علم اس بارے میں کیا کہتا ہے کہ میں کیسے سوچتا ہوں یعنی میرے خیالات کیسے آتے ہیں۔ خیالات میرے وجود کا حصہ ہیں یا کوئی اجنبی چیز ہے جو مجھ میں در آتی ہے۔ خیالات کی آمد ہر جاگتے انسان کی جبلّت ہے لہٰذا یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خیالات کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔ فلسفہ بھی ایک خیال ہوتا ہے جو دماغ میں پیدا ہوتا ہے جس کا ہمیں اپنے شعور کے تئیں ادراک ہوتا ہے۔ سائنسی طور پر سوچ کا تعلق دماغ سے ہے مگر ابھی تک جدید علوم بھی خیالات کے اجراء کے حوالے سے دماغ کی کارکردگی کی ماہیت جاننے میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ دماغ پر جدید تحقیقات یہ واضح کرتی ہیں کہ ہم ابھی دماغ اور اس کی کارکردگی کی اصلیت سمجھنے کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔ اس کے علاوہ فلاسفر جدید ترین علمی پیشرفت کے حوالے سے بھی ابھی تک یقینیت کے ساتھ یہی نہیں جان پائے ہیں کہ شعور آیا دماغ کی طبعی ساخت سے مکمل منسلک ہے یا کچھ اور بھی۔

References:

https://www.mindscience.org/index.php/research

http://content.time.com/time/magazine/article/0,9171,1580394,00.html

https://blogs.scientificamerican.com/cross-check/world
-s-smartest-physicist-thinks-science-can-t-crack-consciousne

سائنس دماغ میں کیمیائی عمل کا مشاہدہ کر کے بتاتی ہے کہ سوچ دماغ کے اندر ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے خیالات دماغ میں موجود نیورون میں کیمیکل ری ایکشن کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔اس سے یہ بات تو ثابت ہوئی کہ ہماری سوچ ایک کیمیائی بنیاد رکھنے والی شئے product ہے۔ان کیمیکل عوامل کا کوئی منبع orignator ہونا تو سو فیصد یقینی بات ہے۔لیکن اگر خیالات انسان کے اندر سے اٹھتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ مستقبل کے بے حساب خیالات اور سوچ کا کیا کوئی ویئر ہاؤس ہے؟ اگر ہے تو کہاں؟ ہمارے علم کے مطابق تو یاداشت میں ماضی کی فائلیں ہوتی ہیں مستقبل کی نہیں۔انسانی دماغ میں ایسا کوئی خانہ سائنس دریافت نہیں کر سکی جہاں پر مستقبل کے خیالات منجمد یا محفوظ ہوں تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ضرور کوئی خارجی عامل ہے جو انسان کے دماغ میں سرائیت کرتا ہے جس سے خیالات اور سوچ پیدا ہوتی ہے۔ یہ بیرونی عامل ہمارے حواس کی وساطت سے ہر طرح کے خیالات لاتا ہے یعنی ہمارا دیکھنا اور سننا وغیرہ بنیادی طور پر ہمارے اندر خیالات کی تحریک کا منبع ہیں جس کی تصدیق عقل کرتی ہے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بات ہمارے مذکورہ فلسفے سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس فلسفے میں فلسفی سوچ کو انسان کی ذات کا حصّہ کہتا ہے۔ ایک خارجی چیز ذات کا حصّہ کیسے ہو سکتی ہے؟ دیکھیئے جناب انسان آکسیجن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جسے انسان ہر لحہ باہر سے حاصل کرتا ہے تو کیا آکسیجن جو ہمیں زندہ رکھتی ہے ہماری ذات کا حصّہ ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ گویا جس طرح آکسیجن انسانی زندگی کا جاری رکھتے ہوئے بھی انسانی ذات کا حصّہ نہیں ہے اسی طرح سوچ کو پیدا کرنے والے عوامل انسانی ذات کا حصّہ نہیں بلکہ سوچ جو باہر سے کسی عنصر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ درحقیقت ایک اجنبی چیز ہوتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار کے بموجب اپناتا یا رد کرتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت خام یا ابتدائی خیال انسان کی ملکیت نہیں اِلاّ یہ کہ انسان اسکو قبول کر کے اپنا لے۔اگر ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ سوچ داخلی نہیں بلکہ خارجی عامل ہے تو اس فلسفے کی بنیاد کا غیر منطقی ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔اس

کے لیئے دیکھنا ہوگا کہ خیال کے پیدا ہونے کے خارجی ذرائع کیا ہو سکتے ہیں۔

انسان سے باہر ایسا کیا ہے جو سوچ پیدا کرتا ہو؟

اب آیئے انسانی حواس پر، یہ وہ بیرونی معلومات وصول کرنے والے واسطے Receptors ہیں کہ جن کی بنا پر معلومات دماغ تک پہنچتی ہیں۔ اگر حواس معطّل ہو جائیں تو دماغ کی سوچنے کی صلاحیّت ساکت ہو جانی چاہیئے لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حواس معلومات دینی بند کر دیں پھر بھی انسان سوچتا ہے۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ فعّال حواس خمسہ کے واسطے سے حاصل معلومات انسان کو فوری سوچ اور ردعمل دینے پر مجبور کرتی ہیں۔ مفلوج حواس کی صورت میں جس میں آنکھ، کان ،ناک، زبان اور لمس کو ارادتاً معطّل کر دیا جائے دماغ اور اعصاب کا کام کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی اور بیرونی عنصر بھی ہو سکتا ہے جو دماغ یا قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب یہاں پر کسی بیرونی اور فی الوقت نا قابل پہچان untraceable عامل کی تلاش بھی ضروری ہوگی۔

میں سوچتا ہی کیوں ہوں؟ کیا سائنس کے پاس اسکا جواب ہے؟

اگر سائنس کے پاس" میں کیوں سوچتا ہوں " کا جواب نہیں تو سوال یہ بھی ہے کہ لفظ کیوں آخر انسان کے ذہن میں کس کیمیکل ایکشن سے آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کیونکہ سوچ یا خیال خارج سے وارد ہوتے ہیں تو کیوں کے جواب بھی کہیں خارج میں ہی ہوں؟ دیکھیئے جناب میری سوچ تو میری نہیں کیونکہ یہ تو کسی نامعلوم کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے جس کے منبع origin کا مجھے علم ہی نہیں تو میں کیسے یقین کروں کہ یہ میں جو سوچ رہا ہوں وہ میری ملکیت property ہے؟ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا خیال ہے لیکن یہ مدِ نظر رہے کہ حقیقتاً یہ کسی کے اشتراک سے ممکن ہوا۔

یہاں سائنسی علوم کو بہ حیثیت مجموعی ایک آفاقی اکائی سمجھ کر ہی کوئی فیصلہ سائنسی ہوگا۔ سائنس کے مطابق انسان ایٹم سے بنا اور ارتقاء کی منازل طے کر کے یہاں پہنچا۔ ہم نیچرل سلیکشن کی جادوئی کرامات یعنی "ہر جاندار خود کو خود ہی ماحول کے مطابق بہتر کر رہا ہے" کو بھی سائنسی ہی مان لیتے ہیں، لیکن اگر کھرب ہا کھرب انسانوں کے دماغ میں اچھائی اور برائی کا ایک تصوّر صدیوں سے منتقل ہو رہا ہے تو یہاں "میں" نہیں بلکہ "ہم" ہوئے یعنی آفاقیت۔ یہاں 'میں' me سے پہلے تو we 'ہم' ہے کیونکہ سب کسی نظم کے تحت یکساں سوچ رہے ہیں۔ اگر ایک انسان کہیں پر

اپنے خیال کے بموجب جھوٹ یا قتل کو برا کہتا ہے تو افریقہ اور امریکہ بلکہ ساری دنیا کا انسان بھی یہی سمجھتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہمیشہ سے ہورہا ہے تو پھر میں اپنی ذات میں نہیں سوچتا بلکہ انسان کسی نامعلوم کلیّت totality میں بھی سوچتا ہے۔ گویا انسانیت انسانوں کی مربوط سوچ کا نام ہے جس میں انسان ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح جُڑے ہیں۔ یہ سوال سائنسدانوں سے جواب مانگتا ہے کہ خیالات آفاقی نوعیّت کے کیوں ہوتے ہیں۔ ہر جدا انسان اپنی جینز میں صدیوں کے اخلاقیات کے یکساں تجربات کا بوجھ لیکر کیوں رواں دواں ہے؟ اس سے یہی منطقی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات اسکے اندر نہیں بلکہ کہیں باہر سے کسی نظم کے تحت ابھرتے ہیں تبھی آفاقی ہوتے ہیں۔ اب ادھر غور کریں تو " کیونکہ میں سوچتا ہوں لہٰذا میں ہوں " کے فلسفے کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان کی سوچ اس کی ذات کا حصہ ہے جبکہ طبعی حقائق اسکی تصدیق نہیں کررہے۔ مذکورہ جدیدیت کے فلسفے کی بنیاد انسان کے اندر کے بجائے خارج یعنی انسان کے جسم سے باہر ہونی ہی قرین قیاس بلکہ منطقی ہے۔ اس طرح علمی بنیاد پر تو یہ فلسفہ ہوا میں معلّق ہوا۔

ایک مفروضہ

خارج سے سوچ کی آمد کے کسی ممکنہ طبعی جواز پر اگر غور کریں تو ہمیں ایک دوسرے نظریئے سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔ دیکھیئے سائنسدانوں نے ایٹم کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا یہاں تک کہ ایٹمی ہتھیار بھی بنالیئے لیکن ایک معمّہ یہ ہمیشہ رہا کہ ایٹم جو نظر نہیں آتا اس میں ماس یا کمیّت کہاں سے آتی ہے۔ اس پر سائنسدان غور کرتے اور مفروضات پیش کرتے رہے۔ ان میں ایک مفروضہ بڑا منطقی تھا کہ کائنات کسی پارٹیکل یا فیلڈ سے بھری ہوسکتی ہے کہ جس سے مَس ہوکر ایٹم کمیت حاصل کرتا ہو۔ اب حال ہی میں اس کی سائنسی تصدیق ہوئی ہے اور اس فیلڈ کو ہگز فیلڈ یا ہگز بوزون کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح ایٹم میں کمیّت کا خارج سے آنا اب ثابت ہوا۔ ہمارا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کہ خیالات کا پیدا ہونا تو دماغ میں ثابت ہے لیکن یہ کسی خارجی عامل سے کیسے ہوگا یہ ایک پہیلی ہے۔ میرے خیال میں ہمارے اطراف فضا بلکہ کائنات میں کوئی غیر مرئی عنصر موجود ہے جس میں ایسی خصوصیت ہے کہ وہ ہر دماغ سے مَس ہوا رہتا ہے اور اسکی وجہ سے انسان اور حیوان ہمہ وقت ایک غیر مرئی خام لہر سے استفادہ حاصل کرتے ہیں جو مختلف عوامل کے تئیں دماغ میں کیمیائی عمل کو مہمیز دیتی ہے جس سے حالات کے مطابق کسی پوشیدہ نظام کی وجہ سے خیالات کا تانتا

بندھا رہتا ہے۔ گویا دماغ میں خیالات کسی خام شکل میں وارد ہوتے ہیں جو کیمیائی عمل کے بعد ایک سوچ کا روپ دھار کر ذہن کے پردے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے مذکورہ ہگز فیلڈ کا یہ بھی کوئی وصف ہو یا اس جیسی کوئی اور فیلڈ! گویا جب انسان سوچ رہا ہوتا ہے یا کوئی خیال اسکے ذہن میں وارد ہوتا ہے تو دراصل وہ کسی نامعلوم بیرونی پہل پر ردِعمل دے رہا ہوتا ہے۔ سوچنا بھی ایک کیمیائی ردِعمل ہے۔ گویا ہمارے ذہن میں اُٹھنے والا خیال اپنی ساخت میں ایک حسابی ترتیب سے آتا ہے تبھی تو کیمیائی فارمولے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ تمام اخلاقی معیار کیونکہ آفاقی ہوتے ہیں لہٰذا ہر ذہن میں انکی آمد یا قیام انسان کی اپنی ذات کا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ذہن میں موجود ضمیر میں پیوست ہوتا ہے جو کسی آفاقی نظم کا حصہ ہے۔

فلسفے کی جبلّت

اب پھر اس فلسفے کی طرف آتے ہیں جس کی بنیاد میں ایک سقم سامنے آیا ہے کہ یہ انسان کی سوچ کے خارج سے تعلق کو ابتدائی مرحلے میں مسترد کرتا ہے جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے لہٰذا جبلی طور پر اس فلسفے کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے تمام معاشرے انسان کو کسی اصل خارجی حقیقت روشناس کرانے کی صلاحیت سے عاری ہونگے۔ اس فلسفے کی جبلّت انسان کی ذات اور کائنات ہے لہٰذا یہ انہی کے اطراف گردش کرتا سیارہ ہے اور رہے گا۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا تھا کہ یہ ایک بیج ہے اور بیج کے پھل صرف اور صرف اسکی ہی سرشت لیئے ہوتے ہیں۔

اب ہم خود ہی اس پر بات کرتے ہیں کہ جدید فلاسفر کیوں حقیقت آشنائی کے اچھے موصل Good-Conductor نہیں ہیں۔

فکر کی جبلّت

تخلیق کے مدارج میں انسان ایک ترقی یافتہ خلیاتی جاندار ہے۔ اسکے شعور اور خیالات سب ہی خلوی cellular بنیاد پر نمو پذیر ہوتے ہیں۔ انکی ایک خلیاتی جبلّت یا سرشت ہے جو اٹل ہے اور اپنی خصوصیات اور حدود کار میں بھی خلیاتی شعور کے تئیں ہی "لامحدود" ہے جبکہ حقیقتاً محدود ہے کیونکہ اسی شعور کے مطابق کائنات میں صرف ایٹم ہی نہیں توانائیاں بھی ہیں اور اس خلوی ساختہ شعور کی حد سے باہر اگر کچھ ہے تو ہمیں اس کے متعلق نہیں معلوم مثلاً توانیائی اور تنویری شعور! مختصراً انسان کا کُل علم وہی ہے جو اسکے خلوی ساختہ دماغ سے ہم آہنگ ہو کر اسکے اندر سما جائے باقی

اس سے ماوراء ہر معلومات اسکے لیئے معدوم ہے۔ فلاسفر، سائنسدان اور تحقیق کرنے والے خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں صرف اور صرف خلیاتی ساختہ شعور کے محدود پیرایوں میں غور کرتے ہوئے کائنات میں شعور کی دیگر اقسام کو نہ صرف نظر انداز بلکہ مسترد کر دیتے ہیں جبکہ حقیقتاً یہ کائناتی حقائق اپنی جگہ بہت سے لاینحل سوالات کے ساتھ موجود رہتے ہیں جنکے جواب انکے پاس نہیں ہوتے لیکن اپنی بقاء اور انا کی تسکین کے لیئے عقل، فلسفے اور مفروضات کی مدد سے اپنے آپ کو یقین کی مصنوعی کیفیت میں رکھنے میں مجبور ہوتے ہیں۔ جدیدیت کا یہ فلسفہ بنیادی طور پر یہی تلقین کرتا ہے کہ انسان اپنی عقل کو لامحدود گردانے ہر وقوعہ کو صرف عقل اور تجربات سے سمجھے اور جو عقل میں نہ آئے اسکو مفروضات کی ڈور سے باندھ کر مستقبل کی ٹوکری میں ڈال کر آگے بڑھ جائے۔ اس فلسفے کی مفرد طبعی و فکری اساس غیر سائنسی اور غیر فطری ہے اسی لیئے مغرب میں بے شمار اخلاقی مسائل کھڑے ہو رہے ہیں اور اخلاقی اقدار و خاندانی نظام میں ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔

اسلامی فلسفہ اور جدید انسان

اب ایک اہم نکتہ توجہ چاہتا ہے۔ اسلام جو دینِ فطرت ہے اور اپنا ایک فلسفۂ حیات رکھتا ہے جس کی بنیاد دماغی سوچ یا کوئی انسانی فلسفہ نہیں بلکہ مادے سے ماوراوحی یا الوہی احکام ہیں۔ یہ انسان کو ایک مقامِ اولیٰ عطا کرتا ہے کہ انسان اپنے خالق کی برتر ترین تخلیق اور زمین پر اپنے خالق کا نائب ہے۔ خالق کی صفات ایک معیّن درجے میں انسان میں ودیعت کی گئیں ہیں تاکہ یہ ایک بااختیار مگر محدودیت میں قید "خالق" بنے۔ اب یہ بھی دیکھیئے کہ اللہ کائنات کو بلاشرکتِ غیرے چلا رہا ہے تو فطری طور پر انسان کے اندر بھی یہ صفت کسی نہ کسی طور پر موجود ہے کہ وہ بھی اپنی سلطنت میں کسی کی عمل داری نہیں چاہتا اور کوشش کرتا ہے کہ خدا کے بغیر اپنی سلطنت کا جواز ڈھونڈ لے۔ کیونکہ انسان مادے کی سرشت لیئے ہوئے ہے اس لیئے اس فطری ذہنی اُپج کے تئیں پہلے کائنات کو صرف مادے کی نظر سے پہچاننے کی کوشش کرتا نئے فلسفے گھڑتا ہے تاکہ کائنات اور زندگی کا جواز خالص عقلی بنیاد پر استوار کرے۔ مغرب کیونکہ ان فلسفوں کے بموجب معاشرہ استوار کر کے مادی ترقی کر رہا ہے اسی لیئے جدید انسان مادی حدود میں ہی انسان اور کائنات کی تشریح کر رہا ہے۔ گو کہ ان فلسفوں سے بے بہا مادی ترقی تو حاصل ہو رہی ہے لیکن انسان پھر بھی اپنے اور کائنات کے وجود کے مخمصے حل نہیں کر پایا۔ وجہ یہی ہے کہ ان سوالات کا جواب مادیت پر مبنی فلسفوں اور علوم میں نہیں

ہے کیونکہ اس فلسفے کی بنیاد غیر منطقی اور نامکمل علم پر ہے۔

فلسفے کے منطقی اثرات

جدیدیت کا فلسفہ انسان ہی کو عقلِ کُل قرار دیتا ہے اسی لیئے اس فلسفے پر ایمان لانے والا انسان منطقی طور پر خبطِ عظمت کا شکار ہو کر خدا کو انسان کا تخلیق کیا ایک تصوّر اور دقیانوسیت سمجھتا ہے۔ اس سوچ کے فطری نتیجے میں جدیدیت کا پیروکار "عقل کے قبض" میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے اس کی فکر میں احساسِ برتری کے منفی ذہنی قفل لگ جاتے ہیں جن کے باعث اپنے سے بہت برتر کسی قوت یعنی خدا کو قبول نہیں کر پاتا۔ جبکہ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید انسان اپنی ننھی منّی عقل سے اپنی اور کائنات کی ابتدا ہی نہیں سمجھ پا رہا تو بھلا خالقِ کائنات کو کیسے جان پائے گا۔ سوچ کو صرف مادّی رخ دینے کے بعد فکر کا قدرتی گردشی قفل لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے (چاند کی طرح جسکا ایک ہی رخ زمین کی طرف رہتا ہے) اس فلسفے کا شکار بھی مادّی فکر سے جان نہیں چھڑا پاتا۔

باب:۱۴

آفاقی علوم کامنبع

کائناتی علم کے حوالے سے یہ مخمصہ جدید فلاسفہ کی جان کو اٹکا ہوا ہے کہ یہ علوم کہاں سے وارد ہورہے ہیں۔مثلاً فلسفی پلاٹو کہتا ہے کہ علم روح میں مدفون آئیڈیاز کو سمجھنا ہے۔
تو پھر ایک اور مشکل سوال کہ یہ روح میں کہاں سے آئے۔
ارتقاء کے حوالے سے کیا یہ سوال فطری نہیں کہ:
علم knowledge کیا ہے؟
اس کا ذخیرہ کہاں ہے؟
ہم تک کیسے آتا ہے؟
علوم کا منبع origin کیا ہے؟
کیا اس کا معقول جواب کسی کے پاس ہے؟
حقیقت یہی ہے کہ اس کا جواب کسی فلسفی اور سائنسدان کے پاس نہیں۔کوئی فلسفہ یا کوئی علم ان سوالات کا حتمی جواب نہیں دے سکتا کیونکہ انسان تو صرف حصول علم کے گرداب میں گھرا اسی کو منزل سمجھتا ہے۔

انسان کی ابتدا اور علم

آئیں ہم مندرجہ بالا سوالات کا جواب ایک مفروضے hypothesis کے تحت حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ایک اُلوہی اشارے کی تشریح اہم ہوگی وہ اشارہ انسان کے ذخیرہ علم یا کتابِ علم کے بارے میں قرآن میں درج ہے۔اس کے لیئے ذرا پیچھے چلتے ہیں یعنی عدم کا خیالی سفر۔جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ قرآن بتاتا ہے کہ خالق کائنات مٹی کا ایک پتلا بنا کر اس میں ایک مخصوص روح ڈالتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ یہ زمین پر میرا نائب ہوگا۔انسان کو فضیلت کی اس عظیم عطا پر باقی مخلوق کی حیرانی دور کرنے کے لیئے پہلے خالق کائنات انسان کو کائنات کا سارا علم عطا کرتا ہے پھر فرشتوں سے آسمان کی چیزوں کے نام پوچھتا ہے تو سب لاعلمی

کا اظہار کرتے ہیں جبکہ آدمؑ ودیعت کردہ علوم کے تیئں کائنات کی ہر چیز کا نام بتا دیتے ہیں۔ اسلام کے مطابق یہی ہے نا ہماری ابتدا؟ اسی ابتدا میں ہمارے سوال کا جواب پنہاں ہوسکتا ہے کیونکہ یہی وہ لمحہ تھا جس میں کائنات کے تمام علوم انسان کو دیئے تو گئے لیکن واپس نہیں لیئے گئے بلکہ کہیں منجمد کردیئے گئے یا پوشیدہ۔ ہمارے مفروضے کے مطابق یہ ذخیرہ علم کُل علوم کا ڈیٹا بینک ہے جسے ہم آدم کی کتاب علم کہیں گے۔ ہمارا تجسّس یہ ہے کہ یہ کہاں ہوسکتی ہے کیا پیرائے اور روپ رکھ سکتی ہے اور کس طرح نسل در نسل منتقل ہوسکتی ہے۔ اس پر جدید علوم کی روشنی میں غور کیا جانا ہی عین منطقی اور عقلی ہے۔ ذرا ایک لمحے کو جدید سائنس کی مرعوبیت سے باہر آ کر اور ذہن کو وسعت دیکر غور کریں کہ وہ یکتا خالق جو ایک انتہائی عظیم الشان سائنس کی حامل کائنات کا خالق ہے کہ جس کے اندر انسان کو نائب کا رتبہ دیا گیا وہ ہر سائنس کا بھی خالق ہے۔ اسی برتر سائنس کے بموجب کائنات کے تمام علوم کا مجموعہ یعنی انکا مکمل ڈیٹا بیس کسی برتر نظم اور پیرائے میں آدم کے ذہن میں منتقل ہوا تو اسی وقت وہ اندر کہیں محفوظ بھی ہوا۔ کائنات کے تمام علوم لیئے آدم علیہ السلام جب صاحب اولاد ہوئے تو یہی علم کا ڈیٹا بذریعے DNA اولاد میں بھی منتقل ہوا۔ اسکے بعد جو ہوا وہ یہی کہ انسان کی ہر اولاد میں یہ ڈیٹا منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہر انسان اپنے اندر دور کہیں یہ سب لیئے ہوتا ہے یعنی ہر انسان کائناتی علوم کا کیریئر ہے۔ اس کا حامل ہر ہر شخص اپنی اپنی ذہنی اُپج اور ٹرینڈ trend کے تیئں اسکے کسی صفحے کو کھول کر پڑھتا ہے۔

علم کا بینک

لیکن سوال یہ ہے کہ ان علوم کا انبار عظیم انسان کے دماغ میں کیسے اور کہاں محفوظ ہوا ہوگا کیا ڈی این اے میں؟ موجودہ علمی پیش رفت اور دریافتوں کی روشنی میں انسانی کی دماغی جین ہی میں اسکا جمع ہونا بالکل منطقی، سائنسی اور عقلی ہے۔ لیکن کیا انسانی جین یا دماغ میں اتنی وسعت ہے کہ ان کائناتی علوم کے عظیم ڈیٹا کو سنبھال سکے؟ کیا یہیں پر علم کا بینک ہے؟ یہی سوال جواب مانگتا ہے جس کو ہم اب تلاش کرتے ہیں۔

ہمیں یاد ہے کہ تیس سال قبل نوے کی دہائی میں ایک بڑی ہارڈ ڈرائیو hard-drive صرف چند ایم بی کا ڈیٹا محفوظ کر پاتی تھی اور بالکل شروع میں تو ایک الماری کے برابر ڈرائیو بھی بنیں تھیں جبکہ اب ایک انگلی برابر ڈرائیو ٹیرا بائٹ اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ نتیجہ یہی نکلا کہ جوں جوں انسان اپنے اندر

محفوظ عدم کے ڈیٹا سے استفادہ حاصل کر رہا ہے یعنی علم حاصل کر رہا ہے ہمارا تخلیق کردہ سوفٹ وئر ڈیٹا اسٹورج سکڑتا جا رہا ہے یہاں تک کہ مائیکرو چپ کے علاوہ لائٹ یعنی روشنی سے چلنے والے ڈیٹا اسٹورج متعارف ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ہماری جین میں کائنات کے علوم کا اسٹور ہونا ہی سائنسی، منطقی اور عقلی استدلال رکھتا ہے۔ لیکن کیا ہمارے پاس اس کی حمایت میں کوئی ٹھوس پیش رفت ہے؟ آئیں دیکھیں کہ جدید دریافتیں ہماری حمایت میں کیا کہتی ہیں۔

(1

انسانی جسم میں ایک سو ٹریلین سیل 100 trilion-cells ہوتے ہیں جبکہ ہر سیل میں ڈیڑھ گیگا بائٹ 1.5GB ڈیٹا اسٹور ہو سکتا ہے، اس طرح انسان کے جسم میں ایک سو ٹریلین ضرب 1.5 کے حاصل کے برابر ڈیٹا اسٹور ہو سکتا ہے جو کہ ایک سو پچاس زیٹا بائٹ 150-zettabites بنتا ہے۔

http://bitesizebio.com/8378/how-much-information-is-stored-in-the-human-genome/

(2

Harvard's Wyss Institute میں حال ہی میں ایک گرام ڈی این اے میں 700 ٹیرا بائٹ ڈیٹا اسٹور کرنے سے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔

https://www.extremetech.com/extreme/134672-harvard-cracks-dna-storage-crams-700-terabytes-of-data-into-a-single-gram

(3

اس سلسلے میں ایک بالکل حالیہ پیش رفت ہمارے استدلال کی مزید تصدیق اور گواہی ہے:

DNA could store all of the world's data in one room.

A new method of storing data in the nucleotide bases of DNA is the highest-density storage scheme ever invented.

تحقیق اور تجربے کے مطابق ڈی این اے پر مشتمل نئی اسٹورج ٹیکنالوجی سے پوری دنیا کا ڈیٹا ایک کمرے کے حجم کے ڈی این اے میں جمع ہو سکتا ہے۔ اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اس کے مطابق آئندہ فیس بک اور امیزون کا عظیم انفارمیشن ڈیٹا صرف چند پک اپ حجم کے ڈی این اے میں سما جائے گا۔

http://www.sciencemag.org/news/2017/03/dna-could-store-all-worlds-data-one-room

سو سال قبل انسان کو جین gene میں اتنی معلومات کے محفوظ ہونے کا پتہ نہیں تھا اور سو سال بعد کیا ہوگا اس کا ہم کو بھی نہیں پتہ۔ ان حوالوں سے ہمارے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ علم اور

معلومات کا منبع origin کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا اس عظیم ڈیٹا بیس کی حفاظت کا سسٹم ایک بہت برتر سائنس کا شاہکار نہیں؟ خالق کی عظیم تر سائنس نے کائنات کا تمام علم انسانی دماغ میں جین میں کہیں محفوظ کر دیا اور بس! اس علم کے بھی دو رخ ہیں ایک ہمارے ذہن میں اور دوسرا طبعی رخ جو اطراف میں بکھرا ہے۔ انسان کا تجسّس غور پر مجبور کرتا ہے تو اس کے اندر کا منجمد علم بے قرار ہو کر عیاں ہونا چاہتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کے علم کا ڈیٹا ویئر ہاؤس ہر انسان لیئے پھر رہا ہے۔ اس کتابِ علم میں کائنات کے تمام علوم مرقوم ہیں اور انسان ورق بہ ورق اسے کھولتا آگے بڑھ رہا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ودیعت کردہ ہر ہر علم کو اپنی عقل سے جان کر اور عیاں کر کے اپنے آپ کو مسجودِ ملائک کے شرف کا حقدار ثابت بھی کر دے گا کیونکہ تخلیق کے وقت عظیم الشان خالق نے انسان کو نیابت کا شرف بخشتے ہوئے فرشتوں کے تجسّس پر فرما دیا تھا کہ:

"جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" ۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ نائب کا مطلب ہم انسان اپنی انتظامی دنیا میں کیا لیتے ہیں؟

یہی کہ سپیریئر superior یا باس boss کی مرضی سے اس کے کرنے کے ہر کام کو ایک حد تک کرنے کی آزادی! دوسرے لفظوں میں اختیار کی محدود منتقلی! کسی بھی انتظامیہ کا بنیادی اصول

authority-can-be-transferred-but-responsibility-cannot-be

یعنی "اختیار منتقل کیا جا سکتا ہے ذمہ داری نہیں"، اسی کتاب کی کوئی لائن ہے تبھی تو اللہ نے انسان کو کائنات میں تصرّف کا اختیار دیا لیکن اس کو چلانے کی ذمہ داری اپنے پاس ہی رکھی۔ مختصراً انسان آدم علیہ السلام کو عطا کیئے گئے علوم کے ساتھ یا دوسرے الفاظ میں ایک غیر مرئی کتابِ علم کے ساتھ زمین پر اتارا گیا ہے۔ کائنات کے سارے علوم انسان کی میراث ہیں اور سب انسان مل کر ہی اس کے ہر ہر اسرار کو سمجھیں گے۔ یہی ہو بھی رہا ہے کہ ہر انسان ایک مختلف سرشت کے ساتھ علم کے سمندر میں اپنی کشتی کھیتا رہتا ہے اور کسی ایک یا معدودے چند ہی شعبوں میں سر کھپاتے علم کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر کچھ موتی نکال لاتا ہے۔ انسان جب کسی طبعی مظہر کی جانچ شروع کرتا ہے تو اُس بیرونی تحریک پر اپنے اندر موجود اس کمپریسڈ compressed یا بھنچے ہوئے ڈیٹا میں فکر کے توسّط سے کھدائی یا تلاش کرتا ہے اور اسکی یہ کاوش کسی پوشیدہ اصول، قانون یا علم سے روشناس کرا دیتی ہے یا انسان اسے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ یہی جانکاری اور دریافت ہماری سائنس بنتی ہے۔

اسی طرح یہ سفر جاری رہے گا یہاں تک کہ انسان تمام علوم حاصل کر کے خالق کے نائب ہونے کا عملی practical اظہار بھی کر گزرے! کون جانے کب؟

ہماری محدود عقل تو اب تک یہی سمجھ پائی کہ آدم کی کتابِ علم، شاید کسی پارٹیکل میں پنہاں اربوں کھربوں صفحات کی مائیکرو کتاب ہے جو ڈی این اے کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتی، پڑھی جاتی ہم تک آن پہنچی ہے۔ ہمارے اعصاب سے اسکا کوئی اچھوتا رابطہ ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ قرآن بار بار انسان کو تفکّر کی دعوت اسی لیئے دیتا ہے کہ جب انسان غور کرتا ہے تو معلومات کے اس ویئر ہاؤس تک جا پہنچتا ہے اور اس کتاب کے اوراق کھلنے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ العلیم چاہتا ہے کہ انسان علوم حاصل کر کے نیابت کا حق ادا کرے۔ آپ نے دیکھا کہ علم کے منبع کے اہم ترین سوال کا جواب یا اس کی تشریح سائنس کے پاس نہیں بلکہ اسلام میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اس کے آخری اسباق تک پہنچ گیا؟ یہ تو وقت بتائے گا لیکن علم کا یہی چھپا خزانہ آدم کے حوالے سے ہماری بھی میراث ہے۔ یاد کریں کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمایا کہ:

"علم مومن کی گمشدہ میراث ہے"!

لیکن کیا یہ علم ہمیں اللہ کی لامحدود قوّت وقدرت کے حوالے سے عقلی طور پر مطمئن کر سکتا ہے؟

یہ ہر عاقل انسان کے ذہن کو شل کرنے والا سوال ہے کہ خدا کی قدرت اتنی ہمہ گیر کس طرح کی ہو سکتی ہے کہ کائنات کے ہر ہر ذرّے کا اور ہر انسان کے خیالات اور جذبات واعمال کا علم بھی اسے ہو۔ اس قدرت کے عملی پیرائے کیا ہو سکتے ہیں؟ ہماری تسلّی اس طرح کرائی جاتی رہی ہے کہ خدا اور اسکی صفات وقدرت کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایک درست بات ہے مگر ایک سوچتا ذہن جو سائنسی بنیاد پر ہر چیز کا جواز تلاش کرتا ہے وہ خدا کے حوالے سے بھی تجسّس کا اظہار کرنے میں حق بجانب ہوتا ہے کہ اسے ہر سوال کا مناسب عقلی استدلال ملے۔ آئیں اس پر غور کرتے ہیں۔

باب ۱۵

قدرتِ خدا اور گوگل

اس دور کے نوجوان سوچتا ذہن رکھتے ہیں اسی لیئے ہر عقیدے کا عقلی جواب طلب بھی کرتے ہیں اور تلاش بھی کہ تجسّس بھی اللہ کی تخلیق ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہم اپنی عقل اور علم کے بموجب یہ جاننے کی سعی تو کر ہی سکتے ہیں کہ خدا کی قدرت کی نوعیت اور پیرائے کیا ہو سکتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ایسی کھوج سے ہماری ایمانیات پر زد نہیں پڑتی کیونکہ ہمارا ایمان بالغیب ہمیں اللہ کی قدرت پر یقین عطا کرتا ہے مگر عقل کو چین سے بٹھانے کے لیئے سائنسی و منطقی دلیل بھی ضروری ہے تا کہ وسوسوں کا راستہ بند ہو۔ اس لیئے یہاں ہم اللہ کی عظیم الشّان قدرت کے پیرایوں کے فہم اور انکی عقلی تشریح کے لیئے دلائل کی تلاش میں جدید سائنسی دریافتوں کی مدد لیتے ہیں۔

ہماری روزمرّہ کی زندگی میں تیزی سے داخل ہونے والے کمپیوٹر اور اسمارٹ فون نے سوچنے کے اتنے دریچے کھول دیئے ہیں کہ بس دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن کی توجّہ کی ضرورت ہے۔ ہم اس ضمن میں خدا کی قدرت سے قبل انسان کی قدرت پر غور کرتے ہیں کہ وہ کیا کچھ حاصل کر چکا ہے۔ انٹرنیٹ یعنی انٹرنیشنل نیٹ ورک کئی ارب کمپیوٹرز کے مابین رابطے کا عالمی نظام ہے جو انٹرنیٹ پروٹوکول (IP) کی بنیاد پر چلتا ہے یعنی ہر کمپیوٹر ایک مخصوص نمبر کا حامل ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یہ ایک الیکٹرانک بازار ہے جس میں ہر طرح کی اشیاء، خدمات اور تفریحات موجود ہیں۔ ایک طرف تاجر نام کے ساتھ (ویب سائٹ) تو دوسری طرف خریدار یا تفریح کنندہ آئی پی IP نمبر کے ساتھ۔ ایک ارب سے زائد ویب سائٹ کے اتنے وسیع عالمی سسٹم میں تلاش، آپس میں رابطے اور معلومات کے حصول کے لیئے سرچ سوفٹ ویئر بنائے گئے جو اربوں کھربوں ایڈریس یا معلومات میں سے ہماری مطلوبہ منزل تک ہماری رسائی کو ممکن بناتے ہیں۔ انہیں سرچ انجن کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے مشہور اور برق رفتار گوگل Google ہے۔ ویب سائٹ "نیٹ مارکیٹ شیئر" کی مارچ 2017 کی رپورٹ کے مطابق روزآنہ ساڑھے چھ ارب

ویب سرچ میں Google گوگل کا حصہ ساڑھے چار ارب سے زیادہ ہے اسی لیئے یہاں پر انٹر نیٹ سرچ انجن گوگل Google کی قدرت اور کارکردگی کا جس کا آپ خود بھی روز مشاہدہ کرتے ہیں ایک مختصر جائزہ مناسب ہوگا۔ آیئے اس کی دسترس کا اندازہ لگائیں۔

گوگل کی قوت

گوگل کروم کی انسٹالیشن کے بعد ہمارے کمپیوٹر اور گوگل سرورز کا ان دیکھا رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ آج کل کے ایک اندازے کے مطابق گوگل پر ہر سیکنڈ میں اوسطاً پچپن ہزار تلاش کے مطالبے آتے ہیں جنکا انتہائی برق رفتاری سے جواب دیا جاتا ہے جس میں ہر سوال کے جواب کی تلاش میں اوسطاً اعشاریہ دو سیکنڈ میں ایک ہزار کمپیوٹرز کا استعمال ہوتا ہے۔ اس سوفٹ ویئر کی رسائیت کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی تلاش پر کی بورڈ پر ادھورے لکھے سوال کے آگے کے ممکنہ جملے یا ایڈریس بھی یہ ہمارے سامنے لاتا رہتا ہے تاکہ ہمیں آسانی ہو بلکہ آپ کی آواز سے بھی کہ کسی ویب سائٹ کا نام پکاریں اور گوگل اس لنک کو لے آتا ہے۔ ہمارے اسمارٹ فون پر گوگل کی گرفت ایسی ہے کہ اگر کھو جائے تو یہ آپ کو نہ صرف اس کی لوکیشن بتا سکتا ہے بلکہ اس کو لاک کر سکتا اور اس کا ڈیٹا بھی ڈیلیٹ کر سکتا ہے۔ آزمانے کے لیئے آپ ابھی کمپیوٹر پر اپنے گوگل اکاوئنٹ پر جا کر اپنے گوگل رجسٹرڈ اینڈرائیڈ android موبائل کی تلاش کا آپشن find-my-phone لکھیں تو یہ گوگل نقشے پر اس کا مقام ظاہر کر دے گا اور آپ سے آپشن پوچھے گا کہ گھنٹی بجائے، لاک کرے یا ڈیٹا تلف کر دے! مگر آپ صرف گھنٹی بجانے پر اکتفا کریں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ہر وقت کسی کی نگاہ میں ہیں۔

اس کی کارکردگی اور قوت کی ایک جھلک:

2013 کی رپورٹ کے مطابق گوگل کو ایک ارب سترہ کروڑ افراد استعمال کرتے تھے۔

پندرہ فیصد نئے سوالات کے جواب ڈھونڈنے کے لیئے گوگل روزآنہ بیس ارب ویب سائٹ (پیج) میں رینگتا ہے۔

نالج گراف ڈیٹا بیس میں پچاس کروڑ ستر لاکھ اداروں کے اٹھارہ ارب حقائق انکے آپس کے تعلق کے ساتھ محفوظ ہیں۔

مئی 2017 میں گوگل نے انکشاف کیا کہ اس کے ماہانہ انڈرائیڈ استعمال کرنے والی ڈیوائس دو بلین

تک پہنچ گئی ہیں۔

گوگل ایک سال میں ۲ ٹرلین یعنی بیس کھرب سرچ کرتا ہے۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق بارہ کھرب۔اس پر 130 کھرب ویب پیج انڈکس ہیں۔

یوٹیوب پر روزآنہ ایک ارب گھنٹے کی ویڈیو دیکھی جاتی ہیں۔

2014 میں اس کے ڈیٹا سنٹر میں استعمال ہونے والی توانائی امریکہ کے تقریباً تین لاکھ سڑسٹھ ہزار گھروں کے استعمال کے برابر تھی۔

گوگل کے تقریباً اٹھتر ہزار ملازمین ہیں۔

جی۔میل کو ایک ارب بیس کروڑ افراد استعمال کرتے ہیں۔

کم لوگوں کو علم ہوگا کہ گوگل کا ڈلیش بورڈ وہ ڈیٹا بیس ہے جس میں ہر کسٹمر یا یوزر کا ہر طرح کا مکمل ریکارڈ محفوظ ہوتا رہتا ہے۔اس میں ابتدا سے آج تک کی ہر گوگل ایپ application پر ہماری آپکی ہر ہر نقل وحرکت تاریخ اور وقت کے ساتھ محفوظ ہوتی ہے، یوٹیوب پر اعلانیہ اور خفیہ نظارے اپنی ہسٹری کے ساتھ محفوظ ہیں۔اس پر ہماری روز کی ہسٹری ڈیلیٹ کا اثر نہیں ہوتا بلکہ ڈلیش بورڈ سے مواد الگ سے تلف کرنا پڑتا ہے۔ Google.com/history or یا myactivity.google.com/myactivity آپ کو اپنی سرچ ہسٹری تک رسائی دے گا لیکن مطمئن رہیں کہ گوگل آپ کے علاوہ یہ کسی اور کو نہیں دکھاتا۔ سرچ کے علاوہ کئی خدمتی پروگرام بھی ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔

سیکنڈ کے بھی ثانیوں میں آپ کے سوال اور تلاش کا جواب نگاہوں کے سامنے آنا اب معمول ہے لہٰذا اس پر ہم غور کم کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے سسٹم کیا ہے۔ مارچ 2016 کی ایک محتاط رپورٹ کے مطابق دنیا کے مختلف خطوں میں پچیس لاکھ سرورز کے پھیلے وسیع جال نے گوگل کا یہ محیّر العقول نظام تخلیق کیا ہے۔ یہ تعداد روز بروز بڑھتی ہے۔اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ 2011 میں سرورز کی تعداد نو لاکھ تھی۔

اوپر دی گئیں شماریات زیادہ تر مشاہدے اور قیاس وحساب پر ہیں کیونکہ گوگل اپنی کارکردگی عموماً

شیئر نہیں کرتا۔ انکے حوالاجات آخر میں درج ہیں۔

گوگل کی کارکردگی ایک ان پڑھ انسان کے لیئے نا قابل یقین ہوسکتی ہے لیکن کیونکہ ہمیں اس کے پیچھے سسٹم کا علم ہے اس لیئے یہ ہمارے لیئے عجوبہ نہیں رہا۔ گوگل کی مثال سے ثابت ہوا کہ سامنے چلتے کسی بھی بڑے سسٹم کے پیچھے بھی بہت بڑی پلاننگ اور ہمہ گیر کنٹرول سسٹم ہوتا ہے۔ اب ایک قدم آگے جا کر پورے انٹرنیٹ کے نظام کو دیکھیں کہ کس طرح فیس بک، ٹویٹر، واٹس ایپ، مائیکروسوفٹ، اسکائپ، انسٹا گرام وغیرہ وغیرہ اپنے ایسے ہی مربوط نظاموں کے ساتھ روبہ عمل ہیں۔ سب سے دلچسپ اور اہم وائی فائی wi-fi (wireless-fidelity) کا ایک اندیکھا نظام ہے جو کروڑوں اربوں معلومات لیئے ہمارے اطراف "غیب" میں موجود ہوتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اس نظام (wi-fi) سے لاتعلق ہی رہتے ہیں مگر جب ہمیں کسی معلومات یا کسی تسکین کی طلب ہوتی ہے تو اس کی بدولت دنیا کی ہر معلومات صحیح یا غلط، چند ثانیوں میں کمپیوٹر یا اسمارٹ فون کی اسکرین پر آموجود ہوتی ہے۔

ہمارے مقامِ قیام سے دیکھا جائے تو اس انٹرنیٹ internet سسٹم کے دو حصے ہوئے، ایک وہ جو طبعی یا فزیکل ہے جس میں کمپیوٹر سرورز، مشینی انفرا اسٹرکچر، خلائی مصنوعی سیارے اور کیبل کا نظام ہے جو ہماری آنکھوں سے فی الوقت اوجھل ہے اور دوسرا وہ جو ہمارے اطراف wi-fi کی شکل میں لیکن غیر مرئی۔ اس سسٹم سے بہرہ مند ہونے کے لیئے ہمیں ایک ڈیوائس یعنی کمپیوٹر کی ضرورت ہوتی ہے جو اس سے ایک تعلق قائم کردیتا ہے۔ یہ ڈیوائس ہی، جو وائی فائی کے سگنل کو واپس معلومات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہے، اس خاص ماحول کے راز کو فاش کرتی ہے کہ کوئی عام سی فضا حقیقتاً خالی نہیں ہوتی بلکہ ایک بہت فعال دنیا اس خاموشی میں موجود ہوسکتی ہے جس میں بے پناہ معلومات موجزن ہوں۔

اب گوگل کی تشریح کی جائے تو ایک ایسا نظام ہے جو ہر لمحے لاکھوں انسانوں کی بات سن بھی رہا ہے اور جواب بھی دے رہا ہے انہی لمحات میں وہ ہر ہر شخص کے کمپیوٹر کی کلک بھی محفوظ کر رہا ہے گویا فرداً فرداً سب کے اعمال کا ریکارڈ بھی جمع کر رہا ہے۔ وہ سیٹلائٹ میپ پر کروڑوں لوگوں کو نہ صرف دنیا کا چپہ چپہ دکھاتا رہتا ہے بلکہ اسمارٹ فونز کی نقل وحرکت بھی محفوظ کر رہا ہے۔ مزید سب

کوٹریفک کی گنجائش بھی بتا رہا ہے اگر اس کا کوئی تعلق لائیو سیٹلائٹ ریکارڈنگ سے ہو تو سب کی گھر سے باہر کی تمام نقل وحرکت بھی ریکارڈ کر سکتا ہے، کریم اور اُوبر سروسز اس کی مثال ہیں۔ یہ سب کچھ شفاف حقائق ہیں کہ ایک فعال نظام بیک وقت کروڑ ہا انسانوں سے مختلف پیرایوں میں رابطہ رکھنے کی صلاحیت کا خوگر ہے۔ گوگل انسان کی صلاحیت کو آشکارہ کرتا ہے کہ اس نے کس طرح ایک برق رفتار سسٹم کی تخلیق کی۔ اس سسٹم کی رکھوالی کرنے اور چلانے والے بھی تقریباً اٹھتر ہزار انسان ہیں جو پس پردہ اس کا حصہ ہیں۔ گویا یہ ہمہ گیر سسٹم ظاہر اور باطن میں مربوط پیرائے میں جاری ہے جس پر ایک کنٹرولنگ اتھارٹی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ گوگل انسان کا بنایا ہوا ایک سسٹم ہے تو بھلا جس ہستی نے انسان کو بنایا وہ کیسے کیسے سسٹم کی تخلیق پر قادر نہ ہوگی۔

انٹرنیٹ اور اس کے سرچ سسٹم کو سمجھ کر ایک قدم آگے بڑھ کر کائنات کے نظم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انٹرنیٹ اور کائناتی نظم

کائنات وہ سسٹم ہے جس کے دو رخ ہیں ایک طبعئی اور دوسرا غیر مرئی، لیکن انٹرنیٹ سسٹم کے مقابلے میں اس کائناتی نظم میں منفرد بات یہ ہے کہ اس کا یہاں پر معکوس یا اُلٹ اطلاق ہے۔ انٹرنیٹ میں ہم غیر مرئی ماحول (وائی فائی) سے منسلک ہوتے ہیں اور طبعی فنکشنل رخ ہم سے اوجھل اور کہیں دور ہوتا ہے جبکہ کائناتی ماحول میں ہم طبعی ماحول میں ہوتے ہیں جبکہ اسکا فنکشنل نظم غیر مرئی اور ہمارے حواس سے اوجھل ہے کہ جس میں فطری قوانین، توانائیاں اور قوتیں شامل ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر نظام مربوط منصوبہ بندی سے لاگو تو ہوتا ہے مگر اس کی روانی میں مختلف کارندوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کائنات کے نظام کے جاری وساری ہونے میں اللہ کے کارندوں کا جو اہم مقام ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اللہ نے اپنے بعد فرشتوں پر ایمان لازم قرار دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خالق فرشتوں کا محتاج نہ ہونے کے باوجود انسان کو عقلاً بھی مطمئن کر رہا ہے کہ کائناتی سسٹم کس طرح بنایا اور چلایا جا رہا ہے۔ یہاں ایک بات اور عیاں ہوتی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنانے سے پہلے اپنی کچھ صفات کا عکس اس میں منتقل کیا تو اُسی کے باوصف انسان انہی پیرایوں میں اپنے نظام چلا رہا ہے، یعنی پلاننگ، انتظام اور ناظم

سے رابطہ۔ جس طرح گوگل کے نظام کا خالق باہر رہ کر ایک عظیم سسٹم کو رواں رکھتا ہے غالباً ایسا ہی کوئی نظم ہے کہ اللہ اس سسٹم سے باہر رہ کر کائنات اور زندگی رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔
گوگل کے نظام کی روشنی میں اگر ہم اس کائنات کے نظام کی تشریح کرنا چاہیں تو بآسانی بہت سے پہلوؤں کی وضاحت ہوسکتی ہے۔ اللہ کے نظام جس سسٹم کے تحت چل رہے ہیں ہمیں انکا فی الحال علم نہیں لیکن جدید ٹیلی کمیونیکیشن سسٹم اور انٹرنیٹ ہم پر واضح کرتے ہیں کہ اس سے برتر نظام عین ممکن ہیں۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ کوئی سسٹم بغیر پلاننگ کے نہیں بنتا اور نہ جاری رہ سکتا ہے اور کائنات بھی ایک سسٹم ہے۔انسان کا اپنے رب سے تعلق ہونا انتظامی ہی نہیں بلکہ فطری ضرورت بھی ہے۔ دنیا کا ہر ذی حیات اور ہر فرد ایک اسمارٹ فون کی طرح کسی روحانی یا انجانی پروٹوکول سے منسلک ہے۔

رب سے انسان کا ایمانی تعلق کیا ہے؟

گوگل کے اپنے فون انڈرائیڈ کے بِلٹ ان built-in سسٹم سے لیس ہوتے ہیں جس میں اپنا جی میل gmail.account ڈال کر آپ گوگل کے سرور سے منسلک ہوجاتے ہیں، بالکل اسی طرح ہر انسان خدا کے بارے میں ایک built-in فطری تجسّس لیکر پیدا ہوتا ہے جو روح میں پیوست ہے اور محض اس کا اقرار اس کا رابطہ رب سے قائم کرنے کے پیرائے زندہ activate کردیتا ہے۔

یہاں غور طلب یہ نکتہ ہے کہ ہم انٹرنیٹ کے ماحول یا نظم سے تعلّق اسی وقت قائم کرپاتے ہیں جب ہم اس کے فنکشنل طبعیٔ رخ سے ہم آہنگ کوئی طبعی ڈیوائس استعمال کرتے ہیں جیسا کہ کمپیوٹر اور اسمارٹ فون اپنی ہم آہنگ ساخت میں وائی فائی سسٹم یا کیبل کے توسط سے ہمارا رابطہ انٹرنیٹ کے پس پردہ نظام سے جوڑ دیتے ہیں۔ تو سوال یہ اُٹھتا ہے کہ:

کیا کائنات کے غیر مرئی فعال پیرایوں سے تعلّق جوڑنے کے لیئے ہمیں بھی غیر مرئی واسطے درکار نہ ہونگے؟ جیسا کہ ابھی ہم نے گوگل سے رابطے کے لیئے وائی فائی ڈیوائس کا تذکرہ کیا، اسی اُصول پر یہ بات بھی عین منطقی ہے کہ کائنات کو چلانے والے غیر مرئی نظام کو جاننے اور اس کے خالق سے رابطے کا کوئی طریقہ یا "ڈیوائس" یعنی رابطوں کے غیر طبعی پیرائے موجود ہوں۔
مگر وہ کیا ہوسکتے ہیں؟ کیا شعور و عقل؟ یا

رسالت، عبادات و نماز؟ غور کریں! مگر ایک اہم سوال اور:

کیا ڈیش بورڈ کی طرح کوئی اعلیٰ تر خفیہ نظام ہمارے تمام اعمال و حرکات کو محفوظ نہیں کر سکتا؟ اور کیا کسی نے گوگل کو کبھی دیکھا؟

خدا کا انکار کرنے والے کیا ہمیں گوگل، فیس بک اور مائیکروسوفٹ دکھا سکتے ہیں؟ ذرا سوچیں!

یہاں مقصد انکا خدا سے تقابل نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ دنیا کے طبعی ماحول میں بھی ایسے غیر مرئی عوامل موجود ہوتے ہیں جو ہمارے اعمال میں سرائیت رکھتے ہیں۔

روحانیت

انسان اپنے شعور کو حرف آخر سمجھتا ہے یعنی جو مظہر یا چیز اس کے شعور کی گرفت میں آ گئی وہی حقیقت بن جاتی ہے۔ یہی علم کے دائرے ہیں جو انسانوں میں جاہل اور عالم کے مختلف درجات کا تعین کرتے ہیں۔ ہم جسے عام طور پر انٹرنیٹ سمجھتے ہیں دراصل وہ حقیقی انٹرنیٹ کا معمولی حصہ ہے اور عام آدمی کی پہنچ سے دور ویب کے دوسرے شعبے بھی ہیں جیسا کہ ڈیپ ویب اور ڈارک ویب deep & dark web جو اصل میں انٹرنیٹ کا پچانوے فیصد ہیں۔ یہ وہ حصے ہیں جہاں گوگل اور عام براؤزر کی پہنچ نہیں بلکہ ان پوشیدہ حصوں تک رسائی کے دوسرے مخصوص براؤزر ہیں۔ گویا انٹرنیٹ کے تخلیق کاروں کی اپنی اس ایجاد پر گرفت اور اس کے مختلف پیرائے کی تشکیل بعید از قیاس نہیں کہ اس نظام میں انسان کو حیرت زدہ کر دینے والے مزید پہلو بھی ہوں۔ کسی بڑے نظام کو کنٹرول کرنے والی اتھارٹی اس کے خفیہ پہلو کی جھلک دکھا کر اس کو چھپا بھی سکتی ہے کہ انسان سوچتا رہ جائے کہ یہ حقیقت تھی یا آنکھ کا دھوکہ۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ہولوگرام ایک جدید علم اور ٹیکنک ہے جس میں کسی شخص کا ہیولہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اب اگر اس ٹیکنیک کو ظاہر نہیں کیا جاتا اور جگہ جگہ اس کا اچانک مظاہرہ کیا جاتا تو عام انسان اس کا کیا مطلب نکالتے؟ اسی طرح خدا کی خدائی کے چھپے حصے اپنے اندر علوم کے کتنے خزانے لیئے ہیں اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ روحانیت بھی ایسا خفیہ پروٹوکول ہے کہ جس کے آئی پی IP ایڈریس مخصوص افراد میں مستعمل ہوتے ہیں۔

حوالہ جات:

http://www.smartinsights.com/search-engine-marketing/search-engine-statistics/
http://www.internetlivestats.com/google-search-statistics/

https://expandedramblings.com/index.php/by-the-numbers-a-gigantic-list-of-google-stats-and-facts/
https://www.statista.com/chart/899/unique-users-of-search-engines-in-december-2012/
https://www.cnet.com/news/google-search-scratches-its-brain-500-million-times-a-day/
http://www.datacenterknowledge.com/archives/2017/03/16/google-data-center-faq
https://www.theverge.com/2016/7/21/12246258/google-deepmind-ai-data-center-cooling
https://www.theverge.com/2017/5/17/15654454/android-reaches-2-billion-monthly-active-users
https://expandedramblings.com/index.php/gmail-statistics/
http://www.dailymail.co.uk/sciencetech/article-3662925/
https://www.cnet.com/news/google-search-scratches-its-brain-500-million-times-a-day/

باب ١٦

حصارِ وجود اور انسان

جدید دور میں بھی انسان کا اہم ترین مسئلہ یہی ہے کہ کائنات اور انسان کیسے وجود میں آئے اور انسان کا حقیقی مقام کیا ہے؟ انسان کی فطری جبلّت کا جواب تو خدا ہی ہے لیکن خدا کیا ہے اور خدا اور انسان کا کوئی مادّی تعلّق کیوں نہیں ہے، ایسے بنیادی نکات ہیں کہ جن کی جانکاری انسان کے سوچ اور نظریات کے پیرایوں کو کوئی حقیقت پر مبنی مدار عطا کر سکتی ہے۔ ان نکات کی مزید وضاحت کے لیئے ہم ایک مرتبہ پھر خدا اور انسان کے وجود کے تعلّق کو ایک مختلف اور غیر روایتی پیرائے میں جاننے کی کوشش کریں گے۔ باب "خدا کو کس نے بنایا" میں ہم نے ایک نقطۂ نظر یا نظریہ مختصراً سمجھا کہ، "انسان جب کائنات کی تخلیق کے حوالے سے خدا کے وجود پر غور کرتا ہے تو اس کی عقل اس لیئے معطّل ہو جاتی ہے کہ وہ وجودیت کے پیرائے کو اپنے شعور میں ایک فطری اور سختی سے پیوست تاثر کے پرتو ہی سمجھنے پر مجبور ہے۔ انسان طبعی وجودیت میں قید ہے او اپنے محدود شعور کے باوصف وجود کے حوالے سے اسی طبعی وجودیت کو حرفِ آخر سمجھتا ہے۔ "

آیئے اس پر ذرا تفصیل سے غور کرتے ہیں۔

انسان اور اس کی بنائی چیزیں ایک فطری تعلّق میں بندھے ہوتے ہیں جیسے ایجاد اور موجد، فن اور فن کار، تحریر اور مصنّف، غزل اور شاعر، ڈیزائن اور ڈیزائنر وغیرہ۔ کام اور کام کرنے والے کے آپس کے اس تعلّق کے متواتر مشاہدے نے ہماری سوچ کی ایک ساخت تخلیق کر دی ہے کہ گویا فعل اور فاعل ایک سکّے کے دو رُخ ہیں جو ایک ہی ماحول میں منسلک ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ذہن میں سوچ کی ایک جبلّت تشکیل پا گئی ہے کہ خالق اور تخلیق کے جوز کا ایک مظہر میں مقیم ہونا ہی لازم ہے۔ خدا کو جاننے میں فہم کا یہی "فطری" اور جبلّی وصف یا ذہنی قفل ہماری فکر کے زاویئے متعیّن کرتا ہے کہ خالق اور کائنات بھی ایسے ہی پیرائے میں لازم و ملزوم کی طرح منسلک ہیں۔ کیونکہ کائنات اور انسان مادّی وجود رکھتے ہیں اسی وجہ سے ہم خدا کو بھی مادّی اور شعوری پیرائے

میں ہی جاننے اور تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً یہ نقطۂ نظر درست نہیں اسی لیئے انسان آج بھی خدا کے بارے میں متجسس ہے کہ خدا کون ہے، کہاں ہے اور کیا ہے۔

عدم کے پُر اسرار رنگ

کائنات کے ظاہر ہونے سے قبل کے پیرائے ناقابل تشریح پراسرار رنگ لیئے ہوئے ہیں کیونکہ عدم ایسا پیرایہ کہ جس کی تشریح یہی ہے کہ وہ کچھ نہیں ہے۔ اللہ ہی ہمیں غور کی دعوت دیتا ہے تو کیوں نہ ہم تجسس کے بموجب کسی نئے اندازِ فکر کے تحت اس باب میں غور کریں۔ لہٰذا ہم خدا اور اپنے موجود ہونے کو سمجھنے کے لیئے غور وفکر کی روایتی سطح سے ایک منزل اوپر زقند بھرتے ہیں اور دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے اس نامعلوم ماحول یعنی عدم یا قبل آفرینش کی پراسراریت میں غوطہ زن ہو کر عقل، علم اور وجدان کی بنیاد پر ایک مختلف خاکہ بنا کر اپنے مخمصوں کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ اس پراسراریت کی جانکاری کے سلسلے میں ہم خدا کی ذات، وجودِ انسانی اور کائنات کے باہمی تعلق کے پیرائے ایک نئے زاویئے سے دیکھیں گے اور چند اہم نکات پر غور کریں گے اور وہ ہیں: عدم کیا ہے؟ موجود ہونا یا وجود کیا ہے؟ کیا وجود بذاتِ خود ایک تخلیق ہے؟ کیا وجود ایسا محدود ذیلی مظہر limited/confined-phenomenon ہے جس میں انسان اور کائنات مقیم ہیں۔

لاوجود

عدم ایک لاوجود anti-existence یا لاشئے no-thing ہے کہ وہاں وجود بھی اجنبی ہے کیونکہ کوئی شئے موجود نہیں۔ اگرچہ عدم شئے نہیں ہے مگر کوئی ریفائنڈ اور برتر شئے para-thing ہوسکتا ہے جہاں پر وجود کے ایسے ریفائنڈ پیرامیٹرز یا بالائے وجود paraexistence پیرائے ہوسکتے ہیں جو انسان کی عقل سے ماورا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عدم یعنی کائنات کی آفرینش سے قبل کیا تھا یہ انسان نہیں جان سکتا کیونکہ ہمارا ماحول شئے کے پیرائے، اصطلاحات اور وضاحتیں رکھتا ہے۔ تو وہاں کیا تھا اور کیا ہونا ہوسکتا ہے؟

اس کا مستند جواب فی الوقت ہمارے پاس نہیں بس فلسفے اور غیر مصدقہ سائنسی نظریات۔ لیکن اس پر غور ہی شاید حقیقتِ وجود کو آشکارہ کرسکتا ہو۔ اس لیئے ہم کائنات کے مادّی پیرائے سے اوپر کسی مظہر کو جاننے کے لیئے ایک ذہنی کاوش کرتے ہیں گویا ایک مشق جو شاید کوئی عقلی گرہ کھول دے۔ اس کوشش میں نہ کسی ایمانی نظریئے کو چیلنج کرنا مقصود ہے اور نہ کسی متعین عقیدے کی نفی۔ ہم ایک

مفروضے پر گفتگو کریں گے کہ جس کا مقصد ذہنی تشفی ہے۔

تو آیئے ہم ایک مفروضے hypothesis یا نظریئے پر غور کرتے ہیں کہ:

"انسان وجود میں نہیں بلکہ کسی حصارِ وجود میں ایک ادراکِ وجود سے منسلک ہے۔"

مختصراً اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کا بنیادی جوہر انسان کے "موجود ہونے کا احساس" ہے۔ وجود existence ہمارے تخیّل کی ایک گرہ ہے یعنی موجود ہونا ایک ایسا مظہر ہے جو خود اپنی تخلیق سے پہلے معدوم تھا! ہمارے مذکورہ حصارِ وجود سے باہر نہ وجود ہے نہ مظہرِ وجودیت مگر صرف اَسرارِ اُلوہیت کہ جہاں وجودیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ وہیں سے خالق اپنی ہر طرح کی تخلیق سے اس کی پیدائشی جبلّت کے پیرایوں سے ہم آہنگ رابطے رکھتا ہے۔ حالانکہ ہم کُل مظہرِ وجود کی نفی کر رہے ہیں لیکن لاوجودیت کے پیرایوں کی تشریح اپنی فطری طبعی اور وجودی جبلّت کی محدودیت کے تئیں وجود کے پیرایوں میں ہی کر سکتے ہیں۔ خدا کائنات کے سسٹم کا حصّہ نہیں ہے کیونکہ خالق تخلیق کا جز نہیں بن سکتا ہے جو خود کو تخلیق کرنا ہوگا جو غیر منطقی ہے۔ دنیا کا خالق انسانی تصوّر سے بالا کسی انجانی ہستی کا خوگر ہے۔ اس کی وضاحت اسی طرح کی جائے گی کہ خدا بالائے وجود میں مقیم ہے جہاں سے اس نے طبعی وجودیت (physical-phenomena) تخلیق کی جس میں مادّی اور غیر مادّی وجودیت کے پیرائے ترتیب ہوئے۔ تخلیقی ماحول یعنی بالائے وجود Paraexistence کا مظہر انسان کی سمجھ کے پیرایوں سے بھی سِوا کچھ اور ہے! لیکن وہ جو کچھ بھی ہے یا وہاں جو کچھ بھی ہے اس کو انسان انہی پیرایوں میں جان سکے گا کہ جن مرئی و غیر مرئی پیرایوں کو انسان کے لیئے متعارف کر دیا گیا۔

وجود کیا ہے؟

اطراف کے ماحول کا طبعی تاثر ہمارے حواس ہمارے شعور میں ثبت کرتے ہیں، یہ تاثر شعور میں جذب ہو کر ذہن میں کسی کے ہونے کا احساس دلاتا ہے جس کو ہم وجود کی حقیقت کے بموجب قبول کرتے ہیں۔ وجود اور شعور لازم و ملزوم ہیں یعنی شعور کے بغیر ادراکِ وجود بھی مفقود اور اس طور وجود بھی۔ یعنی انسان منفرد وجودی دائرے میں گردش کرتا ذی روح ہے جس کا تخیّل وجود کے مدار سے نہیں نکل سکتا۔ انسان کی دانست میں وجود ایک ایسا پیرایا یا ڈائمنشن ہے کہ جس کے باہر معدومیت ہے لیکن یہ تاثر ذہن اور جبلّت میں پیوست طبعی وجود کے ادراک کی مقناطیسیت کی وجہ

سے ہے جو وجود سے بالا کسی مظہر یا حقیقت کو قبول نہیں کرنے دیتا۔ وجودی مظہر phenomenon-of-existence کا وصف یہی تاثر ہے کہ کوئی چیز یا تو ہے یا نہیں ہے جبکہ کوئی تیسرا روپ مفقود ہے بجز واہمہ۔

اتنا جان کر ہم اپنا اور اپنے خالق کا تعلق سمجھنے کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ لاوجود میں ایک "بالائے وجود ارادے" نے ایک انجانا حصار تخلیق کیا جو وجود سے پہلے وجود کی قیام گاہ کی فصیل بنا۔ پھر اُس کے اندر ایک نظام کی بنیاد کے طور پر ایک منفرد مظہر "ادراکِ وجود perception-of-being-existed" یعنی موجود ہونے کا تاثر تخلیق کیا گیا کہ جس میں ہر ذی نفس کو اس ادراک کے ساتھ پیدا کرنا تھا کہ "میں ہوں" یعنی حصارِ وجود میں ذی حیات کا احساسِ وجود۔ وضاحت اس کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ اللہ نے موجود ہونے کا ایک ماحول بنایا پھر اس میں وجود کے پیرائے تشکیل دیکر اس میں انسان اور جانداروں کی تخلیق کی جس کی بنا پر ہر جاندار یہ ادراک لیکر پیدا ہوتا ہے کہ وہ موجود ہے اور اطراف میں موجودات ہیں۔

اس اہم مظہر کی تخلیق کے بعد وجود کے حصار میں شئے یعنی کائنات اور اس میں زندگی کی تخلیق ہوئی، پھر غالباً زندگی مختلف پیرایوں میں ڈھلی جس میں شعور کی تخلیق ہوئی، شعور میں خالق کا ادراک جاگزیں ہوا اور خالق معبود بنا۔ اک مادی ہیئت میں منفرد حیات داخل کی گئی تو اس نے انسان کا روپ دھارا اور انسان صاحبِ شعور اور دیکھتا سنتا ہو گیا، یہ اُس ادراکِ وجود کی بیداری تھی کہ جو بطور خاص انسان کے لیئے بنا۔ اس طرح اطرافِ کائنات انسان کے لیئے موجودات بنے۔ پھر انسانی شعور میں فکر اور فلسفے نے جنم لیا۔ انسان نے اپنے وجود پر غور شروع کیا تو خالق کا ادراک بیدار ہوا۔ انسان مادی استعداد capacity میں اپنے خالق کو ڈھونڈنے تو لگا لیکن جان نہیں پایا کیونکہ انسان کی عقل اور علم شئے کی طبعی جبلّت پر ارتقاء پذیر ہوئے جبکہ خالق شئے نہیں ہے۔ مزید اجاگر کرنے کے لیئے یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کیونکہ انسانی جبلّت طبعی وجود کے خمیر سے اُٹھی ہے لہٰذا ہمارا تخیل ہمارے دماغ کی سالماتی یا مولیکیولر molecular ساخت کی بنا پر اور فطری ہم آہنگی کے باوصف صرف مادی پیرائے کے وجود کو ہی حقیقت کا نام دیتا ہے اور غیر طبعی یا حواس

سے ماوراء وجود کو خیال یا واہمہ سمجھا جاتا ہے۔ انسان کے لیئے آفرینش سے قبل کے پیرائے اسی لیئے معدوم اور ناقابل دسترس ہیں کہ ہمارا شعور متعین مادی اور وجودی پیمانوں اور حدود میں سوچنے کا مکلف ہے۔

نکتہ اہم یہ ہے کہ ایک لامحدود ارادے کی تخلیق "حصارِ وجود" کے اندر ہمارا یہ تاثر یا ادراک کہ کوئی چیز موجود ہے یا نہیں دراصل انتہائی اہم اور یکتا مظہر unique-phenomenon اور سپر تخلیق super-creation ہے۔ یہ وصف ہی حیات و کائنات کی تخلیق کے ماحول کا نقطۂ ثقل اور جوہری بنیاد ہے۔ یہی وصف انسان کو اطراف کے موجودات کا احساس دلاتا ہے اور یہی باقی معاملات کی اساس بنتا ہے۔ شعور کا یہ وصف جو حِسیات کے منشور سے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے یہی انسان کو وجود کا احساس دلاتا ہے۔ وجود شعور کا احساس ہے جو درحقیقت ناپائیدار تاثر ہے جو ہر شخص کی نیند اور موت کے ساتھ معدوم ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف خالق انسان کے ماحول اور اس کی ذہنی استعداد کے مطابق اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ اسی لیئے خالق خود کو زندہ اور قائم بتاتا ہے تاکہ انسان اُس کو اپنے وجود اور عقل کے پیمانے میں سمجھے۔ غالبًا انہی پیرایوں میں اللہ نے انسانی جسم کے اعضاء کے حوالے سے اپنی ذات کا ذکر بھی کیا جیسے اللہ کا چہرہ، ہاتھ یا پنڈلی تاکہ انسان آسانی سے نصیحت سمجھ لے۔ اس کو اسی پیرائے میں سمجھنا ہوگا۔

ادھر دیکھیں تو خالق نے شئے ہی پر مبنی ایک مظہر تخلیق کیا تب ہی انسان سے بار بار کہا کہ:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"بلاشک اللہ ہر شئے پر قادر ہے،...وہ ہر شئے پر قادر ہے۔" قرآن

یہ انسان کی سمجھ کے پیرایوں میں خالق کا پیغام ہے۔ خالق شئے کے علاوہ بھی مظاہر کی تخلیق پر قادر ہے، جس کا اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ہر طرح کی تخلیق پر قدرت رکھتا ہے لیکن عام انسان کو ان سے نابلد رکھا گیا ہے۔

کائنات شئے ہے، اس میں موجود ہر مظہر شئے ہے، انسان بھی شئے ہے۔ انسان کائنات میں مقید ہے اس لیئے اس کا واسطہ کائنات میں موجود اشیاء ہی سے ہونا ہے۔ انسان کی فکر بھی طبعی وجود کے دائرے اور پیرایوں یا شئے کی اصطلاحات میں ہی حرکت پذیر ہے لہذا انسان کا کل علم شئے کے پیرایوں میں ہی عیاں ہونا ہے۔ انسان شعوری وجود رکھتا ہے جبکہ خالق نامعلوم وجودی پیرایوں یا

وجود سے جدا پیرایوں میں مقیم ہے۔لیکن وجود سے ماورا کسی پیرائے کو ہم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ انسان وجود کے عدسے سے ہی کائنات اور ماقبل کائنات کو دیکھتا ہے اور وجودیت کے اندر ڈیفائن کیئے شئے کے پیرایوں میں ہی اس کی عقل مصروفِ کار ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ ہم محض ایک مفروضے پر غور کر رہے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ کائنات سے اوپر کا ماحول انسان اور ماورائے وجود کے درمیان ایک بفرزون ہو کہ اس زون میں خالق اپنی مخلوق سے رابطے کے انجانے واسطے رکھتا ہو! دلیل اس کی مشہور واقعۂ معراج النبی ﷺ ہے کہ جس میں اللہ کی قربت کی طرف بڑھتے ہوئے اُس ماورائے عدم کی سرحد پر آ کر جبرائیل علیہ السلام رک گئے کہ ایک حد یا رکاوٹ تھی! شاعر نے اسی پر کہا،

جلتے ہیں جبرئیل کے پَر جس مقام پر۔

کسی ماورائے عقل وشعور ماحول سے متعلق ایک حدیثِ مبارک بھی دلیل ہے جس میں کچھ ایسا ارشاد ہوا کہ: "جنت ایسی جگہ جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا خیال تک آیا!"

http://www.islamicurdubooks.com/Sunan-at-Tirmidhi/Sunan-Tirmazee.php?vfhadith_id=3522

یہ اُس اجنبی "ماورائے وجود" یا ماورائے عدم ماحول کی طرف منسوب ہوسکتی ہے جو انسانی شعور اور طبعی وجودیت کے حصار سے جدا اور ماورا ہے یعنی ہوسکتا ہے کہ جنت کسی اجنبی تخلیقی حصارِ میں ہو جہاں کے پیرائے یکسر مختلف ہوں۔ یہاں اس بات کو بھی تقویت ملتی ہے کہ حقیقتاً خالق انسان سے اس کی سمجھ کے پیرایوں میں ہی مخاطب ہوا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ انسان کسی سپر انسانی روبوٹ humonoid-robot کو مصنوعی ذہانت کے حوالے سے کوئی کمانڈ یا ڈائرکشن ایک مخصوص پروگرام لینگوج یا مخصوص الیکٹرانک طریقے سے ہی دے گا کہ جس پر روبوٹ کی ساخت ہے یا اُس کی مصنوعی الیکٹرانک ذہانت اس سے ہم آہنگ ہو۔ گویا تشکیل وجود ہی اصل نکتہ ہے سمجھنے کا۔

جیسا کہ ہم جان چکے ہیں ایک سپر انسان نما روبوٹ humanoid-robot انسان کا بنایا دھاتی وجود ہے جو شعور رکھتا ہے۔ اس کا شعور مصنوعی اور اس کا "وجود" اس کے پروگرام کے مطابق الیکٹرانک ہوگا کیونکہ اس کی ساخت بجلی، میٹل اور سوفٹ ویئر پر ہے۔ یہ سوفٹ ویئر دراصل انسان

کے دماغ کے ایک گوشے کا عکس یعنی تخیل وفکر کا انعکاس ہے جو روبوٹ کے وجود کو ایک مصنوعی زندگی عطا کرتا ہے۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے روبوٹ میں اپنے خیال کا عکس منتقل کیا تو وہ ایک برقی حیات electronic-life پا گیا۔ اس روبوٹ کی ذات میں اتر کر غور کریں کہ کیا اس کی کوئی سوچ ہے؟ جو یقیناً ہے کیونکہ اس کو ایک خاص اور محدود پیرائے میں عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ غور کا نکتہ یہاں یہ ہے کہ ایک سوچتے مگر محدود ذہن والا ہیومن روبوٹ انسان کے وجود کے بارے میں انسان کے معیّن کیئے ہوئے پیرامیٹرز میں ہی کسی ایسے تاثر میں ہوگا جو انسانی ماحول سے جدا ہوگا۔ واضح یہی کرنا ہے کے کسی ذی حیات میں وجود کا ادراک ہی اصل بنیاد ہے جو اس کے لیئے کسی عالم world کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیئے یہاں پر ہمارے وجدان یا مراقبے اور تخیل کا کردار ہے جو ہمیں بتائے گا کہ اگر ہم ایک سپر انسانی روبوٹ humanoid ہیں تو ہم الیکٹرانک حصار میں انسان کے وجود کی نوعیت کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں؟

اسی طرح ہمارا مادّی وجود ایک بے ثبات مظہر ہے کیونکہ کائنات میں موجود ہونا کسی برتر مظہر کے حوالے سے ایک واہمہ بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ ہمارا وجود بالائے وجود میں ایک لایعنی چیز ہو۔ مثال اس کی ہمارے خواب ہیں جو حقیقی جذبات جیسے خوشی، خوف اور لذّت کا احساس پیدا کرتے ہیں لیکن پھر ایک دوسرے مظہر phenomenon بیداری میں واہمے کی طرح معدوم ہو جاتے ہیں۔ عین اسی طرح انسان اپنی دانست میں فی الوقت ٹھوس وجود کے پیرائے میں لیکن درحقیقت ایک ادراکِ وجود میں رہائش پذیر ہے جو ایک طبعی یا برتر خواب یا پیراڈریم para-dream کی کیفیت ہو سکتی ہے یعنی موت کے بعد حواس ایسی کیفیت سے دوچار ہوں یا ایسے گم گشتہ ماحول میں بیدار ہوں جو کبھی روح کا مسکن ہو تو انسان یہی کہہ اُٹھے گا کہ دنیا کی زندگی تو ایک خواب تھی! دلیل اس کی قرآن سے یہ ہے کہ دنیا کو کھیل تماشہ بتا دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ قیامت کے روز انسان محسوس کرے گا کہ دنیا میں مختصر وقت گذارا، اور ارواح کا مسکن بھی عدم کا کوئی ماحول ہی ہے۔ لہٰذا ہم بالائے وجود کے ایک ارادے کا ردِ عمل ہیں جو مادے کی ٹھوس روایات تو رکھتا ہے لیکن ہم اس طبعی ماحول کی ایسی حقیقت ہیں جو بالائے وجود میں بے حقیقت ہے۔

خالق کے نائب کی حیثیت سے انسان کی تخلیق انتہائی خاص پیرامیٹرز رکھتی ہے۔ انسان کی ساخت

انوکھا رنگ لیئے ہے جس میں جسم کی موت ہے لیکن روح کو موت نہیں! اسی روح کا راز انسان سے پوشیدہ بھی رکھا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا روح بالائے وجود سے متعلق کوئی ایسا مظہر تو نہیں جو وجود میں عیاں ہونے کی خاصیت رکھتا ہو؟

اللہ نے انسان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (قرآن: سورۃ 68 آیت 2)

جس نے موت اور زندگی تخلیق کی تا کہ تم کو آزمائے کہ کس نے اچھے اعمال کیئے ہیں۔

اس خطاب سے قبل کسی ڈائمنشن میں خالق ارواح سے بھی مخاطب ہوا اور اپنی بادشاہی کا اقرار کرایا۔ " کیا میں تمہارا رب نہیں؟" یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ زندگی تو انسان سے قبل موجود تھی کہ انسان سے قبل مخلوق کی موجودگی کا بیان بھی ہے! گویا بہت سی انجانی حیات کا قیام ایک نامعلوم ماحول میں تھا اور ہے جیسے فرشتے، جنات وغیرہ لیکن اہم بات یہ ہے کہ غالباً اُس وقت کسی حیات کو موت نہ تھی کیونکہ ایسا کوئی خدائی اشارہ نہیں۔ اُس ماحول یا مظہر میں نہ کوئی ہمارے جیسا وقت رواں تھا نہ دن نہ رات، بس ایک انجانا دائمی حال! اس جمودِ وقت میں انسانوں کے لیئے مادّی وجودیت کے تئیں ایک جدا اور خاص سسٹم بنا جس میں اس کے لیئے موت کے ساتھ ایک اچھوتی طبعی زندگی تخلیق ہوئی۔ انسان کو نیابت کی خلعت عطا کر کے اور موت کا ہار پہنا کر ایک جداگانہ حیات کے تئیں موجود ہونے کا سیمابی یا بے چین شعور دیا گیا جو اس کا سرمایۂ افتخار ہے اور یہی اس کو طبعی وجودیت کا انتہائی موثر احساس دلاتا ہے۔ اس طرح انسان کا قیام یا ظہور ایک مخصوص مادّی مظہر کے اندر ہے جسے ہم وجود کہتے ہیں۔ گویا مادّی پیمانے کے اعتبار سے "ماورائے وجود" میں خالق، پھر نوری ناری مخلوقات اور پھر کائنات میں خلوی و خاکی حیات کے سسٹم دائرے در دائرے ہیں۔ موت اور فنا میں فرق یہ ہے کہ موت اس ہیئت کو ہوتی ہے جو روح یا روح جیسی کوئی خاصیت رکھتا ہے جبکہ فنا اس وجود کی ہے جو روح نہیں رکھتا یا روح سے جدا ہو۔ روح کو موت نہیں بلکہ روح اصل مظہر ہے جو کسی بھی جسم میں دوبارہ عیاں ہو سکتا ہے جیسے کمپیوٹر کا سوفٹ ویئر!

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موجود ہونا یا نہ ہونا مخصوص کائناتی طبعی تاثر paradigm ہے جس کی ہمارے حواس ایک خاص ماحول کے حوالے سے ہمیں اطلاع دیتے ہیں۔ خدا کے حوالے سے اس کا

اطلاق قطعیٰ غیر متعلق irrelevent ہے کیونکہ خدا مظہرِ وجود کے حصار اور ادراکِ وجود phenomenon-of-being-existed کے مظہر کی تخلیق کے تئیں نہ صرف ہمارے شعور بلکہ وجود کے مظہر سے بھی ماورا ہو چکا ہے۔ ہمارے مفروضے کے مطابق اللہ تعالیٰ حصارِ وجود سے باہر ہیں اس لیئے وجودیت اور طبعیات کی اصطلاحات و استعارات سے بھی ماورا۔اس صورتحال میں ہم اللہ کو اپنی فکر کی بناوٹ کے تئیں اپنے شعور میں جاگزیں وجود کے ادراک کے تحت ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔خدا کو کس نے بنایا کا سوال اسی تاثر کی کوکھ سے نکلتا ہے جبکہ ہم جان چکے ہیں کہ حصارِ وجود سے باہر موجود ہونا یا نہ ہونا ہی اجنبی ہے۔

خدا وہ ہستی ہے کہ موجود اور غیر موجود کے پیرایوں میں صرف سمجھی جا سکتی ہے تشریحات سے سمجھائی نہیں جا سکتی کیونکہ وہ بالائے وجود سے متعلّق ہے۔ واضح رہے کہ انسان کے لیئے خالق شئے یا مادّی پیرایوں میں ہی اپنی صفات میں لامحدود ہے کیونکہ لامحدود ہونا فکرِ وجودیت کا ہی ادراک ہے۔خالق حقیقتاً کائنات کے مادّی اور غیر مرئی پیرایوں سے مبرّا ہے اور بالائے وجود میں لامحدود علم، لامحدود ارادہ اور لامحدود زندگی کا خوگر ہے۔ وجود کے پنجرے میں مقیّد انسان اپنی اصطلاح میں اللہ کی ذات کو اتنا کچھ ہی سمجھ سکتا ہے اور بیان کر سکتا ہے۔

کیا ہمارا یہ مفروضہ مادّی پیرایوں میں خدا کی ناقابلِ تشریح ہستی کے اسرار کی گتھی کسی حد تک سلجھاتا ہے؟ کیا انسان اللہ کو مادّی وجود کے پیرایوں میں سمجھنے میں اپنی عقلی بے بسی کو تسلیم کرنے پر تیار ہے؟

خدا اور انسان کے تعلّق کو ایک دوسرے انداز سے سمجھنے کے بعد ہم ایک بہت اہم نکتے یعنی انسان کے عمل اور آزادارادے پر غور کرتے ہیں۔

باب ۱۷

جبر و قدر، تقدیر اور لوحِ محفوظ

کیا انسان اپنے فیصلوں اور عمل میں مکمل آزاد ہے؟
کیا انسان کے اعمال پہلے سے متعیّن ہیں؟
کیا ہر انسان کے سارے اعمال پہلے سے متعیّن یا لکھے ہوئے ہیں؟
یہ سوال اکثر سوچنے والوں کو بے چین کرتا ہے کہ تقدیر کیا ہے کیونکہ اگر تقدیر تحریر شدہ ہے اور ہر عمل لوحِ محفوظ میں پہلے سے لکھا ہے تو انسان تو مجبورِ محض ہوا کہ وہی کرے گا، پھر جزا اور سزا تو بے معنی ہوئے! سائنس تقدیر کو نہیں مانتی جبکہ یہ عقیدہ مذہب کا ایک اہم جز ہے۔ حقیقت آشنائی کی اساس اگر صرف حواس اور اس کے تجربات ہیں تو جدید سائنس سے زیادہ حقیقت پسند کوئی نہیں لیکن اگر حقیقت آشنائی کی بنیاد عقل ہے تو جدید سائنس ادھوری سچائی ہے۔ کائنات کی سچائیاں جاننے کے لیئے انسان کو اپنے حواس سے ایک درجہ اوپر ہو کر حقائق کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے کہ کسی بھی مظہر کا ٹھوس عقلی جواز ہی اس کی سچائی کی دلیل ہوتا ہے۔ تقدیر کا تعلق مستقبل سے ہے یعنی تقدیر وہی جان سکے گا اور لکھ سکے گا جس میں مستقبل میں دیکھنے کی قوّت ہو۔ یہاں ہم بنیادی موضوع سے منسلک موضوعات کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے مرحلہ وار ہی تقدیر اور لوحِ محفوظ کے موضوع کی طرف بڑھیں گے۔ آئیں اس پر جدید علمی زاویوں اور پیش رفت کی روشنی میں غور کرتے ہیں کہ تقدیر کے حوالے سے حقیقت کیا ہوسکتی ہے اور جزا اور سزا کا اسکوپ یعنی دائرۂ کار کیا ہے۔

آزاد ارادہ یا مرضی

جزا اور سزا کی بنیاد عمل پر ہے مگر عمل سے پہلے ارادہ ہوتا ہے یہ بنیادی عنصر ہے جس پر عمل کی بنیاد پڑتی ہے۔ ہمیں جاننا ہے کہ شعور consciousness, ارادہ intent، اور خواہش desire کیا ہیں؟ خواہش خیالات thought سے ابھرتی ہے یا خیال خواہش سے پیدا ہوتا ہے؟ یہاں مذہب ان تمام کا منبع روح کو بتاتا ہے جبکہ سائنس اس کی نفی کرتی ہے۔ سائنس شعور، ارادہ و خواہش کو تو جھٹلا نہیں سکتی کہ سائنسدان خود اس کا تجربہ کرتا ہے اس لیئے ان سب کو

مائنڈ mind کا نام دیا گیا مگر مائنڈ کہاں ہوتا ہے اس کا بھی سائنس کو نہیں پتہ! ارادے اور عمل کے حوالے سے سائنس کے اس مخمصے کو یہیں چھوڑ کر ہم آگے بڑھتے ہیں۔ جدید سائنسی اور تحقیقی نظریہ یہ ہے کہ انسانی خیالات بھی طبعی قوانین کا نتیجہ ہیں گویا ہم جو کچھ سوچتے ہیں یا جو خیال آتا ہے وہ طبعی یا کیمیائی قوانین کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی کیمیائی عمل خیالات کو جنم دیتے ہیں جو عمل پر منتج ہوتا ہے۔ اب اگر ہمارے خیالات اور اعمال ان معیّن قوانین کی وجہ سے ظہور پزیر ہوتے ہیں تو پھر سائنسی سوال یہ ہے کہ ہم اپنے عمل میں کتنا آزاد ہیں۔ اس موضوع پر موجودہ دور کے تسلیم شدہ عظیم سائنسدان اسٹیون ہاکنگ، (انکے اقوال کا خاص طور پر اس لیئے انتخاب کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستند ملحد ہیں) اپنی حالیہ کتاب دی گرینڈ ڈیزائن میں لکھتے ہیں کہ:

" گو کہ ہم سمجھتے ہیں ہم اپنے عمل کو چن سکتے ہیں لیکن سالمے molecule کی بنیاد پر حیاتیات کا ہمارا فہم یہ بتاتا ہے کہ تمام حیاتیاتی عمل کیمیائی اور طبعی قوانین کے طابع ہوتے ہیں اور یہ ایسے ہی یقینی ہیں جیسے کہ کسی سیارے کا گردشی مدار۔ دماغی سائنس کے حالیہ تجربات اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ ہمارا طبعی دماغ سائنسی قوانین کی پیروی کرتا ہے اور یہی ہمارے رویّوں کا تعیّن کرتا ہے بجائے باہر کی کسی ایجنسی کے"۔

یہیں پر یہ آگے رقم طراز ہیں:

(The Grand Design, Pg 45,Stephen Hawking.)

"یہ تصور بہت دشوار ہے کہ ہماری مرضی کس طرح آزادنہ طور پر کام کر سکتی ہے جبکہ ہمارے رویّے طبعیٔ قانون سے ہی متعیّن ہیں۔ گویا بظاہر ہم سب حیاتی روبوٹ سے زیادہ کچھ نہیں اور آزاد مرضی محض ایک دھوکہ ہے۔"

اسی سائنسداں کی انسانی رویّے کی پیشگوئی سے متعلق ایک اور تشریح کا مطالعہ کریں جو بذاتِ خود ایک عظیم تر اور ہمارے شعور کی پہنچ سے ماوراء سپر سائنس کا بالواسطہ اعتراف ہے۔

(The Grand Design, page,45-46, by Stephen Hawking.)

"یہ نتیجہ اخذ کرنے کے باوجود کہ انسانی رویّے فطری قوانین کے طابع ہوتے ہیں، یہ بات بھی معقول لگتی ہے کہ اسکو سمجھنے کا عمل اتنا پیچیدہ اور اتنی زیادہ جہتوں پر مشتمل ہوگا کہ کوئی بھی پیشگوئی تقریباً ناممکن ہوگی، اسکے لیے انسانی جسم میں موجود ہزار کھرب کھرب خلیات thousand-trillion-trillion-molecules میں ہر ایک کی ابتدائی کیفیت کی معلومات درکار ہونگیں پھر اتنی بڑی تعداد کی مساوات equations کو حل کرنے کے لیے چند ارب سال درکار ہونگے!"

آگے اسی صفحہ چھیالیس پر وہ لکھتے ہیں کہ کیونکہ طبعی قوانین کے ذریعے انسانی رویّوں کی تشریح انتہائی ناقابل عمل ہے لہذا ہم effective-theory کا اطلاق کرتے ہیں کہ انسان کے پاس

آزاد مرضی یا ارادہ free-will ہے، جسکی ذیل میں نفسیات اور معاشیات وغیرہ آتے ہیں جہاں اس حوالے سے انسانی طرز عمل کی مزید تفصیل ہوتی ہے۔

خالق اور پیش گوئی کی دسترس

ہمارے موضوع کے حوالے سے جناب اسٹیون ہاکنگ کا یہ اعتراف بہت اہم ہے کہ سائنس اگلے لمحے کی پیش گوئی سے بھی قاصر ہے لہٰذا اگر کچھ احباب سائنس پر ہی بھروسہ کرتے ہیں اور اسی کو اپنا رہبر تسلیم کرتے ہیں تو یہ جان لیں کہ اگلے لمحے یا آئندہ کی پیش گوئی سائنس کے نزدیک ایک ناممکن کام ہے۔ اب دوسری طرف آسمانی کتاب، خالق کائنات کے پیغمبران اور ولی اللہ کی پیش گوئیاں ہیں جو سامنے کی حقیقت ہے جو کتابوں اور اب انٹرنیٹ پر بکھری ہوئی ہیں جس میں مستقبل قریب کے بلکہ ہزار سال آگے کے واقعات کے اشارے دیئے گئے جو درست ثابت ہوتے چلے آ رہے ہیں کہ جس کی گواہی تاریخ کے صفحات بھی دے رہے ہیں۔ اُس علم کی قوت اور وسعت کا ادراک انسان تو نہیں کر سکتا جس نے ڈیڑھ ہزار سال آگے کی پیش گوئی کر دی، وہ علم کیا ہوگا؟ اس علم کی قوت کیا ہوگی؟ کیا سائنس اس علم کے پیرایوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ یقیناً اسلام کا پیش گوئی کا یہ وصف اور مظہر الحادی اور ڈارونی سائنس کی فرضی برتری کی بنیاد کو ہلا دیتا ہے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بہت محدود پیش گوئی تو سائنس بھی کر سکتی ہے۔ ایک مصنوعی دانش artificial-intelligence کے حامل انسان نما سپر روبوٹ humanoid کے کسی مخصوص ماحول میں ممکنہ ردِ عمل کی پیش گوئی اس کا پروگرامر اپنی علمی پیمائش کی بنیاد پر کر سکتا ہے کیونکہ روبوٹ ہر صورت میں اسکے مقرر کردہ دائرۂ کار میں ہی حرکت کرتا ہے۔ ان متعین حدود کا علم ہی پروگرامر کو وہ قوت دیتا ہے کہ وہ آئندہ کے ممکنہ عمل اور ردِ عمل کی تشریح کر سکتا ہے۔ یہاں اصل نکتہ علم کی وسعت اور اس پر کسی کے غلبے کا ہے۔ اس سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ انسان جس علم کے تحت کوئی حرکت پذیر شئے یا مصنوعی زندگی تخلیق کرتا ہے تو اپنی تخلیق کے ممکنہ عمل کے حوالے سے اسکی پیش گوئی کی دسترس اس کی وسعت علم، قوت فکر اور اپنی تخلیق کی ساخت اور کارکردگی کے پیرایوں پر پختہ عبور پر منحصر ہو جاتی ہے۔ جیسا ہم نے جانا انسان کے رویئے کی پیش گوئی سے سائنس قاصر ہے لیکن اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ قابل احترام سائنسدان مسٹر اسٹیون ہاکنگ انسانی عمل کی سائنسی پیش گوئی کو کُلی مسترد نہیں کر رہے بلکہ پیش گوئی کا ایک سائنسی اور حسابی طریقہ کار

بتاتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہوسکتی ہے لیکن ساتھ ہی اعتراف کرتے ہیں کہ انسان کے پاس اس کی محدود دماغی صلاحیت کی وجہ سے اتنی علمی سکت نہیں کہ اس کو انجام دے سکے۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی انسان ایسی کسی صلاحیت کا حامل ہو تو پیش گوئی کرسکتا ہے۔ یہاں سائنس کی اپنی تشریح ہی یہ ظاہر کرتی ہے کہ پیش گوئی کوئی غیر سائنسی عمل نہیں بلکہ اس کو انسانی عقل کی محدودیت کی بنا پر ناقابلِ عمل ہونے کی بنا پر مسترد کیا جاتا ہے۔ مگر کچھ احباب کسی ضد میں ایک قدم آگے بڑھ کر پیغمبرانہ اور دوسری پیش گوئیوں کو غیر سائنسی، ناممکن، دقیانوسیت، قیافہ اور حماقت قرار دیدیتے ہیں جبکہ یہ نقطۂ نظر کتنا عقلی اور سائنسی ہے وہ ظاہر ہوگیا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور اسلام کے حوالے سے تقدیر پر غور کرتے ہیں۔

جبر وقدر اور اسلام

جبر وقدر اور تقدیر کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ سائنس کی فیلڈ نہیں ہے لیکن مذہب اس بارے میں دعویٰ کرتا ہے کہ نہ صرف انسان کی تقدیر بلکہ کائنات کے رموز بھی تحریر شدہ ہیں۔ گویا تقدیر تو ہمارا آئندہ کل ہے، ایک انجانا مستقبل۔ لیکن ہمارا دین اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ یہ انجانا صرف انسان کے لیئے ہے انسان کے خالق کے لیئے نہیں۔ بس یہیں پر آکر کچھ احباب کنفیوز ہوجاتے ہیں اور اپنے آپ کو بے بس سمجھتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں وہ ایک جبر ہے کیونکہ ہم پہلے سے متعین کیئے اور لکھے ہوئے پر عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ کیا یہ گمان صحیح ہے؟

اس سلسلے میں ایک واقعہ کا تذکرہ اہم ہے جس کے مطابق کچھ ایسا ہوا کہ ایک یہودی ایک کٹورے میں پانی لیکر ہمارے نبی ﷺ سے اس طرح پوچھتا ہے کہ اے محمد ﷺ (بتایئے) کہ میری تقدیر میں کیا ہے، میں یہ پانی پیونگا یا پھینک دونگا؟ اب اگر آنحضرت ﷺ فرماتے کہ تو پانی پیئے گا تو وہ پھینک دیتا یا اسکے معکوس لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو تو کرے وہ تیری تقدیر! بس یہی نکتہ سمجھنے کا ہے۔

انسانی تقدیر کے حوالے سے دو مختلف مظاہر phenomena ہیں جن کو ہم خلط ملط کرتے اور پھر اس کی وجہ سے وسوسوں میں گھرتے ہیں، ایک مظہر وہ ہے کہ جس میں انسان کا قیام ہے یعنی یہ دنیا جو کہ ذیلی یا کمتر مظہر ہے اور جسکے پیرائے ہمیں معلوم ہیں جبکہ دوسرا وہ کہ جس میں انسان کے خالق

کا قیام ہے وہ مظہر phenomenon برتر و غالب ہے اور اسکے پیرائے نا معلوم ہیں۔ درحقیقت انسان اپنے حواس کے اعتبار سے ایک انتہائی محدود ماحول کا باشندہ ہے جس میں اسے اپنے تخّیل اور قوتِ عمل کے تئیں کسی بھی کام کی مکمل آزادی ہے لیکن جب ہم دونوں مظاہر یعنی عدم اور دنیا کے پیرایوں کی تفریق سمجھے بغیر اور اپنے ماحول کا مناسب ادراک و تجزیہ کیئے بغیر" لکھی تقدیر" کے تصوّر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو کنفیوز ہوتے ہیں۔ آئیں ہم اس جبر وقدر اور تقدیر کے ساتھ اپنے اور خالق کے ماحول یعنی دنیا اور عدم کے تعلّق کو عام فہم طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں جدید سائنسی پیش رفت سے مدد لیتے ہیں۔

جبر وقدر کی سائنسی تشریح

اس بات کو مشہور ویڈیو گیم کاؤنٹر اسٹرائک Counter-Strike کی مثال سے سمجھتے ہیں۔ یہ ایک محدود کھیل کا سوفٹ ویئر ہے جو کہ ظاہر ہے تحریر شدہ ہے اور نوجوانوں میں بہت مقبول ہے۔ اس کھیل میں دو مخالف گروہ ایک دوسرے کو فنا کرنے یا زیر کرنے پر کمربستہ ہوتے ہیں۔ یہاں تین ماحول ہوتے ہیں:

پہلا ایک نادیدہ پسِ اسکرین مظہر جس میں پورا پروگرام تمام باریکیوں کے ساتھ تحریر شدہ ہوتا ہے یعنی گیم کا سوفٹ ویئر، دوسرا مظہر کمپیوٹر اسکرین یعنی میدان عمل، تیسرا کمپیوٹر سے باہر یعنی کھلاڑی۔ لیکن ایک اور مظہر بھی ہے وہ اس پروگرام یعنی سوفٹ ویئر کا خالق ہے جو اس کھیل کے تمام رموز سے واقف بھی ہے اور کھیل کے پیرامیٹرز تبدیل کرنے پر قادر بھی۔

کھیل شروع ہونے پر باہر موجود کھلاڑی اندر کے کردار کا کنٹرول لیکر درحقیقت گیم کا حصہ بن جاتا ہے اور اندر کے ماحول سے منسلک ہوجاتا ہے۔ اس طرح اب بظاہر دو ماحول رہ جاتے ہیں ایک ظاہر میں جبکہ دوسرا پیچھے چھپا ہوا۔ ظاہری ماحول میں کھیل کا میدان اور کھلاڑی یکجا ہوجاتے ہیں۔ یہ دونوں مظاہر یعنی پس پردہ پروگرام اور اسکرین پر رواں کھیل آپس میں اندیکھے الیکٹرانک واسطوں سے منسلک ہیں جو سوفٹویئر کے طابع ہے یعنی پروگرام کی تحریر کے مطابق یہ دوڑتی الیکٹرک لہریں ہیں جو اسکرین پر ایک جنگ کا سماں باندھتی ہیں۔ سوفٹ ویئر میں کھیل کے دوران کھلاڑی کے ہر ایکشن پر عمل اور ردِ عمل کے پیرائے فعال رہتے ہیں۔ اس میں ایکشن کے حوالے سے کامیابی اور ناکامی، خوشی و غم، فتح اور شکست کے پیرائے بڑی تفصیل سے موجود ہوتے

ہیں۔ گیم کے سوفٹ ویئر میں ہزاروں صحیح و غلط true/false کی لوجک یا منطق کی گرہیں یا پھندے Loops لگے ہوتے ہیں جو یہ طے کرتے ہیں کہ ہر ہر مرحلے پر کوئی کردار یا کھلاڑی کیا کیا کر سکتا ہے تو پھر اسکا کیا کیا نتیجہ نکلنا ہے۔ کھلاڑی ان مہیا آپشنز میں سے اپنی مرضی سے کوئی منتخب کرتا ہے اور اگلے مرحلے کے منطقی اقدامات اور منسلک پھندوں میں جا پہنچتا ہے۔ اس پراسس کو ہم لکھی ہوئی مگر سیّال "قسمت" کہہ سکتے ہیں جہاں ہر کھلاڑی کا مستقبل اس کے فیصلے اور عمل کے تئیں جزوی ڈیفائن ہوتا ہے اور اب یہ کھلاڑی پر منحصر ہے کہ اپنے آئندہ وقت یا مستقبل کو کیا رخ دیتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی کھیل کا ماحول کسی کھلاڑی کی حتمی تقدیر کے تعیّن کرنے کا پلیٹ فارم ہے۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس کھیل کے دوران کوئی یہ شکوہ نہیں کرتا کہ یہ سب تو پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کھلاڑی کو معلوم ہے کہ وہ تحریر یا سوفٹ ویئر محض کھیل کے پیرائے اور قواعد و ضوابط ہیں جو کسی کی فتح اور شکست پر اثر انداز نہیں ہو سکتے بلکہ یہ نتائج بہم پہنچانے کے ایسے ذرائع ہیں جو کھیل کے عملی ماحول میں غیر متعلق اور غیر موثر ہیں۔ یہاں کھلاڑی کی "قسمت" تحریر تو ہوتی ہے لیکن ایک لچکدار یا خام شکل میں جس کو اچھی یا بری شکل کھلاڑی اپنے عمل کے محدود اختیار سے دیتا ہے۔ عمل کی محدودیت کی وضاحت یہ ہے کہ کھلاڑی پروگرامر کے متعین کیئے ضوابط میں ہی تصرّف کرتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ کسی بھی آن لائن کھیل کا پروگرامر اگر چاہے تو اس کھیل میں مداخلت کر کے اس کے پیرائے تبدیل کرنے کی صلاحیت اور قوّت رکھتا ہے کیونکہ وہ اس کے رموز کا خالق ہے، یہ اہم نکتہ ہے۔

لوحِ محفوظ کی تحریر کے پیرائے

اب آگے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ایک حسّاس مسئلے پر ایک مفروضے کے تحت تفکّر کا حاصل ہے جس کا مقصد مثال کے ذریعے کسی پیچیدہ مظہر (لوحِ محفوظ) کی تشریح ہے۔ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ہم کو خالق کے ماحول یعنی عدم کا جو کائنات اور ہماری عقل سے ماوراء ہے نہ علم ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہاں ہمارا محدود موضوع اور مقصد انسانی عمل کے تئیں تقدیر اور لوحِ محفوظ کے ممکنہ پیرائے کی تفہیم ہے تا کہ شیطانی وسوسوں کا رد ہو۔ اس مفروضے کے سو فیصد درست ہونے کا دعویٰ نہیں۔

ابتدا ہم قرآن کے ایک ارشاد سے کرتے ہیں۔

"دنیا کی زندگی کچھ نہیں مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا ہے۔ (قرآن۔الحدید ۵۷:۲۰)

اس فرمان کی روشنی میں ہم آگے بڑھیں گے۔
اب قلم اور تحریر کی اہمیت دیکھیئے کہ خالق کہتا ہے:
"قسم ہے قلم کی اور اسکی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (قرآن۔ القلم ۶۸:۱)
یہ بھی یاد کریں کہ العلیم نے۔۔۔ عالَم سے پہلے قلم تخلیق کیا اور کائنات کی ابتدا سے اختتام تک کے امور لکھا دیئے۔ (ترمذی)
قلم جس نے خالق کے اِذن سے وہ سب کچھ لکھا جو کہ اس کائناتی نظام کا مقدّر رہونا تھا۔
ہماری دلچسپی اس امر میں ہے کہ اس تحریر کی ماہیت کیا ہو سکتی ہے؟
قرین قیاس یہی ہے کہ عالمِ عدم کی یہ تحریر بہت سی جہتوں میں معیّن اور بہت سے پیرایوں میں نرم و لچکدار قواعد و ضوابط کا عظیم الشّان سوفٹ ویئر طرز کا پروگرام ہے جسکی جہتیں لامحدود ہیں اور جو لوحِ محفوظ میں مرقوم و مندرج ہوا۔ اگر ہم لوحِ محفوظ میں مرقوم اُن اندراجات کو جو انسانی عمل اور اس کی قسمت کے حوالے سے ہیں اوپر مذکورہ گیم کے سوفٹ ویئر کے پیرائے کے تیئں سمجھنے کی کوشش کریں تو جبر و قدر اور تقدیر کے حوالے سے ہمارے بہت سے ابہام، مغالطے اور مخمصے حل ہو سکتے ہیں۔

اعمال اور لوحِ محفوظ کا تعلق

یہ غالباً ایسا ہی کچھ " سوفٹ ویئر " جیسا پروگرام ہے جو انسانی تصوّر سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ کائناتی ماحول کے بموجب لامحدود پیرایوں، جہتوں اور زاویوں میں ہماری فہم سے بالا ایک فعّال ترتیب، جس میں انسانی خواہشات، اعمال، جذبات اور گمان سے منسلک لاتعداد مرئی اور غیر مرئی مظاہر ہیں جو ردِّ عمل کی بے پایاں جہتیں لیئے ہوتے ہیں اور جن کے حوالے سے لوح محفوظ میں درج قوانین فعّال ہو کر ہمارے اعمال پر لاگو ہوتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر یہ کائناتی سسٹم رواں دواں ہے۔ یعنی ہمارے وڈیو گیم کے تناظر میں یہ دنیا بھی ایک گیم کا میدان عمل ہے۔ اس گیم کا مینوئل انسان کو مہیّا کر دیا گیا ہے اور اس کی تشریح کرنے والے بھیج کر اس " کھیل " کے سارے اصول و ضوابط کھول کر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان ایک " کھلاڑی " کی حیثیت سے متحرّک اور مصروف ہے۔ اس کھیل کا غیر مرئی یا پسِ پردہ حصہ لوح محفوظ میں درج پروگرام ہے جو اس دنیا اور انسان سے اندیکھے واسطوں سے منسلک ہے۔ یہ

اندیکھے واسطے ہمارے اعمال، جذبات، گمان اور انکے ممکنہ اثرات کی پس پردہ غیر مرئی تانا بانا ہیں (جیسا ہمارا وائی فائی WiFi سسٹم) جو لوح میں تحریر شدہ اُلوہی گرہوں یا انجانی منطقوں کے تئیں ہمارے موجودہ اور آگے کے معاملات کو کوئی شکل دیتی رہتی ہیں۔ انسان کے اطراف موجود تمام طبعی، سائنسی، فطری قوانین یا جو نام آپ دیں یہ سب بھی خام شکل میں لکھی ہماری تقدیروں کے پیرائے ہیں جن پر انسان کو تصرّف ہے کہ حالات کو من مانی شکل دے۔ انسان اپنی عقل و دانش اور تجربات سے ان قوانین کے نتائج کو دریافت کر کے فوائد اٹھاتا ہے۔ یہ قوانین روزمرّہ کے کسی مخصوص یا متعین عمل سے منسلک خام تقدیر کے کسی محدود پیرائے کو ٹھوس شکل دیتے رہتے ہیں۔ راحت، شہرت، شہوت، عیش وطرب، ذمہ داری اور غلبے کے حصول کے نو بہ نو پیرایوں میں خواہشات کی بیداری کے ساتھ صحیح غلط، جائز ناجائز عمل کے آپشن کھل جاتے ہیں۔ خواہشات کی تکمیل میں یہ عمل ہی ہے جو نتائج کی مثبت یا منفی گرہوں کو کھولتا ہے وہی خیر اور شر کے پیرائے بناتا ہے۔ گویا خالق کے عطا کردہ پیرایوں میں ہم اپنی قسمت خود بناتے ہیں۔ یعنی ہر انسان اس کائنات میں عمل اور ردِّ عمل کی نقش نگاری کر رہا ہوتا ہے اور اسی لیئے اسکے اعمال اور انکے نتائج کو ہی کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔ یعنی لوح محفوظ کی خالی لائنیں fill-the-blanks جن کو ہمیں بھرنا ہے۔

اعمال و نتائج

گمان یہ ہے کہ صحیح اور غلط اعمال کی ماہیت اور قوانین کے طابع ان کے نتائج بھی لکھے ہوئے ہیں مگر غالباً اس طرح جیسے کہ: " اگر ہوا، روشنی موجود اور زمین زرخیز ہے تو۔۔۔ بیج بونے سے۔۔۔ اور بعد میں پانی دینے سے۔۔ کونپل نکلے گی، پودہ بنے گا، پھر درخت بنے گا اور پھل دیگا،" یہاں عمل اور نتیجہ درج ہے مگر شرائط کی گرہوں کے ساتھ۔ گویا اس عالم (دنیا) میں کوئی بیج بوتا ہے (عمل) تو اُس عالم (لوح محفوظ) میں اسکے کونپل بننے کے عوامل فعال تو ہو جاتے ہیں لیکن اس میں باقی لوازمات کے پورا ہونے کی گرہیں لگی رہتی ہیں یعنی ہوا، روشنی اور زمین کا زرخیز ہونا اور پانی دینا۔ لہٰذا جو بھی بیج بوئے گا، پانی دیگا وہی پھل پائے گا مگر بنجر زمین پر یہ عمل اکارت جائے گا! لیکن اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ مخلوق کو پھل ملنا ہے تو بارش سے پانی مل جائے گا۔ اب جب تک درخت ہے تو اس کے سائے اور پھل سے ملنے والے اجر کا حساب لکھا جا رہا ہے۔ مگر کوئی دوسرا شخص اس درخت کو کاٹتا ہے تو اسکی لکڑی سے متعلق خیر اور شر کے پیرائے فعال ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے جذبات کہ کسی کی طرف ایک غصیلی نظر اس کے اندر خوف، سرنڈر یا انتقام کے جذبات پیدا کرتی ہے، تو ماں کی مسکراہٹ کی تھپکی کسی میں اعتماد کی روح پھونک دیتی ہے۔ شفقت، عفو و درگزر، محبت، نفرت، کینہ، عداوت، سخاوت وغیرہ کی جذباتی لہریں اطراف کے اذہان پر اور خیالات میں سرایت کر کے بطور ردِ عمل افراد کی افتادِ طبع کے تئیں خیالات اور خواہشات کو جنم دیتی ہیں جو کمزور اور طاقتور ردِ عمل کا سبب بنتے ہیں۔ غرض یہ عمل اور ردِ عمل کی لامتناہی لہریں ہیں جو انسان کے اطراف ایک غیر مرئی خاموش سمندر موجزن کیئے رہتی ہیں لیکن ہر عمل کی ہر لہر انسان کی تخلیق ہے جو لوحِ محفوظ میں خالق کی چھوڑی جگہوں کو پُر کر رہی ہیں۔

یہ کائناتی سسٹم غیر جانبداری کے ساتھ ہر بشر کے لیئے کھلا ہے۔ خالق نے فرمادیا کہ:
"انسان کے لیئے وہی ہے کہ جس کی کوشش کرتا ہے۔ (قرآن النجم ۳۹:۵۳)
جو لوگ معیّن تقدیر کے حوالے سے مخمصوں میں گھرے ہیں وہ صرف اس پر غور کریں کہ اگر انسان کے اعمال بھی لوحِ محفوظ میں درج ہوتے تو اللہ قرآن میں یہ کیوں فرماتا؟
قرآن: (سورۃ ق ۵۰، آیات ۱۷۔۱۸) "دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔"

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھا ہے تو ہمارے دائیں بائیں بیٹھے نیکی اور بدی کے فرشتے کیا کر رہے ہیں۔ یہی ثابت ہوتا ہے کہ شعوری دنیا میں انسان کو عمل کی آزادی دیکر اسکور ریکارڈ کرنے والے متعیّن کر دیئے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر انسان کی تقدیر لکھی تو ہے لیکن ویسی نہیں جیسی کہ ہماری عام تفہیم ہے بلکہ اس میں انسان سے متعلق بہت سے عوامل سیّال شکل میں ہیں جنکی حتمی ٹھوس شکل ہم اپنے عمل سے بناتے ہیں۔ انسان جان لے کہ انسانوں سے باہمی معاملات اور رشتوں میں اس کا ہر ہر عمل ایک ردِ عمل رکھتا ہے جو اس کا مثبت یا منفی اکاؤنٹ ہے۔ انسان کے اچھے برے اعمال اپنا اثر چھوڑتے ہیں اسی طرح انسان کے منفی و مثبت جذبات اور اچھے برے گمان بھی قوّت رکھتے ہیں اسی لیئے اپنے ردِ عمل بھی۔ یعنی ہمارے اعمال اس نظامِ حیات میں سرایت کر کے اس کے مختلف گوشوں کی اچھی یا بری شکل ترتیب دیتے رہتے ہیں جن

کے اثرات کے تئیں ماحول میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جس سے ہمیں اور دوسروں کو خوشی، غم، ترقی وتنزلی، راحت اور تکلیف وغیرہ ملتی رہتی ہے۔ گویا انسان کو یوم حساب کے حوالے سے اپنے معاملات کے بموجب فیصلہ کرنا اور کسی عمل کو اختیار کرنا ہے جس کے اچھے اور برے پیرائے اور نتائج بتادیئے گئے ہیں۔

ناگہانی آفات

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوشش اور محنت کا مناسب پھل نہیں ملتا بلکہ غیر متوقع حالات اور ناگہانی آفات کا سامنا ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے انسان تذبذب میں مایوس ہوکر شکوہ کرتا ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہونا تھا میں نے تو کوئی غلط نہیں کیا، میں نے تو کسی کا برا کبھی نہیں چاہا تو میرے ساتھ ہی بُرا کیوں ہوا یا برا ہوتا ہے؟ why-me؟ وجہ یہی ہے کہ ہم اس نظم کی پیچیدگیوں کو جان نہیں پاتے۔ سمجھنے کا نکتہ یہی ہے کہ یہ قدرتی حوادث اور گزرے ہوئے اور موجود انسانوں کے ہر اچھے اور برے اعمال کے ردِعمل اور اثرات بھی ہیں جو اپنی نوعیت کے حساب سے کسی نہ کسی طرح اچھے یا برے حالات کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ رکاوٹیں، غیر متوقع بُرا اور کٹھن وقت بھی شاید ہم سے پہلے یا ساتھ موجود کسی نہ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کے عمل کے اثرات کا پرتو ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ غالباً اسی کے بارے میں خالق کائنات نے فرمایا کہ:

(الشوریٰ:۳۰): ''اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سارے (گناہوں) سے تو وہ (اللہ تعالیٰ) درگزر کر دیتا ہے''

(الروم:۳۶) "۔۔اور جب انکے اپنے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک مایوس ہونے لگتے ہیں"

(الروم:۴۱): ''خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی (اعمال) کے سبب خرابی پھیل رہی ہے ....۔"

قرآن کے مذکورہ بالا فرمان لوح محفوظ کے پیرایوں کے بارے میں ہماری تشریح کو تقویت دیتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقدر کی اس پس پردہ تحریر کا انسان کے شعوری اعمال کے اچھے برے انجام پر براہ راست کوئی اثر نہیں آپ چاہیں تو پانی پی لیں یا چاہیں تو پھینک دیں چاہیں تو

انتقام لیں یا چاہیں تو معاف کر دیں چاہیں تو بوئے ہوئے بیج کی دیکھ بھال کریں یا نہ کریں۔

قسمت کا لکھا اور ہمارا رویہ

یہ جملہ ہم اکثر سنتے ہیں کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہے۔قسمت کے متعلق ایسے دھندلے عقائد کی وجہ سے اکثر لوگ کوشش نہیں کرتے بلکہ سب قسمت پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جو لکھا ہے وہ ہو جائے گا۔اس سوچ نے نقصان پہنچا کر اکثر مسلمانوں کو بے عمل بنایا۔ ہمارا مشیئت یعنی اللہ کی مرضی کا تصور ابہام لیئے ہوئے ہے۔اللہ ہر وقت ہمارے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا بلکہ اس نے اپنی مشیئت کو ایک مربوط پروگرام کی شکل دیکر لوح میں محفوظ فرما دیا۔اب سب کچھ انہی قوانین کے تحت ہی ہونا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے بے شک اللہ کی مشیئت ہے لیکن اس مشیئت کا حصول ہمارے ارادے اور عمل سے منسلک ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں کے لیئے اس دنیا میں کچھ نہیں خواہ وہ کتنا اچھا مسلمان ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس دنیا کی تخلیق اور انسان کی نیابت کا منطقی مطلب حصول علم اور عمل ہے۔کسی فرد کے ساتھ ہونے والے غم واندوہ اور ناگہانی حالات پر یہ کہا جانا کہ یہ قسمت میں لکھا تھا ،یا یہی مشیئت الٰہی تھی ،یا اس میں کوئی بہتری ہوگی ، effective-theory کے بموجب ہی درست ہے کیونکہ ہمارا علم ان واقعات کی اصل وجہ جاننے سے قاصر ہوتا ہے۔ہاں، مگر یہ ایک موئثر نفسیاتی سیفٹی والو ضرور بنتا ہے جو ایک انسان کے اندر کے جذباتی تلاطم ، مایوسی اور بے چینی کے غبار کو خارج کر دیتا ہے۔لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہم اللہ سے نیک گمان ہو جاتے ہیں اور اللہ اپنے فرمان کے بموجب حالات کو بدلنے کی طرف توجہ کرتا ہے۔اس کا یہ فرمان یاد کریں جو کچھ ایسا ہے کہ:

"میرا سلوک بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق ہوتا ہے۔"

توبہ، دعا، خیرات، استخارہ اور مکافاتِ عمل

جیسا کہ ہم نے جانا ایک گیم کا پروگرامر جاری وساری گیم میں نفوذ کر سکتا ہے اور پروگرام کے پیرائے بدل سکتا ہے ویسا ہی کائنات کا خالق کرتا ہے کہ مرضی سے عنایت بھی کرتا ہے سزا بھی دیتا ہے۔ اس نے کمال مہربانی سے اپنے بندوں کو برے اعمال کے نتائج وعواقب سے بچنے کے ٹول tools بھی دیدیئے ہیں اور وہ ہیں توبہ ، دعا ، خیرات اور استخارہ جو انسان کے اپنے اور گزر جانے والے انسانوں کے غلط اعمال کے تئیں ایک سسٹم کے تحت آنے والے انجانے حوادث

کے آگے ڈھال بن جاتے ہیں۔ اسی لیئے صدقے کو ڈھال ہی کہا گیا ہے۔ دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ مثبت اور منفی رجحان کے اولوالعزم لوگ ایسے نقش چھوڑ جاتے ہیں جو بہت دیر تک حالات اور دوسرے انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز رہتے ہیں اور ان کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً انسان کی فلاح اور بربادی کے کام جیسے غریبوں کے لیئے ہسپتال کی تعمیر یا ایٹم بم گرانا، ایک غریب بچّے کو دلائی ہوئی اعلیٰ تعلیم یا کسی گھر کے کفالت کرنے والے کا قتل، کسی یتیم خانے یا پھر کسی شراب خانے کی تعمیر، کسی پریشان حال کی کایا پلٹ موئثر مدد اور جیسے صدقات جاریہ اور گناہِ جاریہ وغیرہ۔ یہ دوررس نتائج کے حامل ایسے اعمال ہیں جن کے مثبت و منفی اثرات کا شمار ہمارے پاس نہیں لیکن رب کے پاس ہے۔ عدم میں ہر انسان کے اعمال کا فرداً فرداً ریکارڈ روم ہے۔ موت کے ساتھ انسان اپنے اپنے اعمال کے حوالے سے بہت سے نامکمل نتائج لیکر یہاں سے رخصت ہوتے ہیں اس جگہ کے لیئے کہ جہاں ہمارے تمام اعمال کی منصفانہ جانچ ہوگی اور ادھورے حاصل کردہ نتائج کو اجر سے مکمّل کر دیا جائے گا کہ انصاف ہو جائے۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک بے سینگ کی بکری کو زندہ کر کے اسے سینگ عطا کیئے جائیں گے کہ اپنا بدلہ لے لے، یہ ہے اس عالیشان انصاف کی ایک جھلک۔ یہاں پر مسلم اور غیر مسلم کی بحث میں نہ پڑا جائے کیونکہ سب مخلوق تو اُسی کی ہیں اور اللہ کے انصاف کے پیرائے ہم سے مخفی ہیں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اللہ شاید منکر کی سزا کی ماہیت تبدیل کر دیگا کہ وہ مطمئن ہو جائیں گے یا جو اس کی مرضی۔

خالق کا علم اور جزا و سزا

اب ایک دوسرے پہلو کو سمجھنا ہے کہ جب خالق جانتا ہے کہ ہم کیا اعمال کریں گے تو پھر جزا اور سزا کیسی! خالق کا علم برتر ہی نہیں لامحدود ہے جس کے باوصف اسے قدرت حاصل ہے کہ اپنی مخلوق کے آئندہ کام کو جان سکے: اللہ نے اپنی قدرت بتادی کہ وہ قلب میں ابھرنے والے وسوسوں کو بھی جانتا ہے لیکن اس کا تعلق عدم کے جدا اور مخفی ماحول سے ہے۔ مگر ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ وہ انسان کے فوری یا کسی بھی ردّ عمل کو جاننا چاہتا ہے یا نہیں۔ ہمارا امتحان تو ہمارے شعور اور عمل کے حوالے سے ہے خالق کے علم کے حوالے سے نہیں جو ایسا علم ہے کہ مخلوق کے اختیارِ عمل پر کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ لہٰذا یہ مسئلہ یا سوال بھی ہمارے لیئے غیر متعلق irrelevent ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا تعلق عدم کے ماحول ہے۔ جزا اور سزا کے حوالے سے اس کا سادہ سا

جواب یہ ہے کہ اللہ کی مرضی یا اسکا مربوط پروگرام یہی ہے کہ انسان کو عقل، آزاد ارادہ اور عمل کی قوت دیکر آزمائے پھر جزا اور سزا دے۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم کو انسان پیدا کیا گیا، اس حد تک اسے فطرت کا ایک جبر ہی سمجھ لیں کہ ہم خواہ چاہیں یا نہ چاہیں اس سسٹم کا حصّہ ہیں۔ اسے خالق کا ایک سنجیدہ کھیل سمجھیں یا کچھ اور مگر اب انسان کو ان قواعد کی پابندی کرنی ہی ہے جو پہلے ہی بتا دیئے گئے ہیں۔ اہم تر نکتہ یہ ہے کہ اگر بےلباسی اور برہنگی خالق کو ناراض کرتی ہے اور لباس پہننا اسکی خوشی کی نوید ہے کہ جس کا ہمیں علم بھی ہے تو یہ تو ہمارے اختیار میں ہوا کہ اسے ناراض کریں یا خوش! یہی ہمارا امتحان ہے جس پر ہمارے دائمی مستقبل کا انحصار ہے۔

مختصراً اس جبر وقدر کے مسئلے میں مذہب ہی ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کرتا ہے۔ یہاں تک تو سائنس کی بات درست ہے کہ کائنات میں وقوع پذیر ہر عمل اور تبدیلی فطری یا طبعی قوانین کی پابند ہے لیکن انسانی ارادے اور عمل کے تعلق کے حوالے سے معلق سائنسی مخمصہ مذہب یوں سلجھاتا ہے کہ: "انسان بہ حیثیت ایک روح، ایک ذہن یا ایک شخصیت کے ان خواہشات میں سے جو کہ اطراف کے ماحول کی اثر انگیزی یا کسی ردِعمل سے ذہن میں خیالات کی شکل میں ابھرتی ہیں جب کسی کو اختیار کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر طبعی قوانین ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حرکت میں آتے ہیں گویا ماحول یا دوسرے عوامل کے اثر سے صحیح یا غلط دونوں طرح کے خیالات کا ظہور پزیر ہونا فطری قوانین کے تحت ہی ہوتا ہے لیکن ان کی حیثیت محض سیّال اور غیر فعّال ہوتی ہے جو انسانی ارادے کے زیرِ نگیں ہوتے ہیں پھر انسان اس میں سے کسی کو اپنی خواہش سے پسند کرتا ہے تو دماغ اور جسم کو اس کام کا حکم دیتا ہے اور پھر وہ ارادہ ایک آزادانہ عمل کی شکل میں ظہور پزیر ہوتا ہے۔"

یہ تشریح نہایت عملی ہے یہ حقیقی تنبیہ بھی ہے جو انسان کو مطلع کرتی ہے کہ اس کے اعمال اس کے ارادے کے طابع ہیں اور ہر غلط عمل کا جوابدہ انسان ہے کیونکہ معاملات میں وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس طرح یہ عقلی منطقی اور مبنی برانصاف تشریح ہوئی۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ لوحِ محفوظ ایک پزل puzzle ہے جس میں انسان کے عمل کے حوالے سے خالی جگہیں ہیں جن کو انسان اپنی مرضی سے پُر کرتا ہے۔ لیکن عمل کے انجان راستوں کا یہ پُرخطر سفر عافیت والا ہوسکتا ہے کہ جب

انسان خالق کے احکامات پر عمل کرے، اللہ سے تعلق کو عبادت سے مضبوط کرے اور ناگہانی سے بچنے کے لیئے قرآن و اسوۂ رسول اکرم ﷺ سے مدد لے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ مزید مدد لے دعا، استغفار، استخارہ، صدقات وخیرات سے۔

ان گزارشات سے یہ ظاہر ہوا کہ ہم اپنے عمل کے اختیار کے حوالے سے بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے ارادے اور عمل میں آزاد ہیں اور ایسے اعمال جو کُلی طور پر ہم پر منحصر ہوتے ہیں ان کے تیئں اپنی قسمت کے پیرائے خود متعین کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ مشیّتِ الٰہی بھی ایک اہم عنصر ہے کیونکہ خالق فعّال ہے۔ اور وہ تقدیر کے بہت سے رخ خود بھی مقرّر کرتا ہے مثلاً پیدائش، عمر اور موت کے پیرائے وغیرہ۔

باب ۱۸

حاصل مطالعہ

اس مطالعہ کا مقصد انسان کے بنیادی سوالات کے علمی اور منطقی جوابات کی تلاش تھی۔ ہمیں یہی دیکھنا تھا کہ اگر یہ کائنات ایک عظیم تر سائنس کی مظہر ہے تو یقیناً ایک خالق کی تخلیق ہے اور کون سا مذہب اس عظیم تر سائنس کا حقیقی نمائندہ ہوسکتا ہے۔ شواہد نے اسلام کی طرف اشارہ کیا کیونکہ یہ وہ واحد مذہب ہے جس کے پاس جدید ترین الہامی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعے نے بھی ثابت کیا کہ اس میں نہ صرف سائنس کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اس میں کچھ ایسی معلومات بھی ہیں جہاں پر ابھی سائنس صرف نظریات کی حد تک قرآن کی ہم زبان ہے۔ ہمارا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ الہامی کتاب قرآن نے مذہب کے بارے میں مشہور کیے گئے غیر حقیقی اور تعصب پر مبنی خیالات بدل ڈالے ہیں، یعنی اسلام نے انسانی ترقی اور دینی ارتقاء کو اس طرح اپنے اندر سمیٹا ہے کہ مذہب کے بارے میں ایک انقلابی نظریہ سامنے آ رہا ہے۔ ہم نے اسلام کو ایک عظیم تر سائنس کا نمائندہ سمجھ کر قرآن کا مطالعہ کیا تو اس نے بہت سے مخمصوں کو دور کیا جس سے ہم نے سائنس کا حقیقی مقام سمجھا کہ عظیم تر سائنس کی تشریح ہی انسانی سائنس ہے۔ انسان کی حیثیت کا اہم سوال بھی اسلام نے احسن طور پر حل کیا اور انسان کو خالق کا نائب قرار دیکر ارفع مقام عطا کیا۔ یہاں واضح ہو کہ سائنسدانوں اور مذہب میں بڑا اختلاف یہ ہے کہ سائنسداں اصرار کرتا ہے کہ انسان جانور سے ترقی کر کے انسان بنا جبکہ مذہب اس کو آسمان سے اُتری مخلوق قرار دیتا ہے۔ یہ بڑا تضاد ہے اور ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں ایسی کوئی دریافت سامنے آئے کہ مذہب کے نقطۂ نظر کی جیت ہو کیونکہ ارتقاء کے نظریئے میں جھول غالباً اسی لیئے ہیں کہ جدید علوم حالات کی صحیح تصویر کشی نہیں کر پا رہے یا اس پزل کے پرزے ٹھیک ٹھیک نہیں بٹھا پا رہے۔ نیچرل سلیکشن تو جاندار کو بہتری کی طرف لیجاتا ہے پھر جانور سے زیادہ انسان میں بیماریاں کیوں پیدا ہو رہی ہیں! ہر جاندار کی مادہ آسانی سے بچہ جن دیتی ہے لیکن ارتقاء میں عورت دردِ زہ میں مبتلا کیوں ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بھی طبعی عوامل ہیں جو جانور کے لیئے زیادہ آرام دہ

ہیں بہ نسبت انسان کے جیسے موسم کی سختی جانور فطری طور پر جھیل جاتے ہیں لیکن انسان نہیں۔ ایسے بہت سے عوامل یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام نے انسان کو خالق کے نائب کی جو خصوصی حیثیت دی ہے اور اسکی ساخت کی جس برتری کا دعویٰ کیا ہے وہی قرین قیاس ہے اور اس کی سائنسی تصدیق مستقبل میں نظریۂ ارتقاء کی مزید وضاحت کردیگی۔ اسلام کائنات کو ایسے نظام کے طور پر بتاتا ہے جو عظیم تر سائنس پر مشتمل ہے اور عظیم تر علوم کا منبع اللہ کی ذات ہے گویا وہ اس سارے نظام کے خالق اور ناظم ہیں۔ یہ انتہائی عملی تصور ہے جو ہمارے ہر مسئلے اور سوال کا جواب رکھتا ہے۔ تخلیق کے حوالے سے ہمارا مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ انسانی علوم اس عظیم تر سائنس کے آگے محض طفلِ مکتب ہی ہیں، خالق کی سائنس اور مخلوق کی سائنس میں فرق یہ ہے کہ خالق تو نیست nothing سے تخلیق کرتا ہے جبکہ مخلوق چیز thing سے تخلیق کرتی ہے۔ اب اسلامی نظریۂ حیات کی جامعیت دیکھیے وہ ایک زبردست نظامِ قدرت کو مکمل عقلی بنیاد پر سمجھاتا ہے۔ اسلام میں طبعی اور غیر طبعی عناصر کی تشریح کرنے کی صلاحیت ہے یعنی یہ سائنسی نظریات اور خیالات کی نہ صرف تائید کرتا بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ان جہتوں کی طرف بھی انسان کو مائل کرتا ہے جہاں سائنس ابھی صرف تصور میں ہی پہنچی ہے۔ اسلام انسان کی اخلاقی تربیت کے ساتھ اُس دوسری دنیا کے متعلق بھی معلومات فراہم کرتا ہے جس کا تعلق مابعد الطّبعیات سے ہے گویا یہ ایک ایسا مکمل اور سائنٹفک مذہب ہے جو کائناتی علوم کے اشارے لیئے ہوئے ہے۔ اسے دینِ فطرت یعنی Natural Religion کہا جاتا ہے۔ اس نظریۂ حیات میں طبعی اور غیر طبعی دنیا کا حسین امتزاج ہے جہاں پر سائنس اور مذہب کا کوئی ٹکراؤ ہے ہی نہیں۔ اسلام اپنے آپ کو صرف مذہب ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک نظریۂ حیات کہتا ہے۔ سائنس درحقیقت اسلام کا ہی حصہ ہے وہ اس لئے کہ اسلام اس کائنات کے خالق کا نمائندہ ہے۔

خدا کا طبعی ثبوت

مزید یہ کہ اس مطالعہ میں اللہ کے حوالے سے کسی طبعی ثبوت کا دیرینہ مطالبہ بھی پورا کردیا گیا ہے کہ فی الوقت قرآن وہ واحد طبعی ثبوت ہے جو مخلوق اور خالق کے درمیان موجود ہے۔ اسلام قرآن کے "مصنّف" کے حوالے سے یہ ٹھوس سائنسی اور منطقی استدلال رکھتا ہے کہ وہ مابعد الطبعیّات سے تعلق رکھنے والی ایک لامحدود اور زندہ ہستی کا کلام ہے جسے انسان کے ذہن میں اتار کر کاغذ پر منتقل

کیا گیا۔ گویا قرآن وہ نورانی کڑی ہے جو فزکس اور میٹا فزکس کی کائناتی زنجیروں کو جوڑتی ہے۔

اقدار اور اخلاق کی تباہی

سائنس لحظہ بہ لحظہ بدلتے نت نئے نظریات کے ساتھ آگے بڑھتی رہتی ہے اسی لیئے سائنس ایسے اٹل نظریات ابھی تک نہیں دے سکی جن پر جدید لادینی نظریات کی عقلی واخلاقی عمارت کھڑی کی جا سکے۔ جدید نظریات انسان کو تاریخ اور وقت کے بہاؤ میں ایک بُلبلہ بتاتے ہیں جو ایک حادثہ کے تحت نمودار ہوا اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گا۔ ہم نے اہم مغربی فلسفے کی بھی، کہ جس پر جدید معاشرے کی تعمیر ہو رہی ہے، خالص سائنسی اور منطقی بنیادوں پر چھان بین کی اور انہی بنیادوں پر اس میں گہرے سقم تلاش کیئے جس سے اسکی سائنسی بنیاد ہی مشکوک ثابت ہوئی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ نظریہ ارتقاء انسان کے حوالے سے ایک سائنسی واہمے کی شکل اختیار کر گیا ہے جو خدا کے انکار کو عقلی جواز مہیا کرنے کے لیئے اپنایا گیا ہے، یہ نظریہ حیوانات ونباتات تک تو درست ہوسکتا ہو کیونکہ یہ تحقیق اور علم پر مبنی ہے لیکن اس میں انسان کو زبردستی گھسیٹنا بدنیتی پر مبنی لگتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ خدائی رہنمائی ہی انسان کے لیے مشعل راہ ہے جس نے اقدار اور اخلاق کی تعمیر کی اور صحیح اور غلط کی تشریح کی ہے۔ یہ صرف خدائی علم ہے جو کہ ہر دور پر حاوی ہے اور اسی کو اختیار ہے کہ انسانی اخلاق ومعاشرتی رویوں کو متعین کرے۔ جدید معاشرتی نظریات انسان کو نہ تو ٹھوس حیاتی فلسفہ دیتے ہیں اور نہ ہی اخلاقیات کی کوئی مستند بنیاد بتاتے ہیں بلکہ خود انسان کو ہی عظیم تر قرار دے کر اسے جمہوریت کے ذریعے ہر قانون اور اخلاق کی تشریح کا خوگر بناتے ہیں۔ اگر انسان اپنے آپ کو صرف طبعی ماحول سے جوڑتا ہے تو اخلاقیات کی وہ تمام بنیادیں اپنا جواز کھو دیتی ہیں جو الہامی احکامات کی روشنی میں متعین ہوئی ہیں۔ یہ نقطۂ نظر انسان کو خود غرض بناتا ہے اور وہ دنیاوی فائدے اور ذاتی ہوس میں غلطاں ہو کر کوئی بھی غلط طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے وہ دوسروں کے حقوق و جذبات کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا کیونکہ اس نظریہ میں خدا کو جوابدہی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جدید لامذہب فلسفہ انسانیت کی رہنمائی کے ارفع مرتبہ پر فائز ہونے کا اس لیئے اہل نہیں کیونکہ اس کی بنیاد غیر عقلی ہے اور معاشرتی نظم میں ان کی برتری نے کچھ ہی عرصے میں کچھ مروجہ اخلاقی اقدار اور انسانی رویّوں کو تبدیل کرنا شروع کیا۔ اس کی مثال وہ مغربی ممالک ہیں جہاں پر اب ایسے قوانین بن چکے ہیں جس میں مرد کی مرد سے شادی قانونی

قرار دے دی گئیں، جہاں مرد اور عورت بغیر نکاح کے قانونی طور پر رہ سکتے ہیں!اب آگے مزید کیا ہوسکتا ہے عیاں ہے۔ کیا انسان حیوان بنکر قابلِ احترام رشتوں کی تمیز ختم کردے؟ بطور انسان ہم سب عقل کے خوگر تو ہیں لیکن وہ عقل لامحدود تو نہیں پھر ہم کیسے اہل ہو سکتے ہیں کہ اخلاقیات کے نئے قوانین تخلیق کریں یا معاشرے کی بنیادیں ہی بدل دیں۔ قرآن انسان کو منطقی ابتداء، منطقی حال اور منطقی اختتام وانجام سمجھاتا ہے جو عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ یہ حقوق اور ذمہ داریوں کا شعور دیکر انسان کو ذمہ دار زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے جس میں مخلوق سے محبت اور رواداری کا درس ہے۔

آفاقی نظریۂ حیات

موجودہ دور میں بہت سے مذاہب کے پیروکار سائنس کی زبردست اور بے دست و پا کردینے والی قوت کے آگے بے یارو مددگار ہیں۔ دراصل یہ مذاہب پچھلے ادوار میں صرف اخلاقی تربیت کے لئے ظاہر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مذاہب سائنس کی خیرہ کن ترقی اور انسانی خیالات پر اس کا زبردست حملہ برداشت نہیں کر پارہے جسکی وجہ سے ان کے پیروکار رفتہ رفتہ مذہب سے دور ہوتے جارہے ہیں اور لامذہب ہوکر سائنس کو ہی بحالتِ مجبوری نیا رہبر تسلیم کررہے ہیں۔ جدید محققین اور سائنسدان جو خالص طبعی بنیادوں پر ہر مسئلہ کا حل تلاش کرتے ہیں انہوں نے اپنے ذہن کو خدا مان لیا ہے۔ یہ ذہین، قابل مگر مخصوص میں مبتلا افراد دراصل احساس برتری کا شکار ہوکر اپنے علم پر نازاں ہوتے ہیں اور مذہب کو تعصب کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہر مذہب کو دقیانوسی قرار دینا انکی مجبوری بن گئی ہے۔ وہ اسلام کا بھی ایک مخصوص ذہنیت کے تحت ہی مطالعہ کرتے ہیں اور اسلام کو عام مسلمانوں کے طرزِ عمل اور کچھ انتہا پسند خیالات کے آئینے میں پرکھتے ہیں اس طرح وہ اسلام کا غلط تاثر لیتے ہیں۔ ذیل میں ہم ایک آفاقی نظریہ بیان کرتے ہیں جو کائنات، انسان، اور زندگی کے حوالے سے قرآن پر مبنی الوہی اشاروں کی روشنی میں مرتب ہوتا ہے اور جو سائنس، عقل اور وحی کا مجموعہ ہے۔ یہ دینِ اسلام کو کائناتی نظم کے پیرائے میں سمجھنے کی محض ایک کاوش اور مجموعی طور پہ یہ اسلام اور کائنات کا سائنسی نقطۂ نظر سے ایک جائزہ ہے۔

اللہ کی فہم

اسلامی فلسفۂ حیات کے مطابق ہمارا خالق اللہ صرف اپنی صفات سے ہی جانا جا سکتا ہے۔ ہم جو

بھی الفاظ اس کے لیے استعمال کرتے ہیں دراصل وہ ہماری محدود سوچ کے دائرے کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ ہم سائنسی طور پر اس طرح ہی بیان کر پائیں گے کہ وہ زندہ ہستی ماوراء الفطرت ہے اور لامحدود ارادے کی حامل ہے۔ اللہ تمام شئے اور شعور سے بالاتر ہیں اور اگر ہم اپنے طبعی ماحول کے حوالے سے سمجھیں تو اللہ کوئی شئے نہیں ہے یا کوئی شئے اللہ کی ہستی کی طرح نہیں ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی اس کی طرح نہیں ہے تو دراصل ہم دو انتہائی مختلف مظاہر Penomena یا جہتوں Dimensions کا تقابل کر رہے ہوتے ہیں، مثلاً ایک پھل اور مشین یا کسی دھات کا تقابل اسی طرح ہوگا کہ کوئی پھل دھات کی طرح نہیں ہوتا ہے یا پھل کی طرح کوئی دھات نہیں ہے۔ یہاں پر پھل ایک مختلف شئے ہے لیکن تقابل میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ اتنا سمجھنے کے بعد ہم آگے بڑھتے ہیں اور خدا اور کائنات کو ایک اور پہلو یعنی وجود کی جہتوں کے حوالے سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

تخلیق

اللہ نے ایک مظہر Penomenon حصارِ وجود تخلیق کیا کہ جس کے اندر " انسانی متعلقہ وجودیت Human Related Existence" یعنی ایک احساس وجود کی تخلیق ہوئی۔ ایسا وجودی پیرایہ جو انسان اور دیگر مخلوق کے حواس سے منطبق اور ہم آہنگ compatible تھا۔ اس وجودیت کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے کل کائنات کی تخلیق کا ارادہ اس طرح کیا کہ کل کائنات ارادے کی قوت سے انسانی وجودیت Human Related Existence کے دائرے میں عیاں ہوگئی جس کے بنیادی عناصر "وقت اور شئے" Time & Space بنائے گئے پھر اس میں مرئی اور غیر مرئی عناصر کی تخصیص ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا، تمام طبعی اور غیر طبعی قوانین اور عناصر فطرت کے مطابق کائنات میں متعین ہوگئے اور ایک معین ارتقاء کی طرف گامزن ہوئے۔ یہ قوانین ہر جگہ اپنے متعین اصول کے مطابق نتائج پیدا کرتے ہیں ان قوانین کا ادراک ہی علوم قرار پایا۔ یہ تمام قوانین اٹل ہیں اور انسان ان کی ماہیت نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ انہیں تبدیل کر سکتا ہے۔ سائنس انہیں ہی Natural or Physical Laws کہتی ہے۔ Time & Space وقت اور شئے یا مادے کے بنیادی اجزا فوٹون Photon اور ایٹم Atom (ہمارے اب تک کے علم کے مطابق) بنے جن کی انفرادی اکائیوں سے خالق کی ہستی کا ایک غیر مرئی اور زبردست رابطہ ہے۔

کیونکہ ان کو اپنے خالق کا غیر معمولی ادراک دیا گیا ہے جو ہمارے شعور سے ماوراء ہے لہٰذا ہر ایٹم یا پارٹیکل خالق کے ارادے کا تابع ہے۔ اس لامحدود ہستی نے اپنی عظیم الشان خلاّقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ایٹموں سے بنیادی عناصر کی تخلیق کی جن کی خاصیت یہ رکھی کہ یہ آپس میں مل کر مختلف ذیلی عناصر کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ پھر ان عناصر کے آمیزے سے یعنی مٹی سے ایک انسان کا پتلا بنایا اور اس میں جان ڈالی۔ یہ جان گویا اس لامحدود ہستی کے کسی گوشے کا عکس ہے جو خالق کی بہت سی صفات لیکر انسان میں جلوہ گر ہوئی۔ اسی طرح ایک غیر مرئی دنیا کی بھی ساتھ ساتھ تخلیق ہوئی جس میں روشنی اور دوسری غیر مرئی لہریں اور آفاقی قوتیں شامل ہیں۔ اللہ نے ان تمام ارواح کو ایک ساتھ پیدا کیا جن کو آدم اور حوا کی نسل میں ظاہر ہونا تھا اور ان سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو سب ارواح نے اثبات میں جواب دیا۔ گویا وہ اقرار ایک پیدائشی تصور ہے جو انسان کی جین اور ذہن میں پیوست ہے اور ہر انسان خدا کے بارے میں تجسّس میں ضرور رہتا ہے۔ اللہ نے آدم یعنی پہلے انسان کو پوری کائنات میں موجود ہر چیز کا علم دیا پھر آدم کی جوڑ ایک عورت کی تخلیق کی تا کہ ان کی نسل آگے چلے۔ اس انسانی جوڑے کو اللہ نے تخیّل، حواس، شعور اور جذبات عطا کیے اور ان سب سے بڑھ کر عقل عطا کی جو انسان کو کائنات میں ممتاز کرتی ہے۔ انسانی جسم میں بہت سے خود کار نظام بنا دیئے گئے تا کہ انسان زندہ رہے اور اپنی نسل کو بھی ترقی دیتا رہے۔ انسانی جذبات میں مثبت اور منفی عنصر پیدا کیے گئے۔ انسان کو کائنات کے کُل علوم ودیعت کر دیئے گئے۔ یہ معلومات گویا ایک طرح ذہن میں منجمد کر دی گئی ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈی این اے میں انتہائی بھنچی یا کمپریسڈ شکل میں موجود ہیں۔ ان علوم کے مظاہر کائنات میں پھیلا دیئے گئے تا کہ ان کی تلاش انسان کو مصروف رکھے۔ انسان کے اندر تجسّس کی صفت رکھی کہ وہ خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کائنات کے علوم عطا کرنے کے بعد اللہ نے دوسری تمام مخلوقات سے انسان کو سجدہ کرنے کو کہا، ایک بہت قوّت والی مخلوق نے انسان کی برتری تسلیم نہیں کی اور خالق کی نافرمانی کی جس پر وہ معتوب ہوئی، لیکن اس نے انسان کو بھٹکانے کی مہلت مانگی جو اسے دے دی گئی۔ اب جو انسان اس شیطان کی پیروی کرے گا اس سے خالق ناراض ہوگا اور جو خالق کے احکام مانے گا وہ انعام پائے گا۔ انسان کو زمین پر اتارا گیا اس طرح انسان زمین پر ایک اجنبی مخلوق ہے جبکہ اس کا اصل مستقر اس کی جائے پیدائش ہے جہاں موت کے بعد دوبارہ

جاتا ہے۔ خالق کے عطا کردہ علوم کی طاقت اور خالق کی صفات کا پرتو ہونے کی وجہ سے انسان اللہ کا خلیفہ یعنی نائب قرار پایا تھا۔ انسان کو عطا کردہ صلاحیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ خالق کے نائب کی حیثیت سے وہ تقریباً ہر وہ ظاہر کام جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن انہی حدود میں جن کی کہ اللہ سے اجازت یا اسکی قدرت عطا ہوئی ہے یہاں تک کہ انسان کسی طرح کی "زندگی" بھی تخلیق کر سکتا ہے۔ کائنات کے خالق کی اپنے نائب سے یہ توقع ہے کہ وہ کائنات کی ہیئتِ ترکیبی کو سمجھ کر اپنے حال کو بہتر بنائے، ترقی اور خوشحالی حاصل کرے، اپنے خالق کو پہچان کر اس کی حمد و ثنا اور شکر کرے۔

سسٹم

کائنات کا نظام بے ترتیب نہیں ہے بلکہ اس نظام کے پیچھے گویا ایک عظیم سوفٹوئیر کی طرح کا لکھا ہوا یا غیر مرئی طور پر ترتیب دیا ہوا پروگرام ضرور موجود ہے۔ وہ کتاب جس میں سارے فطری قوانین کا اندارج ہے اسے قرآن نے لوحِ محفوظ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس ماوراء الوقت میں کائنات کے نظام سے متعلق اور بھی رجسٹر ہیں جن میں معلومات کا اندراج ہوتا ہے۔ یہ انتہائی ترقی یافتہ نظام ہے جو کہ سارے عوامل فطرت پر بہت سختی سے منطق ہے۔ اس میں طبعی قوانین کے آپس کے ٹکراؤ اور عمل و ردِ عمل سے متعلق مناسب ہدایات ہیں یعنی شعوری، فطری اور ماحولیاتی تبدیلیاں اپنے پیچھے بہت سے قوانین کے حوالے سے عمل اور ردِ عمل کا ایک مربوط ضابطہ رکھتی ہیں۔ سارے نظام کو بہ حفاظت چلانے اور انسان کے اعمال پر نظر رکھنے کے لیے ہر جاندار پر پہریدار مقرر کیے گئے جو غیر مرئی ہیں۔ وہ محافظ انسان کے اعمال بلکہ خیال کو بھی پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن صرف اعمال کا بارکی کے ساتھ ریکارڈ رکھتے ہیں کیونکہ انسان کو اسی کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ انسانی عمل اور خیالات کے حوالے سے بھی یہ زبردست نظام مربوط ہدایات کا منبع ہے یعنی انسانی اعمال اور اس کا ردِ عمل در ردِ عمل بھی سپر سائینٹفک طریقے پر مربوط کیا ہوا ہے اسی لیے ہر انسان اپنی کاوش کے حساب سے عموماً بدلہ پاتا ہے لیکن بہت سے دوسرے عوامل اس کی زندگی میں اس کی کاوشوں کا صحیح بدلہ ملنے میں رکاوٹ بھی بنتے ہیں جن کی بنا پر بہت سے انسان اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر بھی مناسب نتیجے سے محروم رہتے ہیں اسی لیئے اس کائنات کے اختتام پر ایک موازنہ ہوگا جس میں ہر شخص کے صحیح اور غلط اعمال کی جانچ ہوگی اور انصاف سے انسان کو بدلہ ملے گا۔ انسان کے ذہن کی ارتقاء اور عقل

کی ترقی کو انسانی تجربات اور کاوشوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا جیسے جیسے انسان تجربات حاصل کرتا ہے ویسے عقل اور ذہن ترقی کرتا ہے۔ انسان کو زمین پر اسی مقصد سے بھیجا گیا کہ وہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے خوبصورت نظام زندگی کے پیچھے کارفرما قوانین کو جانے اور عقل کو استعمال کر کے اپنے خالق کو پہچانے اور اس کی تحسین کرے۔ اس طرح انسان، اس کی فطرت کا تجسس، کائنات کے راز، انسانی کاوشیں ان کی کامیابیاں اور ناکامیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا جو کارگاہِ حیات ہے۔ کائنات میں حیوانات کی پیدائش پانی سے کی گئی اور ان کو مختلف شعور عطا کیے گئے۔

انسان اور تفکر

قرآن انسان کو تفکر کی دعوت دیتا ہے یہی اس کے الوہی ہونے کے لیے کافی ثبوت ہے کیونکہ تفکر اور سوچ کے سامنے کوئی جھوٹ نہیں ٹھیر سکتا۔ قرآن انسان کو مظاہرِ قدرت پر غور پر اکساتا ہے جس میں بے انتہا پیچیدہ معلومات پنہاں ہیں۔ ایک عام انسان ان پر غور کر کے خالق کو سمجھ سکتا ہے جبکہ ایک دانش وراس کی گہرائی میں جا کر قائل ہوتا ہے۔ قرآن انسان کو انفس و آفاق میں موجود نشانیوں کی طرف بار بار متوجہ کرتا اور کائنات کی تخلیق اور فطرت کے راز ڈھونڈنے کے لیے زور دیتا ہے تا کہ انسان ان پنہاں علوم تک رسائی کرے جو اس کو حقیقی معنوں میں ایک عظیم ترین خالق کا نائب بنا سکے۔ دن اور رات کے بدلنے میں اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی طرف بار بار توجہ مبذول کرائی جارہی ہے کیونکہ یہ اللہ کی قدرت اور اس کی خلاقی کی عظمت کو سمجھنے کے بنیادی اور ابتدائی ماحولیاتی عوامل ہیں۔ پھر انسان کی اپنی پیدائش اس کی خوراک اس کی زندگی کے مختلف مدراج کا ذکر کر کے انسان کو اسکی حیثیت اور حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح قرآن انسان کو وہ مقام حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے جو اس کا مقدر بنایا گیا ہے یعنی صحیح معنوں میں خالق کا نائب اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ طبعی ترقی کے ساتھ روحانی اور اخلاقی ترقی بھی رب کی منشاء کے مطابق ہو۔

پیغمبران

ہر انسان مختلف صلاحیتیں اور اوصاف کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جیسے بہت سے قائدانہ صلاحیت کے خوگر ہوتے ہیں۔ انسان جبلی طور پر سہل پسند واقع ہوا ہے اس لیئے مرعوب ہو کر نقل کرنے میں یا

پیروی کرنے میں چست ہے گویا انسان ہدایات کی پیروی کی فطرت رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان منفی خیالات کے ابھرنے کی سرشت لیکر بھی پیدا کیا گیا ہے اسی لیئے خالق نے انبیاء اور رسول مبعوث کیئے جن کے کردار اور معجزات سے مرعوب ہوکر ہی انسان نے اپنی عقل کے تیئں خدا اور اس کے رسولوں کو مانا۔ مذہب کے مطابق خالق کے پیامبر کوئی معمولی انسان نہیں ہوتے بلکہ اس لحاظ سے انتہائی غیر معمولی تھے کہ ان کو خالق کائنات نے وہ معلومات اور منازل دکھائیں جن کو ابھی عام انسان کے لیے ظاہر نہیں کیا گیا۔ پیغمبران کو اس کا تجربہ اور مشاہدہ عطا کیا گیا تا کہ وہ اس پوشیدہ نظام کے گواہ بنیں۔ ان کو انسانیت کی ہدایت کے لیے چنا گیا تا کہ انسان کو اچھا اور برا بتایا جائے گویا وہ خدا اور مخلوق کے درمیان خالق کی ہدایات کے پیامبر تھے۔ ایک پیغمبر خالق اور مخلوق کے درمیان نہ صرف ایک رابطہ کار بلکہ عملی نمونہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو زندگی کیسے بسر کرنی ہے۔

احادیث

ایک پیغمبر کی موجودگی اُس ماحول کے لیے بہت اثر انگیز ہوتی ہے۔ نبوت کا روحانی اثر بہت قوی ہوتا ہے اسی لیئے اللہ کے آخری نبی ﷺ کی رحلت کے بعد ایک طویل عرصہ تک تمام مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں میں اس کے اثرات ثبت رہے۔ پھر رفتہ رفتہ آپ ﷺ کی زندگی اور احکامات سے متعلق باتیں نہایت باریک بینی اور بہت سائنسی طریقے سے محفوظ کی گئیں جن کو احادیث کہا جاتا ہے۔ ان احادیث کو ان کی اہمیت اور روایت کی مضبوطی کے حوالے سے مختلف درجات دیئے گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کو قرآن کی تفسیر کہا جاتا ہے یعنی آپ نے اپنی ساری زندگی قرآن کے احکام کی پیروی میں گزاری اور اس کی تشریح بھی کر دی تا کہ لوگوں کو معلوم رہے کہ مختلف حالتوں میں قرآن کے احکامات کس طرح بجالائے جائیں۔

ایک مخالف احادیث پر یہی اعتراض اُٹھا سکتا ہے کہ احادیث مستند نہیں ہیں مگر یہ ایک لاعلمی والا اعتراض ہے کیونکہ تمام احادیث بہت عرق ریزی سے جمع کی گئیں جس کے لیئے روایت کرنے والوں کے اخلاق واطوار یہاں تک کہ راست گوئی کی دلیل کے لیئے نسب تک کی چھان بین کر کے ہی ان سے مروی واقعات وفرامین کو قلم بند کیا گیا۔ اس طرح احادیث رسول اللہ ﷺ کے فرمودات اور اُسوۂ حسنہ کا مستند تحریری ذخیرہ ہے۔

قوانین کی اساس

منطقی بات یہ ہے کہ خالق کائنات اگر انسان کو تخلیق کرتا ہے تو اطاعت بھی چاہے گا۔ اس صورتحال میں انسان کی زندگی میں نظم discipline لانے کے لیئے کسی مثال کی موجودگی انسانی فطرت کا منطقی تقاضہ بھی ہوئی اور ضرورت بھی کیونکہ خدا انسان کو اپنی اطاعت اور عبادت سے روگردانی کے لیئے جواز بھی نہیں دے گا۔ قوانین کی تدوین کے لیئے قرآن کے بعد آنحضرت ﷺ کی سنت ایسی بنیاد ہے جو اُلوہی تصدیق کی خوگر ہیں کیونکہ اللہ نے واضح طور پر اپنی اور اپنے رسول کی تقلید کا حکم دیا ہے (قرآن، النساء: ۵۹)۔ اسلامی نظریۂ حیات کی خاصیت یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیئے ایک زندہ جاوید عملی مثال اپنی جامعیت کے ساتھ احادیث کی شکل میں محفوظ رکھتا ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ قرآن اور ان احادیث سے ہی اسلامی فقہ تدوین ہوا جو مختلف فقہاء نے اپنے سامنے موجود احادیث اور قرآن کی روشنی میں تیار کیا۔ اُسوۂ رسول اللہ ﷺ کو بھی اسلامی قوانین کی اساس بننے کے لیئے قرآن کے یہ کے الفاظ غیر معمولی ہیں جس میں محمد ﷺ کے متعلق یہ اعلان کیا گیا کہ ان کا کام انسانوں کی زندگی کو سنوارنا اور ان کو حکمت کی تعلیم دینا ہے۔ یہ واضح تصدیق ہے کہ نبی ﷺ کے ارشادات اور اعمال رشد و ہدایت سے مزیّن ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو:

"وُہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسُول خود اُنہی میں سے اُٹھایا، جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اِس سے پہلے وہ کُھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (سورۃ جمعہ: ۲)۔ محمد ﷺ کی پوری زندگی اپنی جُزیات کے ساتھ محفوظ رکھنا انسانی تاریخ کی ایک نادر مثال ہے۔ مختلف مستند اور غیر مستند درجات catagories میں کسی انسان کے اعمال کو تحریراً محفوظ کرنے کی اس اچھوتی مثال کا مقصد انسانوں کو زندگی گزارنے کے بنیادی قواعد اور ضوابط سے آگاہی دلانا ہے۔ جس طرح قرآن کے الفاظ ابھی تک تبدیل نہیں ہو سکے اسی طرح تمام احادیث درجات کے اعتبار سے مکمل طور پر محفوظ ہیں اور ان پر تکیہ کرنا بالکل درست ہے۔ یہ فرامین بغیر کسی قطع و برید کے من و عن محفوظ کیئے گئے اور ان اعمال کی باکمال تدوین اور حفاظت کی تصدیق وہ پیش گوئیاں ہیں جو ابھی تک متواتر درست ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ یہاں ان پیش گوئیوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے تا کہ حدیث کے حوالے سے ذہن میں ابھرنے والے شکوک کا تدارک ہو جائے۔ احادیث کے مستند ہونے کے حوالے سے مستقبل کی پیش گوئیاں ہمارے استدلال

میں بہت اہم نکتہ ہے کیونکہ جدید علم اس بارے میں آج بھی تہی دست ہے۔

پیش گوئی کی علمی برتری

دیکھیں جناب اگر اللہ نہیں ہوتا اور دنیا سائنسدانوں کے تصور کے مطابق ہی بنی ہوتی تو ظاہر ہے کسی پیش گوئی کے سچ ہونے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا کیونکہ تاریخ کی کوئی مربوط سائنس نہیں ہوتی یعنی سائنسی طور پر ہم آنے والے وقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیونکہ حالات کی گردش نت نئے رنگوں میں جاری رہتی ہے۔ کیا جدید اسکالر ہزار سال آگے کی پیش گوئی کی مسٹری کا جواز دے سکتے ہیں؟ سائنسدانوں اور اسکالرز کے پاس اس کی کوئی وضاحت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ ان کی سمجھ سے باہر ہے جس کا تذکرہ ہم پیچھے کر چکے ہیں۔ کوئی جدید سے جدید علم بھی اگلے لمحے کی پیش گوئی سے قاصر ہے لیکن پیغمبرِ اسلام محمد ﷺ کی پیش گوئیوں کا درست ثابت ہونا یقیناً نہ صرف حیرتناک بلکہ اسلام کی حقانیت کی ایک اور سائنسی دلیل بھی ہے۔

معجزہ

معجزے درحقیقت غیر فطری نہیں جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اُن پوشیدہ قوانین کا اظہار Reflections ہیں جن کو انسان جان نہیں پایا۔ انسان کے علم میں بتدریج ہوتی ترقی آخر کار ان کی پُراسراریت کو عیاں کر دے گی۔ انسانی علوم میں ارتقاء انسان کو زیادہ باخبر کر رہا ہے اور علوم کا یہ پُرپیچ سفر پیرافزکس کے نہ جانے کتنے سربستہ راز فاش کرتا رہے گا۔ روشنی کی رفتار سے سفر ایک لاعلم کے لیئے معجزہ ہی ہے لیکن ایک عالم کے لیئے جو جدید ٹکنالوجی کی ترقی سے واقف ہے یہ محض ایک غیر معمولی بات ہوگی۔ تاریخ میں مندرج تمام معجزے پیرافزکس کے قوانین کے تحت ہوئے، بس سوال یہ ہے کہ کیا انسان اتنی علمی سکت حاصل کر سکتا ہے کہ ان کو دریافت کر سکے؟

ہم کون ہیں؟

ہم تحقیق سے اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ کائنات اور انسان محض اتفاق کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ کسی نظم کے تحت وجود میں آئے ہیں۔ جیسا کہ ایک باب میں ہم نے ایک عام شخص کی ذمہ داریوں کے حوالے سے مختلف صورتوں کا ذکر کیا تھا کہ وہ گھر پر ایک ذمہ دار باپ اور گھر سے باہر ذمہ دار شہری اور آفس وغیرہ میں ایک ذمہ دار کارکن یا افسر یا مالک ہوتا ہے کیونکہ ہر قسم کی صورتحال میں اس کے ذہنی رویئے متعین ہوتے ہیں لیکن وہاں پر ایک سوال یہ بھی اٹھا تھا کہ کیا ہم اس کائنات کے ذمہ

دار باشندے بھی ہیں؟ اسی سوال کے جواب میں ہم نے تمام ضروری معلومات کا مطالعہ کیا اور ایک خالق کی موجودگی کا عقلاً اعتراف کیا۔ اس صورتحال میں ہم کو اپنے خالق کی مرضی اور قوانین کا علم ہونا بھی ضروری ہوا کہ کن حالات میں ہمارے ذہنی رویئے کیا ہونے چاہئیں یعنی منفی یا بے ربط رویئے ترک کر کے اپنے ذہن میں مثبت گرہیں لگانی ہونگی تا کہ ہم خالق کے قوانین کی خلاف ورزی سے بھی بچیں اور اس کائنات کے ایک ذمہ دار باشندے بنیں۔

اہم نکات یہ ہیں۔

☆ کائنات عظیم تر سائنسی نظام ہے جس میں انسان بہ حیثیت نائبِ خالق مقیم ہے۔

☆ خالق کی موجودگی سے متعلق خیالات انسانی دماغ میں قدرتی طور پر پیوست ہیں۔

☆ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے صحیح کرے یا غلط۔

☆ ایک بہت قوت والا منفی کردار کا حامل انسان کے ساتھ دنیا میں آیا تا کہ انسان کو خالق کے راستے سے بھٹکائے، وہ انسانی خیالات میں سرائیت کر سکتا ہے۔

☆ مختلف ادوار میں خالق نے اپنے پیغمبر اور کتابیں بھیجی تا کہ انسانیت کی رہنمائی ہو۔

☆ پیغمبران نے انسان کو اس منفی کردار سے ہمیشہ ہوشیار کیا۔

☆ انسانوں کو اخلاق اور اقدار سمجھائی گئیں۔

☆ انسانی شعور میں ایک خودکار متنبہ کرنے والا نظام رکھا ہے جسے ضمیر کہتے ہیں۔ وہ انسان کو فوراً غلط کام سے رکنے کا مشورہ دیتا ہے۔

☆ گاہے بگاہے الہامی کتابیں انسانوں کی طرف بھیجی گئیں۔ ہر نئی کتاب پرانی کے بجائے مستعمل ہوئی اور پچھلی متروک ہوگئی۔

مستند مثبت ذہنی رویئے

☆ ہم سب کو اور کائنات کو اللہ نے تخلیق کیا ہے اور ہم اسی کے بندے ہیں۔

☆ فرشتوں، پچھلی کتابوں، تمام رسولوں اور آخرت پر ایمان لانا ہے۔

☆ میرا رب اللہ بہت رحم کرنے والا ہے۔

☆ محمد ﷺ اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔

☆ قرآن اللہ کی طرف سے نازل کتاب ہے۔

☆ اللہ کی ہدایات کی تشریح آخری نبی حضرت محمدؐ نے ہمیں بتائیں۔

☆ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی ہے۔

☆ ہر بُرا خیال شیطان کی طرف سے اور اچھا خیال خالق کی طرف سے ہے۔

☆ زندگی کا ہر لمحہ بندگی کا مرحلہ ہے۔

☆ خاندان اور اطراف کی تمام مخلوق کا ہم پر حق ہے جو مناسب طریقے سے ادا کرنا ہے۔

☆ ہمارے خیالات نہیں بلکہ اعمال کی گرفت ہوگی۔

☆ قیامت کا روزِ جزا برحق اور منطقی ہے۔ ہم کو اس کے لیے تیار ہونا ہے۔

یہ تو چند بہت ضروری باتیں ہیں جو ذہن میں اچھی طرح بٹھا لینی چاہئیں لیکن اس کے علاوہ نبی اکرم محمد ﷺ کو اللہ نے 23 سال اپنے بندوں کے درمیان قرآن اور احکامات کی تشریح کے لیے مقیم رکھا۔ انہوں نے زندگی کے مختلف معاملات اور ادوار سے متعلق احکامات کی وضاحت کی ہے۔ ہماری روزمرّہ کی زندگی اور معاملات یعنی خانگی سے لے کر ہر شعبے سے متعلق آنحضرتؐ کی تعلیمات موجود ہیں۔ انسانوں کی فلاح کے لیئے ضروری ہے کہ ان ہدایات کا مطالعہ کیا جائے اور ان کو ذہن نشین رکھا جائے۔

اختتامیہ

یہ کائناتی نظام ایک مرکز سے چلایا جا رہا ہے، عرش کے ہمہ گیر سنٹرل کنٹرول کے نظام کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ یہ عَرش انسان کے تصوّر کی گرفت سے باہر ہے جس میں بہت سی عیاں اور مخفی جہتیں ہیں، کائنات کے مخفی رخ کا کنٹرول وہیں سے ہے، انہی مخفی رخوں Hidden Dimensions کی تلاش، دریافت اور پہچان ہی علم کے وہ دروازے کھولتی ہے جو انسان کو خالق کے قریب تر کرتے ہیں یعنی یہ جدید علوم ہی ہونگے جو انسان کو مابعدالطبعیات کے اس ماحول کی کچھ خبر دیں گے کہ جہاں خالق کائنات کسی مظہر یا نظم کی تخلیق کا صرف ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ ظاہر ہوجاتا ہے۔ تصوّر اور خیال کی یہ قوت انسان کے اندر بھی ہے اور جدید سائنس میں ایک شعبہ ذہنی سائنس یا mind sciences کا موجود ہے جو انسان کے ذہن کی قوت پر تحقیق کر رہا ہے۔ یہاں پر ہمارے موضوع کے حوالے سے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ یہ مخفی قوّتیں مثلاً فوٹون، ثقل اور ہگز فیلڈ وغیرہ (Photon, Gravity & Higgs Field etc.) جو کائنات کے گوشے گوشے میں اور چپے

چپے پر نہ صرف سرائیت رکھتی ہیں بلکہ مادے کی ادنیٰ ترین معلوم اکائیوں یعنی پارٹکلز Particles پر بھرپور قوت سے حاوی ہیں، کیا اللہ کی گرفت اور صفات کا پرتو نہیں ہوسکتیں؟ ان مخفی قوتوں کا باہم تعلق اور ثقل کا اصل دائرۂ کار اب بھی فطرت کے وہ راز ہیں جنہوں نے سائنسدانوں کو فی الوقت چکرایا ہوا ہے۔ ان پہیلیوں کے جوابات طبعیات اور مابعد الطبعیات کا وہ نقطۂ اتصال ہو سکتے ہیں جسکا تذکرہ ہم نے شروع میں کیا تھا یعنی تمام میٹافزکس یا مابعد الطبعیات علمی ترقی کی بدولت فزکس یا طبعیات کے پیرائے میں قابلِ تشریح ہو جائیں۔ علوم کی اس پیہم پیشرفت سے، جسے عرف عام میں سائنس کہا جاتا ہے، دراصل آگہی کے بند دروازے کھلتے رہتے ہیں اور وہ وقت بھی آئیگا جب انسان اس عظیم الشان ہستی سے رابطے کے کچھ پیرائے دریافت کرے گا اور تصدیق کرے گا کہ کائنات کے باہر کوئی لامحدود ہستی ہے جو کائنات کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔ کیونکہ کائنات کے توازن کے حوالے سے قرآن کے مطابق اللہ نے کائنات تھامی ہوئی ہے تو یہ امکان موجود ہے کہ کششِ ثقل کے بیرونِ کائنات سے کوئی مضبوط تعلق کی سائنسی دریافت خدا کو سائنسی طور پر جاننے کی طرف مثبت پیش رفت ہوسکتی ہو۔ بظاہر وہ وقت بہت تیزی سے آتا دکھائی دے رہا ہے جب ماہرین جدید ترین دریافتوں کی روشنی میں چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے اپنے علوم کی بنیاد پہ اللہ کی ذات کی کوئی سائنسی توجیہہ لے کر آگے آئیں گے اور سائنسدان خود کائنات اور زندگی کی گتھی کو سلجھا کر اللہ تعالیٰ کے وجود کی توثیق اور تصدیق کریں گے۔

دیکھیں اس ضمن میں قرآن کیا کہتا ہے:

قرآن (سورۃ ۴۱، آیت ۵۳)

"اور ہم انہیں ان کے اندر اور آسمان میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے
یہاں تک کے ان کے سامنے عیاں ہو جائے گا کہ یہی حق ہے،
کیا یہ بات کافی نہیں کہ تمہارا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟"

وما توفیقی الا باللہ

پبلشرز:
حقّی برادرز
۴۳، اردو بازار
ایم اے جناح روڈ، کراچی ۷۴۲۰۰
پاکستان
Contacts:
9221-32632249 021-32212328
0321 8227300, (0300 2291531 Whatsapp)
https://www.facebook.com/Khudaee.sergoshian/
https://www.facebook.com/Haqqi-Brothers-1499354733663268/
haqqibrothers@hotmail.com
9789695310199

Rs: 600/=